علم حدیث
میں برِعظیم
پاک و ہند
کا حصہ
تصنیف: ڈاکٹر محمد اسحاق
ترجمہ: شاہد حسین رزّاقی
Institute of Islamic Culture
ادارہ ثقافتِ اسلامیّہ
Lahore - Pakistan

علمِ حدیث میں
برعظیم پاک و ہند
کا حصّہ

تصنیف

ڈاکٹر محمد اسحاق

ترجمہ

شاہد حسین رزّاقی

عنوان:	علمِ حدیث میں برِعظیم پاک و ہند کا حصہ
مصنف:	ڈاکٹر محمد اسحاق
مترجم:	شاہد حسین رزّاقی
طبع اوّل:	1977ء
طبع سوم:	2013ء
مطبع:	مکتبہ جدید پریس، لاہور
ناشر:	قاضی جاوید ناظم، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ
قیمت:	-/500 روپے

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان اور محکمہ اطلاعات و ثقافت، حکومتِ پنجاب کے تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

یہ کتاب ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش، کے
عربی و اسلامیات کے سابق پروفیسر ڈاکٹر
محمد اسحاق کی تصنیف ''انڈیاز کنٹری بیوشن ٹو
دی سٹڈی آف حدیث لٹریچر'' کا اُردو
ترجمہ ہے۔

فہرست

تعارف ۹

مقدمہ ۱۱

حصہ اوّل

(ہندی محدثین، اندرونِ ہند)

باب اوّل ہند میں صحابۂ کرامؓ کا ورود ۱۷

باب دوم: عربوں کے عہد میں سندھ میں علمِ حدیث ۴۱

باب سوم: شمالی ہند کے محدثین 998ء تا 1494ء ۶۵

باب چہارم: ہند میں علمِ حدیث کا احیا ۹۹

باب پنجم: ہندی محدثین ۱۳۵

حصہ دوم

(ہندی محدثین، بیرونِ ہند)

باب اوّل:	قدیم ہندی ادیانِ حدیث	۲۰۵
باب دوم:	حسن الصغانی اور اُن کی تصانیف	۲۳۱
باب سوم:	ہندی محدثین	۲۳۱
کتابیات		۲۵۶

تعارف

یہ کتاب ڈاکٹر محمد اسحاق، سابق پروفیسر عربی و اسلامیات، ڈھاکا یونیورسٹی کی گراں قدر تصنیف "کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو دی سٹڈی آف حدیث لٹریچر" کا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر اسحاق نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنے کے لیے برعظیم پاک و ہند میں علم حدیث کی ترقی و اشاعت اور علمائے ہند کی خدماتِ حدیث پر تحقیقات کی اور بڑی محنت و کاوش اور تحقیق سے اس موضوع پر ایک ایسی عمدہ کتاب قلم بند کرنے میں کامیاب ہوئے جسے علمِ حدیث سے متعلق کتب میں ایک قابلِ قدر اضافہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ یہ کتاب ۱۹۴۶ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی اور اب کم یاب ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر اسحاق نے اس کتاب میں بہت تفصیل سے یہ بیان کیا ہے کہ اسلامی ممالک سے ہند کے تعلقات کی ابتدا سے لے کر دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے قیام تک برعظیم کے مسلمانوں نے علمِ حدیث کو ترقی دینے کے لیے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اور یہاں کے نامور محدثین اور علمِ حدیث کے مراکز نے اس علم کے فروغ و اشاعت میں کس قدر اہم حصہ لیا ہے۔

برعظیم پاک و ہند کے مسلمان علمِ حدیث کو فروغ دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں، جب احادیث یکجا اور مرتب کی جا رہی تھیں اور اس علم کو بڑی اہمیت دی جا رہی تھی، عربوں کے ساتھ علمِ حدیث بھی سندھ میں آیا اور اس کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں ہی دیبل، منصورہ اور قصدار علمِ حدیث کے مرکز بن گئے تھے۔ عرب ممالک میں امام اوزاعی، ابومعشر نجیح سندھی اور رجاء سندھی جیسے نامور ہندی نژاد محدثین نے بھی اس علم کی ترقی میں حصہ لیا۔ غزنوی سلاطین کے عہد میں لاہور علمِ حدیث کا بہت اہم مرکز بنا۔ شیخ محمد اسماعیل لاہوری نے یہاں اس علم کی اشاعت کا آغاز کیا اور ان کے بعد حسن الصغانی جیسے بلند پایہ اور نامور محدث ہوئے۔ اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ دہلی بھی علمِ حدیث کا بڑا مرکز بنا۔ دکن اور گجرات کے سلاطین نے اس علم کو ترقی دینے میں اہم حصہ لیا۔ اور رفتہ رفتہ مالوہ، خاندیش، جھانسی،

کالپی، آگرہ، لکھنؤ، جونپور، بہار اور بنگال میں حدیث کی تعلیم واشاعت کے مراکز قائم ہو گئے۔

حجاز علمِ حدیث کا گہوارہ تھا اور مصر اس علم کی اشاعت کا بہت اہم مرکز بن گیا تھا۔ یہاں مختلف مکاتبِ حدیث قائم ہوئے، جن سے ہندی محدثین نے استفادہ کیا۔ سلاطینِ دہلی کے عہد میں نامور صوفیا نے علمِ حدیث کو فروغ دینے پر خاص توجہ کی اور شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، سیّد علی ہمدانی اور شیخ زکریا ملتانی، نیز شیخ علی متقی برہانپوری کے مکاتبِ حدیث نے اور عہدِ مغلیہ میں شیخ احمد سرہندی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے نامور محدثین اور ان کے تلامذہ نے برعظیم ہند میں اس علم کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ ان حضرات کے علاوہ دوسرے محدثین کی کثیر تعداد نے بھی علمِ حدیث کو فروغ دینے میں بہت اہم حصہ لیا اور سیاسی اقتدار سے محروم اور زوال پذیر ہو جانے کے بعد بھی مسلمان اس علم کی ترقی واشاعت کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔

ڈاکٹر محمد اسحاق نے برعظیم کے مسلمانوں کی ان عظیم خدمات کو بڑی تلاش وتحقیق اور محنت و جاں فشانی سے کام لے کر ایک کتاب کی شکل میں بہت خوش اسلوبی سے قلم بند کیا اور اس طرح اسلامی ہند کی دینی وعلمی خدمات کا ایک اہم گوشہ جو عام نظروں سے پوشیدہ تھا، سب پر روشن ہو گیا۔ یہ کتاب علمِ حدیث اور اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور علمی تحقیق کا ذوق رکھنے والوں کے لیے بہت مفید اور اہم ہے اور اسی اہمیت وافادیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُردو میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

ش۔ح۔ر

مقدمہ

علامہ رشید رضا مصری کی یہ رائے ہے کہ موجودہ زمانے میں علمِ حدیث کی تعلیم و اشاعت میں ہندی مسلمان سب سے آگے ہیں اور ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہندی مسلمان علمِ حدیث کی ترقی و اشاعت کے لیے اس قدر جانفشانی سے کام نہ لیتے تو یہ علم اب تک ختم ہو چکا ہوتا۔(۱) جب سیاسی اقتدار سے محروم ہو جانے کے بعد جاں بہ لب اسلامی ہند نے اپنے دورِ زوال میں بھی اس قدر اہم خدمات انجام دی ہیں تو ہمیں اس بات کا جائزہ ضرور لینا چاہیے کہ ہمارے قابلِ احترام آباء و اجداد نے اپنے دورِ کامرانی میں، جو تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا، مختلف علوم وفنون اور بالخصوص اسلامی علوم کی ترقی و اشاعت کے لیے کس قدر زیادہ کام کیا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ سیّد سلیمان ندوی (۲) اور حکیم عبدالحی ندوی (۳) نے علمِ حدیث کی ترقی میں اسلامی ہند کی خدمات سے روشناس کرانے کے لیے کچھ تحقیقی کام کیا ہے، مگر میری رائے میں وہ اس موضوع سے پوری طرح انصاف نہیں کر سکے۔ کچھ تو اس لیے کہ اس ضمن میں ضروری مواد انھیں دستیاب نہ ہو سکا اور دوسری اس وجہ سے کہ ان کی علمی تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع تھا اور وہ صرف اسی ایک موضوع پر اپنی تمام توجہ مرتکز نہ کر سکتے تھے۔ بہر حال ان کا کام اگرچہ تھوڑا ہے، مگر بہت اہم ہے۔ اور موجودہ زمانے کے نوجوانوں کو علمی تحقیقات کے نئے میدانوں میں گامزن ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

اس کتاب میں، جس کا موضوع علمِ حدیث کے مطالعے میں ہند کا حصہ ہے، یہ جائزہ لینے کی عاجزانہ کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی ممالک سے ہند کے تعلقات کی ابتدا سے لے کر دیوبند میں ایک اسلامی دارالعلوم کے قیام تک ہندیوں نے علمِ حدیث کو ترقی دینے کے لیے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے بعد سے اب تک اس سلسلہ میں کیا کیا کام ہوا ہے اور کیا ہو رہا ہے، اس کو میں نے قصداً چھوڑ دیا ہے، کیونکہ اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ سہولت کے پیشِ نظر یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ حصۂ اوّل ہند میں علمِ حدیث کی کیفیت اور یہاں کے محدثین سے متعلق ہے اور

حصہ دوم میں بیرونِ ہند کے ہندی محدثین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اگر چہ سندھ پر عربوں کا پہلا حملہ صحابہ کرام کے زمانے میں یعنی ۲۳ھ (۶۴۳ء) میں ہوا تھا لیکن اس پر مکمل فتح تابعین کے ابتدائی زمانے میں حاصل ہوئی، جب کہ علمِ حدیث ایک نئے ارتقائی دور میں داخل ہو چکا تھا۔ اس وقت تک اس بات کی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی تھی کہ دنیا کے مختلف حصوں میں علماء کے پاس احادیث کا جو وسیع ذخیرہ منتشر حالت میں ہے، اس کو یکجا کر دیا جائے، اور اس ضمن میں حکومت نے بھی کوئی اقدام نہیں کیا تھا۔ لیکن جب حضرت عمر بن عبدالعزیز (۹۹ تا ۱۰۱ھ) خلیفہ ہوئے تو حالات نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا۔ عمر بن عبدالعزیز خود ایک ممتاز محدث تھے اور انہوں نے والیوں کے نام ایک حکم جاری کیا تھا جس میں علماء کو احادیث جمع اور مرتب کرنے پر توجہ دلائی گئی تھی جو وقت کی ایک اہم ترین ضرورت تھی۔ خلیفہ کی تفویض کردہ اس ذمہ داری نے علمِ حدیث میں ایک نئی روح پھونک دی اور علمائے دین و اساتذہ احادیثِ نبوی کو جو منتشر حالت میں تھیں یکجا اور مرتب کرنے میں منہمک ہو گئے۔

علمِ حدیث اپنی ترقی کے اسی دور میں سندھ میں داخل ہوا تھا۔ لیکن تیسری صدی ہجری کے اواخر میں منصورہ اور ملتان کی آزاد عرب ریاستوں کے قیام سے پہلے سندھ میں اس علم کو کوئی نمایاں ترقی نہیں ہو سکی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری اور تیسری صدی میں جب کہ علمِ حدیث مدوّن کیا جا رہا تھا، سندھ دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ اس میدان میں گامزن نہ ہو سکا۔ تاہم علمِ حدیث کے اس ارتقائی دور میں سندھی قبائل سے تعلق رکھنے والے ذہین طالبانِ علم کی ایک جماعت نے جو عراق میں سکونت پذیر ہو گئی تھی اور ہندی اسیرانِ جنگ نے جو اسلام قبول کر کے مسلمان ملکوں میں آباد ہو گئے تھے، علمِ حدیث کی ترقی و اشاعت میں عملی حصہ لیا اور ان میں سے الاوزاعی (م ۱۵۷ھ) شام میں، نجیح السندی (م ۱۷۰ھ) مدینہ منورہ اور بغداد میں اور رجاء السندی (م ۲۲۳ھ) خراسان میں احادیث کے قدیم جامع اور مرتب کی حیثیت سے بہت ممتاز اور مشہور ہوئے۔ رجاء السندی کے ایک پوتے محمد السندی (م ۲۸۶ھ) نے امام مسلم (م ۲۶۱ھ) کی جامع الصحیح کی ایک مستخرج مرتب کی تھی اور خلف السندی (م ۲۳۱ھ) نے جو تیسری صدی ہجری کے اوائل میں حدیث کے ایک شوقین

طالب علم تھے، ایک مسند تیار کی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے نہ تو مستخرج دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہی اور نہ مسند۔ اگر یہ دونوں کتابیں محفوظ رہتیں تو علمِ حدیث کے تشکیلی دور میں اس علم کی ترقی کے لیے ہندی محدثین کی خدمات کا ایک قابلِ قدر ثبوت ہوتیں۔ تاہم ہندی راویوں کی سند سے روایت کردہ احادیث کافی تعداد میں صحاح ستہ اور احادیث کے دوسرے مجموعوں میں موجود ہیں۔

جب مذکورۂ بالا ہندی راویانِ حدیث بیرونِ ہند علمِ حدیث کی خدمت کر رہے تھے تو سندھ میں بھی منصورہ اور ملتان کے آزاد عرب حکمرانوں کی سرپرستی میں علمِ حدیث کے مراکز قائم ہو چکے تھے، جنھوں نے کئی اچھے محدث پیدا کیے اور علمِ حدیث میں مہارت و قابلیت حاصل کرنے کے لیے بہت سے طلباء کو بیرونی ممالک بھیجا۔ حقیقت یہ ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں سندھی محدثین نے علمِ حدیث کی ترقی و اشاعت میں بڑی محنت و قابلیت کا ثبوت دیا۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی علمی سرگرمیاں مستقل طور پر اور زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکیں کیوں کہ اس صدی کے آخر میں اسماعیلیوں نے ان ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ اس سیاسی انقلاب سے سندھ میں علمِ حدیث کو زبردست صدمہ پہنچا اور ہند میں حدیث کی تعلیم و اشاعت کا پہلا دور اچانک ختم ہو گیا۔

دوسرے دور کا آغاز سلطان محمود غزنوی (۳۸۸ تا ۴۲۱ھ) کی تخت نشینی سے ہوا جو شافعی تھے۔ سلطان محمود اور ان کے جانشینوں کے عہد میں لاہور علمِ حدیث کا ایک مرکز بن گیا۔ لاہور کے محدثین میں امام صغانی (م ۶۵۰ھ) بھی تھے جو اپنے زمانے کے ایک عظیم محدث اور ماہر لسانیات تھے۔ محدث کی حیثیت سے ان کی خدمات کا ذکر اسی کتاب میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ مشارق الانوار کے مصنف اور موجودہ شکل میں، جو ایشیا کے اسلامی ممالک میں مقبول و مروج ہے، صحیح بخاری کے مرتب کی حیثیت سے صغانی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں سلطنتِ دہلی کے قیام سے علمِ حدیث ہند میں اپنی ترقی کے تیسرے دور میں داخل ہوا۔ ہند میں ترکوں کی حکومت کی ابتدائی صدیاں، بالخصوص ساتویں اور آٹھویں صدی فقہا کے عروج کا زمانہ تھیں جو قاضیوں کے فرائضِ منصبی ادا کرنے میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ انھوں نے ہند میں قائم شدہ نئی مسلم سلطنت میں علمِ حدیث کی تعلیم و اشاعت پر کوئی توجہ نہ کی اور

حدیثِ نبوی سے اپنی محبت کا کوئی ثبوت نہیں دیا۔ لیکن ہند میں علمِ حدیث کے اس مایوس کن دور میں شیخ زکریا ملتانی (م ۶۶۶ ھ)، شیخ نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ ھ)، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور سیّد علی ہمدانی (م ۷۸۶ ھ) جیسے نامور صوفی علماء نے خود علمِ حدیث کا مطالعہ کیا اور خانقاہوں میں اپنے مریدوں کو بھی اس کی تعلیم دی۔ چنانچہ علمِ حدیث سے ان بزرگوں کی محبت و انہماک کی بدولت آٹھویں صدی ہجری میں شمالی ہند کی بعض خانقاہوں میں صحاح ستہ کی تعلیم مقبول و مروّج ہو گئی۔

یہ امر واقعہ ہے کہ ہند کے ثقافتی روابط جب تک وسطی ایشیا کے ممالک تک محدود رہے، علمِ حدیث کو ہند میں کوئی نمایاں ترقی حاصل نہیں ہو سکی کیوں کہ وسطی ایشیا کے ممالک بالخصوص ماوراء النہر، خراسان اور عراق فقہ اور معقولات کے مرکز تھے۔ اور چونکہ ہند کو وسطی ایشیا کی فوجوں نے فتح کیا تھا، اس لیے ہند پر ان ملکوں کے علماء و مفکرین کا گہرا اثر پڑا۔ مزید برآں شریعتِ اسلامی کے مطابق فیصلے کرنے کے لیے ہند میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی سلطنت میں فقہا کی تو بہت مانگ تھی، مگر محدثین کے لیے ایسے مواقع نہ تھے، چنانچہ فقہا کے لیے تو ہند بڑی ترغیب و کشش رکھتا تھا لیکن محدثین کے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ شروع ہی میں دہلی میں وسطی ایشیا کے فقہا کا ہجوم ہو گیا۔ لیکن عبدالعزیز اردبیلی کے سوا کوئی قابلِ ذکر محدث ہند میں علمِ حدیث کی نشاۃِ ثانیہ سے قبل کے دور میں نقلِ وطن کر کے نہیں آیا۔

ہند میں علمِ حدیث کا چوتھا دور جسے ہم نے اس علم کے احیاء کا دور قرار دیا ہے، نویں صدی ہجری کی ابتداء میں شروع ہوا، جب دکن میں بہمنی اور گجرات میں مظفر شاہی دو آزاد مسلم سلطنتیں قائم ہو گئیں اور بحری راستے کھل جانے کی وجہ سے ہند اور عرب کے درمیان ثقافتی تعلقات کا آغاز ہو گیا۔ اس طرح چار صدیوں کے طویل وقفہ کے بعد عرب سے ہند کے علمی روابط کی تجدید ہو گئی جو سندھ پر اسماعیلیوں کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے معطل ہو گئے تھے۔ چنانچہ حجاز اور مصر سے محدثین کی آمد کے باعث دسویں صدی کے وسط تک ہند میں علمِ حدیث کی بہت وسیع اشاعت ہوئی اور اس سے غیر معمولی اور حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے۔ اب ہندی محدثین معلم، مترجم اور مرتب کی حیثیت سے ہند اور حجاز میں بیک وقت علمِ حدیث کی خدمت کرنے لگے اور یہ صورتِ حال تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں

دیوبند میں دارالعلوم اور سہارن پور میں مظاہر العلوم کے قیام تک برقرار رہی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دارالعلوم اور مظاہر العلوم کے مدرسوں کے قیام سے ہند میں حدیث کی تعلیم و اشاعت کے ترقی پذیر دورِ جدید کا آغاز ہوگیا۔ اب تک اسلامی ہند میں کوئی ایسا مرکزی ادارہ نہ تھا، جہاں علمِ حدیث کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی اس لیے ہندی طلباء اس علم میں خصوصی مہارت حاصل کرنے کے لیے حجاز جایا کرتے تھے۔ لیکن ان دو بڑے اداروں نے ہندی مسلمانوں کی ایک ایسی ضرورت پوری کر دی جو بہت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی اور تحصیلِ علمِ حدیث کے معاملے میں وہ خود مکتفی ہو گئے ہیں۔

حواشی:

(۱) محمد فؤاد عبدالباقی: مفتاح کنوز السنّة، قاہرہ، ۱۹۳۴ء، مقدمہ، ص، ق۔ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، (بریلی) ۱۹۴۰ء، ص ۱۶۴، ۲۲۲۔ مناظر احسن گیلانی، نظامِ تعلیم و تربیت، (دہلی ۱۹۴۴ء)، ج ۱، ص ۱۰۶۔

(۲) مجلہ معارف، اعظم گڑھ، ج ۱۲، ش ۴، ۶۔ ج ۱۳، ش ۲، مضمون: ہندوستان میں علمِ حدیث۔

(۳) عبدالحی، معارف العوارف (مخطوطہ)، عنوان: الحدیث فی بلاد الهند۔

حصّہ اوّل

ہندی محدثین — اندرونِ ہند

باب اوّل

ہند میں صحابۂ کرامؓ کا ورود

اگر خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے ان مہم جو عربوں کو جنہوں نے ان کے عہدِ خلافت میں ہند فتح کرنے کے ارادے سے ۲۳ھ/ ۶۴۳ء میں بری اور بحری حملے کیے تھے، اس ملک کو فتح کرنے سے منع نہ کر دیا ہوتا تو شاید ہند میں علمِ حدیث کا آغاز خود صحابۂ رسولؐ کے ہاتھوں ہو گیا ہوتا۔ ہند کو اس وقت فتح نہ کرنے کا فیصلہ حضرت عمرؓ نے بہت اہم اسباب کو ملحوظ رکھ کر کیا تھا جو آگے بیان کیے جائیں گے۔ اس اہم واقعہ کے بعد اگرچہ ہندوستان کی سرحدوں پر عربوں کے اِکا دُکا حملے ہوتے رہے، تاہم یہ علاقہ فتح کرنے کی کوئی منظم کوشش اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان (۸۶ تا ۹۶ھ/ ۷۰۵ تا ۷۱۵ء) کے عہد سے پہلے نہیں کی گئی اور پھر اسی خلیفہ کے عہد میں سندھ فتح ہو گیا۔

یہی سبب ہے کہ ہند کا شمار ان مسلم ممالک میں نہیں کیا جا سکتا جہاں صحابۂ کرام نے اپنی زبان سے احادیث بیان کیں۔ تاہم یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ علمِ حدیث کے کچھ علم بردار یہاں آئے تھے اور اس سرزمین سے ان کو جو تعلق رہا، اسے آئندہ صفحات میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس مقصد کے پیشِ نظر ہند پر عربوں کے ابتدائی حملوں کا مختصر حال قلم بند کیا جا رہا ہے۔

حضرت عمرؓ کا عہدِ خلافت (۱۳ تا ۲۳ھ/ ۶۳۴ تا ۶۴۳ء)

ہند پر عربوں کا پہلا حملہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ہوا تھا۔ ۲۳ھ/ ۶۴۳ء میں حکم بن عمر تغلبی کی قیادت میں ایک فوج دریائے سندھ تک پہنچ گئی تھی اور اسی سال ہند کے مغربی ساحل پر بحری حملے بھی کیے گئے تھے۔ لیکن عربوں کے ان حملوں کے نتیجے میں کوئی علاقہ مستقل طور پر فتح نہیں ہوا کیونکہ حضرت عمرؓ کے حکم سے یہ حملے فوری طور پر بند کر دیے گئے۔

برّی حملہ

حضرت عمرؓ نے عتبہ بن غزوان کو جو صحابیٔ رسولؐ تھے(۱) ۱۴ھ/ ۶۳۴ء میں ابلّہ (موجودہ بصرہ) پر پیش قدمی کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اسلام کے قدم ارض الہند پر جما دیے جائیں۔(۲) ارض الہند سے حضرت عمرؓ کی مراد غالباً ابلّہ تھا کیونکہ اس زمانے میں اسے الہند کہا جاتا تھا۔(۳) اس فتح کے بعد عرب برابر پیش قدمی کرتے رہے اور ۲۳ھ/ ۶۴۳ء میں وادیٔ سندھ میں پہنچ گئے۔

عربوں کو جنگِ نہاوند (۲۱ھ/۶۴۱ء) میں فتح حاصل ہوئی مگر اس سے وہ نہ تو ساسانی شہنشاہیت کے مالک بن گئے اور نہ ایرانی حکومت کا پوری طرح خاتمہ ہوا تاہم اس سے یزدجرد ثالث(۴) کے اقتدار پر کاری ضرب لگی جس سے مرکزی حکومت کمزور ہوگئی اور صوبوں کے حاکم جو مرزبان کہلاتے تھے، خود مختار ہو گئے۔ اس امکان کے پیشِ نظر کہ شاید مفرور شہنشاہ اپنی منتشر قوت پھر جمع کرلے اور جم کر عربوں کا مقابلہ کرے، حضرت عمرؓ نے احنف بن قیس کے مشورہ کے مطابق یہ طے کیا کہ خود مختار صوبوں کو فتح کر کے ساسانی شہنشائیت کے باقی ماندہ آثار مٹا دیئے جائیں۔(۵) چنانچہ انہوں نے ۲۱ھ/۶۴۱ء میں(۶) ایران میں عرب فوج جمع کرنے کا حکم دیا، اور ان حملوں کی قیادت صحابۂ رسولؐ کے تفویض کی۔ اس منصوبے کے تحت خراسان کے خلاف، احنف بن قیس۔(۷) اردشیر خرا اور شاہ پور کے خلاف، مجاشی بن مسعود السلمی،(۸) اصطخر کے خلاف، عثمان بن ابی العاص ثقفی کرمان کے خلاف ساریہ بن جنیم کنانی(۱۰) سجستان کے خلاف، عاصم بن عمرو التیمی(۱۱) اور مکران کے خلاف، حکم بن عمرو التغلبی(۱۲) کی قیادت میں فوجیں روانہ کر دی گئیں۔

ہند کے خلاف براہِ راست پہلا حملہ ۲۱ھ/۶۴۱ء میں کیا گیا۔ عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان(۱۳) جو ایک صحابی تھے، جنگِ نہاوند میں نام پیدا کرنے والی فوج کا ایک دستہ لے کر صوبۂ جبال کے جنوب مشرق میں واقع ایک شہر اصفہان پر حملہ آور ہوئے۔ شہر کے قریب زبردست لڑائی ہوئی جس میں تجربہ کار ایرانی سپہ سالار شہریار مارا گیا۔ اسی دوران میں ابوموسیٰ اشعری(۱۵) اهواز سے تازہ دم فوج لے کر اصفہان پہنچ گئے۔ ایرانیوں کو مکمل شکست ہوئی۔ پورے صوبے کو عربوں کا زیر

حفاظت علاقہ قرار دے کر اصفہان کے مرزبان فاجسفان سے ایک معاہدہ کیا گیا اور مفتوحہ علاقے اسے واپس دے دیئے گئے۔(۱۶)

اس کے بعد عبداللہ نے صوبۂ کرمان کا رُخ کیا اور بڑے ریگستان کی بیرونی حدود(۱۷) تک پیش قدمی کر کے سہیل بن عدی کی فوج سے جا ملے جو کرمان فتح کرنے جا رہی تھی۔(۱۸) اس سے عربوں کی طاقت بہت بڑھ گئی اور سنہ ۲۳ھ/۶۴۳ء میں انہوں نے کرمان پر حملہ کر دیا۔ یہاں کے باشندوں نے اپنی روایتی بہادری کا ثبوت دیا اور کوہستان قفص (۱۹) کے جفاکش بلوص کی مدد حاصل کر کے حملہ آوروں کا زبردست مقابلہ کیا لیکن ان کو روک نہ سکے اور آخرکار پسپا ہو گئے۔ عربوں نے اپنی فوج دو حصوں میں تقسیم کر دی۔ ایک کا سپہ سالار ناصر بن عمرو العجلی کو اور دوسرے کا عبداللہ کو بنایا گیا اور پسپا ہونے والی فوجوں کا تعاقب کرتے ہوئے عربوں نے سارا علاقہ پامال کر ڈالا۔(۲۰)

عاصم بن عمرو مشرقی سمت میں پورا ریگستان عبور کر کے بجستان کی طرف بڑھے اور بعد میں عبداللہ بن عمیر بھی اپنی فوج لے کر ان سے آ ملے۔ عرب بجستان کے حدود میں داخل ہوئے ہی تھے کہ وہاں کے باشندوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ عربوں کا مقابلہ کرنا بے فائدہ ہوگا، دریائے ہلمند کے بند توڑ دیئے اور سارا علاقہ زیرِ آب آ گیا۔(۲۱) لیکن یہ تدبیر بھی بیکار گئی۔ عربوں نے زبردست حملہ کر کے دارالحکومت زرنج پر قبضہ کر لیا جس سے باشندوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور وہ صلح کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ایک معاہدہ کیا گیا جس میں باقاعدہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا گیا اس شرط پر کہ عرب اس علاقے کی پیداوار پر کوئی دعویٰ نہیں کریں گے۔ عربوں نے اس معاہدہ کی شرطوں پر دیانت داری سے عمل کیا۔(۲۲)

یہ دشوار گزار پہاڑی علاقہ تھا اور عربوں کو فوجی نقل و حمل میں بڑی دشواری ہو رہی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے انہوں نے ملک کے اس حصہ میں مزید پیش قدمی نہیں کی اور یہاں سے واپس ہو کر اس فوج سے جا ملے جو مکران کی سرحد پر جمع تھی۔

عرب دریائے سندھ کے کنارے پر

مکران پر حملے کے لیے عربوں نے ایک طاقتور فوج تیار کی جس کی قیادت کئی صحابہ کر رہے

تھے، مثلاً عاصم بن عمر، الحکم بن عمرو التغلبی، عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان اور سہیل بن عدی رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اس وقت مکران پر سندھ کا راجہ راسل حکومت کر رہا تھا۔(۲۳) راجہ کی فوج میں ہندو جنگجو اور بہت سے ہاتھی شامل تھے۔ راجہ خود اس کی کمان کر رہا تھا، اور اس کے ملک (سندھ) سے روانہ تازہ دم سپاہی آ کر فوج میں شامل ہو رہے تھے۔ مکرانیوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور ان کی مدافعت بظاہر نا قابلِ شکست معلوم ہوتی تھی، لیکن عربوں کے زبردست ریلے کو روکنا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے اتنی تیزی اور شدت سے حملہ کیا کہ ہندیوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ افراتفری کی حالت میں بھاگنے لگے۔ عربوں نے کئی روز تک ان کا زبردست تعاقب کیا اور ہندی دریا کی طرف بھاگنے لگے۔ عربوں نے کئی روز تک ان کا زبردست تعاقب کیا اور آخرکار ہندی دریا کی دوسری طرف پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح زیریں سندھ کی پوری وادی پر عرب قابض ہو گئے۔(۲۴)

عرب سپہ سالار الحکم نے ایک صحابی صحار بن العبدیؓ(۲۵) کو اس فتح کی اطلاع دینے کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا اور دریائے سندھ کو پار کر کے ہند میں مزید پیش قدمی کرنے کی اجازت چاہی۔ حضرت عمرؓ نے صحار سے اس ملک کی کیفیت دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ اس کے میدان پہاڑی ہیں۔ پانی کی بڑی قلت ہے۔ کھجور ادنیٰ قسم کی ہوتی ہے۔ دشمن بہادر ہیں۔ اس میں خیر بہت ہی کم ہے مگر شر بے انتہا ہے۔ ایک بڑی فوج چھوٹی معلوم ہوتی ہے اور چھوٹی فوج کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس علاقے کے آگے بدتر حالات کا سامنا ہو گا۔ اس بیان کو سن کر حضرت عمرؓ نے سپہ سالار کو یہ حکم دیا کہ وہ مزید پیش قدمی نہ کریں۔ چنانچہ فاتح عربوں نے دریائے سندھ پار نہیں کیا۔(۲۶)

سپہ سالار الحکم سے موسوم مندرجہ ذیل اشعار سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عربوں نے دریائے سندھ تک کا تمام علاقہ جسے انہوں نے مہران کے نام سے موسوم(۲۷) کیا، فتح کر لیا تھا۔ اور اگر خلیفہ نے ممانعت نہ کر دی ہوتی تو وہ دریا کو پار کر کے ہند میں مزید پیش قدمی کرتے۔ الحکم کے اشعار یہ ہیں:

لقد شبع الارامل غیر فخر　　بفئی جاءھم من مکران

اتاھم بعد مشقۃ و جھد　　وقد صفر الشتاءِ من الدخان

فاني لايذم الجيش فعلي ولاسيفي يذم ولا سناني
غداة ارفع الاوباش رفعاً الى السند العريضة والمداني
ومهران لنا فيما اردنا مطيع غير مسترخي العناني
فلو لا ما نهى عنه اميري قطعناه الى البدد الزداني(۲۸)

۱۔ مکران سے جو مالِ غنیمت ملا، اس نے مساکین کو سیر کر دیا اور اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔
۲۔ یہ مال لڑائی اور جدوجہد سے حاصل ہوا، اور اس وقت حاصل ہوا جب صاف جاڑے کا موسم آ چکا تھا۔
۳۔ جہاں تک میرا، میرے اقدامات اور سیف و سنان کا تعلق ہے، کوئی بھی اس لشکر کی مذمت نہیں کرتا۔
۴۔ بالخصوص معرکہ آرائی کی وہ صبح تو قابلِ تعریف تھی جس نے ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو بھی اعلیٰ مدارج تک اچھال دیا۔
۵۔ مہران کا علاقہ اس طرح فتح ہوا کہ اب وہ بالکل مطیع وفرماں بردار ہے۔
۶۔ اور اگر ہمارے امیر نے ہمیں روک نہ دیا ہوتا تو ہم بت پرستوں کے شہر فتح کرتے چلے جاتے۔

فتوحات کا یہ سلسلہ اگرچہ روک دیا گیا لیکن اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ساحلِ مکران کے ساتھ ہندوستان تک ایک بَرّی راستہ دریافت ہو گیا۔

بحری حملہ

عربوں نے ہند کے خلاف سب سے پہلا جو بحری حملہ کیا وہ تھانہ پر ان کا حملہ تھا۔ تھانہ بمبئی کے قریب ایک بندرگاہ تھا۔ عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ ایک ممتاز صحابی تھے۔ ماہِ رمضان ۹ھ (دسمبر ۶۳۰ء) میں طائف کا جو وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا تھا اس میں عثمان بھی شامل تھے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اگرچہ عثمان کمسن تھے مگر اسلام سے انہیں بڑی محبت تھی اور حضرت ابوبکرؓ نے بھی ان کے جوشِ ایمانی کی تعریف کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طائف کا عامل مقرر کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں جب فتنۂ ارتداد برپا ہوا تو عثمان ثقفی نے اہم خدمات

انجام دیں، اور اپنے قبیلے کو مرتد ہونے سے باز رکھا۔ عثمان ثقفیؓ مختلف صوبوں کے عامل رہے اور کامیابی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ اُنھوں نے ۵۱ھ/۶۷۱ء میں بصرہ میں وفات پائی جہاں اُنہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ بصرہ میں نامور بزرگ حسن بصری نے ان سے حدیث کا درس لیا تھا۔(۲۹) عثمان ثقفیؓ نے انتیس احادیث روایت کی ہیں جن میں سے تین صحیح مسلم (۳۰) اور باقی ماندہ کتبِ سنن میں شامل ہیں۔(۳۱)

حضرت عمرؓ کے زمانے میں عثمان ثقفیؓ بحرین اور عُمان کے والی بنائے گئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے بھائی الحکمؓ بن ابی العاص ثقفی کی سرکردگی میں جو خود بھی صحابیٔ رسولؐ تھے،(۳۲) ہند کے خلاف یہ بحری مہم روانہ کی تھی۔ گجرات کے ساحل پر عربوں کی فوجوں کے اترنے سے جنوبی ہند میں صحابہؓ کے ورود کا آغاز ہو گیا تھا(۳۳) اور اسی نوعیت کی بحری مہمیں بروچ کے خلاف اور خلیج دیبل میں بھی روانہ کی گئی تھیں۔ موخر الذکر مہم کے قائد عثمان ثقفی کے ایک اور بھائی مغیرہ بن ابی العاص ثقفی تھے۔

حملہ کی تاریخ

بلاذری نے، جس نے کہ ہند پر عربوں کے قدیم حملوں کا حال قلمبند کیا ہے، ان حملوں کی تاریخیں تفصیل سے نہیں لکھیں ہیں۔(۳۶) لیکن فتوح البلدان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہند پر یہ حملے سنہ ۱۴ھ/۶۳۶ء میں بحرین اور عُمان کی گورنری پر عثمان ثقفی کا تقرر ہونے کے فوراً بعد ہی اس کے ایما پر کیے گئے تھے۔(۳۷) ابومخنف (۳۸) اور ان کے شاگرد المدائنی (۳۹) نے یہ تاریخ ۱۵ھ/۶۳۷ء لکھی ہے۔ چونکہ (۴۰) ان حملوں کی تاریخ بحرین اور عمان کی گورنری پر عثمان ثقفی کے تقرر کی تاریخ سے مشروط کر دی گئی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے تقرر کی صحیح تاریخ معلوم کی جائے۔(۴۱) بلاذری کے مذکورہ بالا بیانات درست نہ ہونے کا اندازہ ابنِ سعد کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۶ یا ۱۷ھ میں بصرہ کی بنیاد رکھی جانے سے قبل عثمان ثقفی کا تبادلہ طائف سے نہیں کیا گیا (۴۲) جہاں ان کو ۹ھ/۶۳۰ء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عامل مقرر کیا تھا۔ جب نئے شہر بصرہ کے لیے ایک قابل والی کی ضرورت ہوئی تو اس کے لیے عثمان ثقفی کا نام حضرت عمرؓ کے

سامنے تجویز کیا گیا، مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جس عامل کا تقرر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس کا تبادلہ وہ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ تجویز قبول کرنے کا مطالبہ جاری رہا اور آخر کار حضرت عمرؓ نے اسے منظور کر لیا۔ چنانچہ عثمان ثقفیؓ کو بصرہ بھیج دیا گیا اور ان کی جگہ طائف کا عامل ان کے بھائی الحکم بن ابی العاص ثقفیؓ کو بنا دیا گیا۔ عثمان ثقفیؓ کے تقرر سے متعلق ابو مخنف کا بیان بھی غلط ہے جس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ علاء بن حضرمی نے جن کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ عثمان ثقفی کے بعد بحرین اور عمان کے عامل ہوئے تھے، ابو مخنف کے قول کے مطابق ۱۴ھ یا ۱۵ھ کے اوائل میں وفات نہیں پائی۔ کیوں کہ طبری کے بیان کے مطابق حضرمی ۱۶ھ (۴۵) میں بحرین اور یمامہ کے عامل تھے اور ۱۷ھ (۴۶) میں اُنہوں نے فارس کے خلاف ایک بحری مہم کی قیادت کی، اور ۲۱ھ/۶۴۱ء میں وفات پائی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ ۱۴ھ یا ۱۵ھ میں عتبہ بن غزوان کی جگہ علاء کو بصرہ کا عامل بنایا گیا جب کہ غزوان وہاں فوجی عمارتیں تعمیر کرنے کا اہم کام انجام دے رہا تھا۔ (۴۸) غالباً بلاذری کے بیان کو سند مان کر ہی طبری نے یہ لکھا ہے کہ سنہ ۱۴ھ یا ۱۵ھ میں عثمان بحرین کا عامل تھا۔ (۴۹) اور عجیب بات یہ ہے کہ اس زمانے میں عُمان جو ہند کے خلاف مہموں کا مرکز تھا، ایک اور عامل حذیفہ بن محصن کے تحت تھا۔ (۵۰) طبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ عثمان ثقفی ۱۶ھ میں طائف کا عامل تھا۔ (۵۱) اس بیان سے ابن سعد کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ (۵۲) مزید برآں بلاذری کے سوا کسی اور مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ ۲۳ھ/۶۴۳ء سے قبل بحرین اور عُمان کے صوبے ایک ہی عامل کے تحت تھے۔ ۱۷ھ میں عثمان کو بصرہ کا عامل مقرر کرنے کے بعد بحرین اور یمامہ بھی اس کے ماتحت کر دیے گئے۔ (۵۳) لیکن عمان کا عامل بدستور حذیفہ بن محصن ہی رہا۔ چنانچہ سنہ ۱۷ھ سے قبل عثمان کی کارکردگی میں ہند کے خلاف بحری فوج روانہ کرنے کا سوال خارج از بحث ہے۔ (۵۵)

طبری کے بیان کے مطابق عثمان ثقفی بحرین اور دُور افتادہ صوبوں یعنی عمان اور یمامہ کا عامل سنہ ۲۳ھ/۶۴۳ء میں ہوا۔ (۵۶) یہ ایسی تاریخ ہے جو سنہ ۲۳ھ تک بحرین کے عاملوں کی مدتِ عہدہ تاریخ وار ترتیب دے کر بلاذری کی تاریخ سے بھی معلوم کی جا سکتی ہے۔

سنہ ۲۰ھ میں بحرین کے عامل قدامہ بن ماذون الجحی کو شراب نوشی کے الزام میں برطرف کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ابو حریرہ الدوسی کو عامل مقرر کیا گیا۔ ابو حریرہ اس عہدے پر کافی عرصہ تک رہا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس نے گھوڑوں کی نسل کشی کے لیے ایک اصطبل قائم کیا تھا جس کو بارہ ہزار درہم آمدنی ہوئی تھی۔ اس طرح سے دولت جمع کرنا حضرت عمرؓ کے نزدیک بیت المال میں خرد برد کرنا تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر ابو حریرہ کو برطرف کر دیا گیا۔(۵۸) بلاذری نے لکھا ہے کہ اس کے بعد خلیفہ عمرؓ نے عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ کو بحرین اور عُمان کا عامل مقرر کیا جو حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت اس عہدے پر مامور تھا۔(۵۹) طبری اور بلاذری کے بیانات میں اس بارے میں کوئی اختلاف یا تضاد نہیں ہے کہ عثمان ثقفی کا تقرر سنہ ۲۳ھ میں کیا گیا تھا۔ اور یہ بات تسلیم کر لینا چاہیے کہ عثمان کو بحرین اور عُمان کا عامل مقرر کیے جانے کے فوراً بعد ہی سنہ ۲۳ھ / ۶۴۳ء میں ہند کے خلاف مہمیں روانہ کر دی گئیں۔ اس تاریخ کی توثیق چچ نامہ سے بھی ہوئی ہے جو اس بارے میں بلاذری کے بعد اہم ترین ماخذ ہے، اور اس میں دیبل پر عربوں کے بحری حملے کی تاریخ حضرت عمرؓ کی شہادت کے فوراً بعد یعنی ۲۳ھ بیان کی گئی ہے۔(۶۰)

بحری حملوں کے نتائج

تھانہ پر عربوں کا بحری حملہ ناکام نہیں رہا تھا بلکہ کامیاب ہوا، کیوں کہ اگر اس میں ناکامی ہوئی ہوتی تو اس کا نتیجہ عرب حملہ آوروں کی تباہی کی شکل میں نکلتا اور ان میں سے شاید ہی کوئی زندہ بچتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ کامیاب ہو کر وطن واپس گئے اور ان کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس کا ثبوت اس حملہ کے ذمہ دار عثمان ثقفی سے خلیفہ کے خطاب سے ملتا ہے۔ عرب اور آگے نہیں بڑھے، اس لیے نہیں کہ وہ کامیاب نہیں ہوئے بلکہ اس لیے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کا سبب معلوم کرنا دشوار نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ ایک عظیم سلطنت کے معمار اور عظیم مدبر کی حیثیت سے تاریخِ عالم میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور وہ انسانی جانوں سے کھیلنا پسند نہیں کرتے تھے۔(۶۱) جب وہ کوئی فوج روانہ کرتے تھے تو ان کی سب سے بڑی فکر یہ ہوتی تھی کہ عساکر اسلام کو ہر طرح سے برابر کمک پہنچائی جاتی رہے۔ وہ اپنے سپہ سالاروں کو یہ ہدایت دیتے

تھے کہ تمام حالات سے ان کو برابر مطلع کرتے رہیں تاکہ وہ ضروری احکام جاری کر سکیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے جو فتوحات حاصل کیں وہ خود سپہ سالاروں کی قابلیت اور جنگی مہارت سے زیادہ اس امر کا نتیجہ تھیں کہ حضرت عمرؓ کے عظیم منصوبوں اور ہدایات پر ان کے سپہ سالار سختی سے عمل کرتے رہے۔(٦٢) حضرت عمرؓ کسی ایسی مہم کا خطرہ مول نہ لیتے تھے جس کی کمک کے لیے وہ سپاہی اور اسلحہ برابر نہ بھیج سکتے ہوں اور غالباً یہی سبب تھا کہ اپنی زبردست حربی قابلیت کے باوجود وہ بحری حملے کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ ذیل کے تاریخی واقعات سے اس امر کی وضاحت ہو جائے گی۔

عربی بحری جنگوں میں اپنے ہمسر رومیوں اور ایرانیوں کی طرح تجربہ کار نہ تھے (٦٣) اور یہی سبب ہے کہ ایرانیوں کے خلاف ان کی بحری مہم ناکام ہو گئی تھی۔ بحرین کے مہم جو عامل علاء بن حضرمی نے حضرت عمرؓ کی اجازت حاصل کیے بغیر سنہ ١٧ھ/٦٣٧ء میں یہ بحری حملہ کیا تھا۔ اس میں مسلمان فوج کو بہت نقصان اُٹھانا پڑا۔(٦٤) اور اگر بصرہ سے بروقت کمک نہ پہنچائی گئی ہوتی تو اس سے بھی زیادہ نقصان ہوتا۔(٦٥) اس المناک واقعہ کی وجہ سے عربوں کی بحری لڑائیوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کی رائے اچھی نہ تھی۔ چنانچہ شام اور مصر کے عامل معاویہ نے جب رومیوں سے بحری جنگ کرنے کے لیے حضرت عمرؓ سے اجازت مانگی تو اُنہوں نے لکھا کہ ''بحری حملے میں علاء بن حضرمی کو جو سزا ملی، اِس سے تم بخوبی واقف ہو۔'' عرب (٦٦) دوسرے میدانوں میں اس قدر مصروف تھے کہ بحری لڑائی میں مہارت حاصل کرنے کا انہیں اب تک موقع ہی نہیں ملا تھا۔

یہ معلوم تھا کہ خلیفہ بحری مہم کی اجازت نہیں دیں گے، اور عثمان ثقفی نے خود تمام خطرات مول لے کر ہند پر بحری حملہ کر دیا تھا۔ لیکن تھانہ پر اس حملے کی کامیابی سے بھی حضرت عمرؓ مطمئن نہیں ہوئے اور انہوں نے عثمان ثقفی کو سخت فہمائش کرتے ہوئے لکھا: اے ثقفی بھائی! تو نے کیڑے کو لکڑی پر چڑھا دیا۔ بخدا! اگر یہ لوگ مارے جاتے تو میں تیرے قبیلے کے اتنے ہی آدمی وصول کر لیتا۔(٦٧)

جہاں تک کہ دوسری بحری مہموں کا تعلق ہے، دیبل پر حملے کے بارے میں چچ نامہ میں لکھا ہے کہ اس میں عربوں کو ناکامی ہوئی اور ان کا سپہ سالار مغیرہ لڑائی میں مارا گیا۔ لیکن یہ بیان غلط ہے۔

یاقوت نے لکھا ہے کہ اس مہم کا سردار مغیرہ سنہ ۲۹ھ/۶۵۰ء تک زندہ تھا۔(۶۸) کیوں کہ مغیرہ کے بھائی عثمان ثقفی نے اسی سال بصرہ میں دریائے فرات کے کنارے شط عثمان میں اس کو زمین کا ایک ٹکڑا دیا تھا جس پر اس نے مکان تعمیر کیا تھا اور اس مکان کا نام مغیرتان رکھا تھا۔(۶۹) چنانچہ بلاذری کا یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے کہ مغیرہ کو دیبل کی بحری جنگ میں کامیابی ہوئی تھی۔(۷۰) چچ نامہ میں اس کی شکست اور جنگ میں مارے جانے کا جو بیان ہے، وہ غلط ہے۔(۷۱)

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں صحابہ کا ہند میں ورود

حضرت عمرؓ کے عہد میں عربوں نے ہند پر جو بری اور بحری حملے کیا، ان کا حال اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ زمانہ صحابۂ رسولؐ کا زرّیں دور تھا۔ اس وقت تک مسلمانوں میں کوئی فرقہ بندی، شیعی یا خارجی یا اموی اور ہاشمی کی کوئی تفریق نہ ہوئی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں میں باہمی جنگ و جدل ختم کر کے جو اتحاد قائم کیا تھا، اس میں کوئی خلل نہیں پڑا تھا۔ صحابۂ کرامؓ جسدِ واحد کی طرح اسلام کی پشت پناہی کے لیے متحد تھے اور ان کا واحد مقصد یہ تھا کہ ساری دنیا میں اسلام کا پیغام پہنچا دیں۔ چنانچہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بارہ سال کے اندر وہ ایک طرف تو دریائے نیل کے اس پار اور دوسری طرف دریائے سندھ کے کنارے تک پہنچ گئے۔ ہند کے خلاف مہموں میں جن صحابہ نے حصہ لیا، ان میں سے یہ نام ہم تک پہنچے ہیں:

(۱) عبداللہؓ بن عبداللہ بن عتیق — (۲) عاصمؓ بن عمرو التمیمی
(۳) صحارؓ بن العبدی — (۴) سہیلؓ بن عدی
(۵) الحکمؓ بن ابی العاص الثقفی۔

عبداللہؓ بن عبداللہ

ان کا تعلق انصارِ مدینہ کے ایک قبیلے بنو حبلا سے تھا۔ وہ ایک عالی رتبہ صحابی اور انصار میں بہت ممتاز شخصیت تھے۔(۷۲) سنہ ۲۱ھ/۶۴۱ء میں سعد کی جگہ کوفہ کے عامل ہوئے۔(۷۳) اور اسی سال کے آخر میں بصرہ کے عامل بنائے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے مشرقی ایران اور ہند کے سرحدی علاقوں میں فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی تاریخ وفات کا ذکر تاریخوں میں نہیں

ملتا۔(۷۴)

عاصمؓ بن عمرو التمیمی

یہ صحابیِ رسول اور ابتدائی دور کے ایک نامور سپہ سالار تھے۔(۷۵) عراق کی فتح میں وہ مشہور و معروف سپہ سالار حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ شریک ہوئے اور جنگ میں نمایاں حصہ لیا۔(۷۶) وہ پہلے عرب سپہ سالار تھے جس نے ہلمند کے مغرب کا علاقہ فتح کیا اور وادیِ سندھ کی فتح میں بھی حصہ لیا۔(۷۷)

صحارؓ بن العبدی

ان کا تعلق ایک قبیلہ عبدالقیس سے تھا۔ سنہ ۸ھ/۶۳۰ء میں وہ ایک وفد کے ساتھ حجر سے مدینہ منورہ آئے اور اسلام قبول کیا۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں بصرہ گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اُنہوں نے مشرقی جنگوں میں حصہ لیا اور دریائے سندھ کے مشرقی علاقے کی جو کیفیت اُنہوں نے بیان کی، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہاں کے جغرافیائی حالات سے بخوبی واقف تھے اور اس کے باشندوں سے بھی ربط رکھتے تھے۔ صحار ناصبی یعنی حضرت عثمانؓ کے طرف دار تھے۔ غالباً معاویہ کے آخر عہد میں بصرہ میں وفات پائی۔

سہیل بن عدی

ان کا تعلق قبیلہ اَزد سے تھا اور بنو اشہل سے منسلک تھے۔ ان کے صحابیِ رسولؐ ہونے کا کوئی براہِ راست ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن چونکہ وہ سنہ ۱۷ھ/۶۳۷ء میں الجزیرہ کے خلاف ایک فوجی مہم کے قائد تھے،(۷۹) اس لیے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ کی زندگی میں سہیل کی عمر اتنی ہو گئی تھی کہ وہ صحابہ کے زمرے میں شامل ہونے کا شرف حاصل کر سکیں، اور بالخصوص اس امر کے پیشِ نظر کہ ان کے سب بھائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت وفادار صحابی تھے۔ چنانچہ سہیل بن عدی، حارث بن عدی، عبدالرحمٰن بن عدی اور ثابت بن عدی غزوۂ احد میں شریک ہوئے تھے۔(۸۰)

الحکم بن ابی العاص ثقفی

یہ ان لوگوں میں شامل تھے جو بصرہ ہجرت کر گئے تھے۔(۸۱) حکم نے خود آنحضرتؐ سے احادیث روایت کی ہیں، اور قرہ المزنی (م ۱۱۳ھ) نے حکم سے احادیث روایت کی ہیں۔ حکم کا تعلق قبیلہٗ ثقیف سے تھا۔ اس قبیلے کے تمام بالغ افراد نے سنہ ۱۱ھ سے قبل ہی اسلام قبول کر لیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں شریک ہوئے تھے۔(۸۲) چنانچہ الحکم کو صحابی اور ان سے مروی احادیث کو معروف قرار دینے میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں ان کے صحابی ہونے کی شہادت ذہبی نے بھی دی ہے۔ الحکم سنہ ۴۴ھ/ ۶۶۴ء میں بقیدِ حیات تھے۔(۸۳)

حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں صحابہ کا ہند میں ورود

(۲۳ھ تا ۳۵ھ/ ۶۴۳ تا ۶۵۵ء)

مکران سے دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک وسیع علاقے میں جب عرب فتح یاب ہوئے تو یہاں کے باشندوں نے خراج دینا قبول کر لیا اور عرب واپس ہو گئے۔ مگر وحشی اور جنگجو پہاڑی قبائل مستقل طور پر محکوم نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ عربوں کے واپس ہوتے ہی اُنہوں نے سرکشی کی اور خراج دینا بند کر دیا۔

عبید اللہؓ معمر التمیمی

ان باغی قبائل کی سرکوبی کے لیے حضرت عثمانؓ نے جو حضرت عمرؓ کے بعد خلیفہ ہوئے تھے، ایک صحابی عبید اللہ بن معمر التمیمی کو روانہ کیا۔ عبید اللہ مدینہ کے رہنے والے اور بہت دولت مند تھے۔ وہ راویِ حدیث بھی ہیں۔(۸۴) ان کے اس تقرر کی صحیح تاریخ کا علم نہیں۔ مگر طبری نے جو واقعات لکھے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے سنہ ۲۳ھ میں خلیفہ ہونے کے بعد ہی ان کو مکران کی مہم پر روانہ کر دیا تھا۔(۸۵) مکران پہنچ کر عبید اللہ نے نہ صرف باغیوں کی طاقت کو بالکل کچل ڈالا بلکہ دریائے سندھ تک وسیع علاقے پر قبضہ بھی کر لیا۔(۸۶) اور اس طرح عربوں کا اقتدار مستقل ہو گیا۔ چنانچہ سنہ ۳۰ھ میں جب عبید اللہ کا تبادلہ فارس کیا گیا تو ان کی جگہ عمیر بن عثمان کا تقرر ہوا۔(۸۷)

عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ

عبدالرحمٰن بن سمرہ بن حبیب عبدالشمس بن عبد مناف دوسرے صحابی ہیں، جن کا ذکر حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں ہند کے خلاف مہم کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ ان کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا۔ سنہ ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر اُنہوں نے اسلام قبول کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ مسلمان ہونے سے پہلے ان کا نام عبد کلال یا عبد کعبہ تھا۔ سنہ ۹ھ/ ۶۳۰ء میں عبدالرحمٰن غزوۂ تبوک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔ عبدالرحمٰن نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث روایت کی ہیں اور اُنہیں ابنِ عباس، سعید بن المسیّب، ابن سیرین، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور حسن البصری کا شیخ ہونے کا امتیاز بھی حاصل تھا۔ ان سے مروی احادیث میں سے ایک صحیحین میں اور دو صرف صحیح مسلم میں شامل ہیں۔ (۸۸)

سنہ ۳۱ھ/ ۶۵۰ء میں عبدالرحمٰن، ربیع بن زیادہ کی جگہ سیستان کے عامل بنائے گئے تھے۔ (۸۹) وہ بڑے حوصلہ مند اور زبردست قوتِ عمل کے مالک سپہ سالار تھے۔ اپنے عہدے کا جائزہ لینے کے فوراً بعد ہی وہ زرنج سے مشرق کی طرف بڑھے اور ہند کی سرحدوں تک تمام علاقے پر قبضہ کرلیا۔ دریائے ہلمند کے زیریں علاقے میں بڑھتے ہوئے رود بار کے قریب ہندیوں سے تصادم ہوا۔ یہ جگہ موجودہ افغانستان اور بلوچستان کی سرحد پر ہے۔ (۹۰) پہلی فاتحانہ یلغار میں عبدالرحمٰن بست تک پہنچ گئے تھے۔ بست سے تین منزل کے فاصلے پر ایک پہاڑ میں سریا کا مندر تھا جسے عرب زُور کہتے تھے۔ اس کا بُت سونے کا بنا ہوا تھا اور آنکھوں کی جگہ دو لعل لگے ہوئے تھے۔ یہ پہاڑ جو الزور کے نام سے مشہور ہوا، اس وقت سندھ کے علاقے میں شامل تھا۔ (۹۱) ابن سمرہ مندر میں داخل ہوئے۔ بُت کا ایک ہاتھ کاٹ دیا اور دونوں لعل نکال لیے۔ پھر یہ سونا اور لعل اس علاقے کے حاکم کو جو حیرت زدہ ہو کر سب کچھ دیکھ رہا تھا، یہ کہتے ہوئے واپس دے دیا کہ "میں صرف یہ بتلانا چاہتا تھا کہ یہ بُت کوئی نقصان یا نفع نہیں پہنچا سکتا۔" (۹۲) سندھ کے علاقے میں کامیابی سے داخل ہونے کے بعد عبدالرحمٰن زرنج واپس ہو گئے جو ان کا مستقر تھا۔ سنہ ۵۰ھ/ ۶۷۰ء میں عبدالرحمٰن نے بصرہ میں وفات پائی۔ بصرہ میں ایک سڑک، سکہ ابن سمرہ، ان کے نام سے موسوم تھی۔ (۹۳)

امیر معاویہؓ کے عہد میں ہند میں صحابہ کا ورود

(۴۱ تا ۶۰ھ/ ۶۶۱ تا ۶۷۳ء)

سِنان بن سلمہ الہذلی

ہند میں آنے والے آخری صحابیِ رسولؐ سنانؓ بن سلمہ بن المحبق الہذلی تھے۔ (۸ تا ۵۳ھ/ ۶۲۹ تا ۶۷۳ء) سنان جب پیدا ہوئے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ نام رکھا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں صحابی تھے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کے بچپن میں بھی دیکھا تھا۔(۹۴) ابنِ حجر نے ان کو کم عمر صحابی شمار کر کے اپنے اصابہ میں قسمِ ثانی میں شامل کیا ہے۔ چنانچہ سِنان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث روایت کی ہیں، وہ مراسیل میں شمار کی گئی ہیں۔

سنان سے مروی احادیث صحیحین، اور ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی کے سُنن میں محفوظ ہیں۔(۹۶)

عراق کے عامل زیاد نے سنہ ۴۸ھ/ ۶۶۸ء میں سِنان کو ہندی مہمات کا سپہ سالار مقرر کیا۔(۹۷) سِنان نے مکران فتح کر لیا۔ شہر بسائے، اپنا مستقر بنایا اور نظامِ محاصل قائم کیا۔(۹۸) اور اپنے آپ کو ایک قابل سپہ سالار اور نظم ونسق کا ماہر ثابت کر دیا۔(۹۹) لیکن نامعلوم اسباب کی بناء پر اُنہیں سبکدوش کر دیا گیا۔ سِنان کی جگہ رشید بن عمرو الجدیدی کا تقرر کیا گیا جس کا تعلق قبیلہ ازد سے تھا اور وہ میدیوں سے لڑائی میں مارا گیا۔ اور سنہ ۵۰ھ/ ۶۷۰ء میں سِنان کو واپس بلا کر پھر سابقہ عہدے پر بحال کیا گیا۔(۱۰۰) پہلے کی طرح اس بار بھی اُنہوں نے اپنی عمدہ قابلیت کا ثبوت دیا اور قیقان اور بدھ فتح کر کے ان پر دو سال تک حکومت کی۔ سِنان قصدار(۱۰۱) میں، جس کا موجودہ نام خضدار ہے اور بلوچستان میں واقع ہے، سنہ ۵۳ھ/ ۶۷۳ء شہید ہو گئے۔(۱۰۲)

سِنان کی تاریخِ وفات کے بارے میں کچھ الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ ابنِ سعد کے بیان کے مطابق جس کی اِتباع بعد کے ماہرین اسماء الرجال نے کی ہے، سنان کا انتقال حجاج کی ولایت (۸۳ تا ۹۶ھ/ ۷۰۲ تا ۷۱۳ء) کے آخر زمانے میں ہوا تھا۔ لیکن یہ بعید از قیاس ہے کیوں کہ فتوح البلدان اور چچ نامہ، دونوں میں یہ لکھا ہے کہ سِنان کا انتقال ہند کی سرحد پر ان کی جنگی مہم کے دوران ہوا تھا نیز یہ کہ سنان کے عہدہ پر عبیداللہ بن زیاد کی طرف سے المنذر بن جرود کے تقرر سے قبل سِنان کا انتقال ہو

گیا تھا۔(۱۰۳) قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی صوبوں کے عامل کی حیثیت سے عبیداللہ کا تقرر ہونے کے بعد ہندی مہم کی ذمہ داری سنبھالنے والا پہلا افسر المنذر رتھا۔عبیداللہ ۵۷ تا ۶۷ھ/۶۷۶ تا ۶۸۶ء عامل رہے۔ المنذر کا تقرر یقیناً ۵۷ھ میں ہوا۔ اس لیے سِنان کا انتقال ۵۷ھ سے قبل ہوا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسری مرتبہ سنان کا تقرر ۵۰ھ میں ہوا تھا۔ اور وہ سرحدی علاقوں پر دو سال تک حکومت کرتے رہے۔اس لیے ان کا انتقال یقیناً ۵۳ھ میں ہوا ہوگا۔

اگر سنان کا انتقال حجاج کے آخر زمانۂ ولایت میں ہوا ہوتا جیسا کہ ابن سعد نے بیان کیا ہے، تو ان کی اور محدث قتادہ (۶۸-۱۱۷ھ) کی ملاقات (لقہ) ضرور ہوئی ہوتی کیوں کہ وہ دونوں بصرہ میں رہتے تھے۔(۱۰۴) لیکن ناقدینِ راویان کی رائے ہے کہ قتادہ نے سِنان سے کبھی ملاقات نہیں کی۔ (لم یلقہ) اور نہ اُن سے کوئی حدیث سنی۔ چنانچہ یہ واقعہ درست معلوم ہوتا ہے کہ سِنان ہند کی سرحد پر شہید ہوئے تھے۔یعنی ۶۱ھ میں قتادہ کی پیدائش سے سات برس قبل۔

مہلّب بن ابی صفرا

المہلب بن ابی صفر الازدی (۸ تا ۸۳ھ/۶۲۹ تا ۷۰۲ء) جو حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں ہند آئے تھے، ایک قدیم تابعی تھے۔ چونکہ ان کا نام الاستعاب، اسد الغابہ تجرید اور اصابہ میں موجود ہے، اس لیے اُنہیں صحابی تصور کیا جاتا ہے۔مگر اسماء الرجال کے ناقد اس پر متفق ہیں کہ المہلب ایک قدیم تابعی تھے، صحابی نہ تھے۔ اُنہوں نے صحابہ مثلاً عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاص، سمرہ بن جندب اور براء بن العازب سے احادیث روایت کی ہیں، اور ابو اسحاق السبیعی، سماک بن حرب اور عمر بن سیف البصری نے خود المہلب کے حوالے سے احادیث روایت کی ہیں۔ المہلب ایک ثقہ راوی تھے۔ وہ سنہ ۸ھ/۶۲۹ء میں پیدا ہوئے اور خراسان کے ضلع مروالرود میں بمقام راغول وفات پائی۔(۱۰۶) المہلب سے مروی احادیث سنن ابوداؤد اور النسائی اور جامع الترمذی اور مسند احمد بن حنبل میں درج کی گئی ہیں۔

المہلب، عبدالرحمٰن بن سمرا کے ایک ماتحت سپہ سالار کی حیثیت سے سنہ ۴۳ھ/۶۶۳ء میں بجستان آئے تھے۔ اصل فوج سے الگ ہوکر وہ ایک فوجی دستے کے ساتھ جو خود ان کے قبیلے ازد کے

افراد پر مشتمل تھا، ہند میں داخل ہو گئے۔ سنہ ۴۴ھ/ ۶۶۴ء میں علاقۂ کابل سے گزر کر لاہور تک جا پہنچے، اور بنوں اور لاہور کے درمیان کا علاقہ تاخت و تاراج کر ڈالا۔(۱۰۷) برگس نے تاریخ فرشتہ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ المہلب ملتان تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن اصل کتاب (مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء) میں یہ نہیں لکھا ہے۔ غالباً مترجم عربی کے اس جملہ کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکے: فاتی (المهلب) بنة والاهوار و هما بين الملتان و كابل۔ یعنی المہلب بنہ والاھوار پہنچ گئے جو کابل اور ملتان کے درمیان واقع ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بنہ موجودہ بنو ہے اور الاھوار، لاہور ہے۔ المہلب کے اس حملے کی تفصیلات کا علم نہیں۔

فرشتہ نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اسماء الرجال سے متعلق ایک اہم مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ یہ کہ المہلب اپنے ساتھ بارہ ہزار ہندی قیدی لے گئے تھے، جن میں سے کچھ مسلمان ہو گئے۔ اور جیسا کہ خطیب بغدادی کا بیان ہے خلف بن سالم السندی (م ۲۳۱ھ) جو خاندانِ المہلب کے مولا تھے، ایک ممتاز ہندی نژاد راویٔ حدیث تھے۔ فرشتہ کے مذکورۂ بالا بیان کو ملحوظ رکھتے ہوئے، بجا طور پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خلف بن سالم السندی انہی جنگی قیدیوں میں سے کسی کی اولاد میں تھے۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کئی ایک صحابہ ہند آئے تھے، لیکن وہ اس ملک میں علمِ حدیث کی اشاعت نہ کر سکے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اور یقیناً احادیث کا علم رکھتے تھے۔ مگر وہ ان احادیث کی اشاعت اس لیے نہ کر سکے کہ یا تو ان کا قیام بہت ہی مختصر رہا یا پھر ان کو یہاں مستقل سکونت اختیار کر لینے والے مسلمان نہ ملے جن کو وہ یہ علم سکھا سکتے۔ اس بارے میں تفصیلات کا علم نہیں تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں حالات ایسے تھے، جن میں اشاعتِ حدیث کا کام پوری توجہ سے انجام نہیں دیا جا سکتا تھا اور اس کا آغاز اس وقت کیا گیا جب پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی میں سندھ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

حواشی:

(۱) ذہبی، تجرید اسماء الصحابہ، حیدر آباد، دکن ۱۳۱۵ھ، ج ۱، ص ۳۹۹۔

(۲) یاقوت حموی، معجم البلدان، مرتبہ وسٹن فلٹ Wustenfeld، لائپزگ، ۱۸۶۶ء، ج ا، ص ۶۴۱۔

(۳) ایضاً۔ طبری، تاریخ الرسل والملوک مرتبہ ڈی گوئے deGoete (لائیڈن، ۱۸۹۳ء) ج ا، ص ۲۳۷۸، ۲۳۸۲۔

(۴) موئر Muir: Annals of the Early Caliphate، (ایڈنبرا، ۱۹۱۵ء)، ص ۲۵۸۔

(۵) طبری، تاریخ، ج ا، ص ۲۵۶۸۔

(۶) ایضاً، ص ۳۵-۲۶۳۴۔ فارس میں عرب فوجیوں کی عام بھرتی کے بارے میں کچھ الجھاؤ پایا جاتا ہے، شعیب، سیف، محمد، طلحہ وغیرہ کی سند سے طبری نے (ج ا، ص ۲۵۶۸ء) (اس کی تاریخ ۱۷ھ/۶۳۹ء لکھی ہے۔ اور پھر انہی اسناد کی بنا پر (ج ا، ص ۲۶۳۵ء) یہ تاریخ ۲۱ھ/۶۴۱ء قرار دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر صحیح تاریخ کیا ہوسکتی ہے۔ یہ بات قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت عمرؓ نے جو اسلامی سلطنت کو وسعت دینے کے معاملے میں بہت محتاط اور چوکس رہنے کی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھے، ایران میں عرب فوجیوں کی عام بھرتی کرنے کا حکم ۱۷ھ/۶۳۹ء میں دیا ہو جو کہ بالکل ابتدائی زمانہ تھا اور عربوں نے مغربی فارس میں ابتدائی کامیابیاں حال ہی میں حاصل کی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فتحِ نہاوند کے بعد حضرت عمرؓ کو یہ اندازہ ہوا کہ یزدجرد ہر سال جنگ کرتا رہے گا اور حالات اس وقت تک بہتر نہ ہوسکیں گے جب تک کہ یزدجرد کو فارس میں رہنے دیا جائے گا۔ چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ عرب فوجیں جمع کرنے کا مقصد یہی تھا کہ یزدجرد کی طاقت پر کاری ضرب لگائی جائے اور اس کے لیے ۱۷ھ/۶۳۹ء ہرگز موزوں وقت نہ تھا۔ مزید برآں ۱۷ھ/۶۳۹ء والا حکم فارس میں دیکھ بھال کرتے رہنے کی غرض سے جاری کیا گیا تھا۔ نہ کہ فارس کے مشرقی صوبوں میں فوجیں جمع کرنے کی غرض سے جیسا کہ طبری ہمیں باور کرانا چاہتا ہے۔ (ج ا، ۶۹-۲۵۶۸)۔ ان دونوں تاریخوں میں توافق پیدا کرنے کے لیے ابنِ اثیر نے (تاریخ الکامل، مطبوعہ مصر، ۱۳۰۱ھ، ج ۳، ص ۲۷۳۔ ج ۳، ص ۹۷۸)۔ یہ بیان کیا ہے کہ احکام جاری تو ۱۷ھ/۶۳۹ء میں کیے گئے تھے مگر ان پر عمل ۲۱ھ/۶۴۱ء یا ۲۲ھ/۶۴۲ء میں کیا گیا۔ ابن خلدون نے بھی تاریخ، مطبوعہ مصر، ج ۴، ص ۱۲۲) ابنِ اثیر کی تائید کی ہے۔ حضرت عمرؓ کی احتیاط پسندی اور متوقع دشواریوں کے پیشِ نظر فوجی اجتماع کی تاریخ ۱۷ھ/۶۳۹ء قرار دینا ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔

(۷) ذہبی، تجرید، ج ا، ص ۱۰۔

(۸) ایضاً، ج ۲، ص ۵۵۔

(۹) ایضاً، ج ا، ص ۲۰۲۔

(۱۰) ایضاً، ج ا، ص ۲۱۷۔

(۱۱) طبری، تاریخ، ج ا، ص ۲۵۶۹۔

(۱۲) ایضاً۔

(۱۳) ایضاً، ص ۳۱۳۵۔

(۱۴) لے اسٹرنج Lands of Eastern Caliphate:Le Strange (کیمبرج ۱۹۱۵ء)، ص ۲۰۲۔

(۱۵) ذہبی، تجرید، ج ۲، ص ۲۱۹۔

(۱۶) طبری، تاریخ، ص ۴۱-۲۶۳۷۔

(۱۷) لے اسٹرنج، کتاب مذکور، نقشہ نمبر ۱، مقابل ص ۱، ص ۳۳-۳۲۱۔

(۱۸) طبری، تاریخ، ص ۲۶۴۱۔

(۱۹) لے اسٹرنج، کتاب مذکور، ص ۳۲۳۔

(۲۰) طبری، تاریخ، ۸۵-۲۷۰۳۔

(۲۱) لے اسٹرنج، کتاب مذکور، ص ۳۳۹۔

(۲۲) طبری، تاریخ، ص ۰۶-۲۷۰۵۔

(۲۳) اس نام کی مختلف تشریحات کے لیے ملاحظہ ہو ایلیٹ The History of India:Elite، لندن، ۱۸۰۰ء، ج ۲، ص ۴۱۷، ریورٹی Notes on Afghanistan and Parts of :Raverty Baluchistan، ۱۸۸۸ء، ص ۵۶۸، طبری، تاریخ، ص ۲۷۰۷۔ نوٹ بلاذری، کتاب فتوح البلدان، مرتبہ ڈی گوئے deGoeje لائیڈن، ۱۸۶۶، ص ۲۹۶-۴۰۲، ۴۳۸، مرگاٹن Murgotten: the origins of the Islamic State (یہ فتوح البلدان کا ترجمہ ہے)۔ ہودی والا Hodivala، Studies in Indo-Muslim History، بمبئی، ۱۹۳۹ء، ص ۱۷۷، (ہودی والا کا یہ بیان درست نہیں کہ یہ لقب عربی تاریخوں میں ۴۳ھ سے پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ تاریخِ طبری (ج ۱، ص ۲۷۰۷) میں یہ اس سے قبل یعنی ۱۳/۴۴ھ/۶۴۱ء کے واقعات میں موجود ہے۔

(۲۴) طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۷-۲۷۰۶۔

(۲۵) ان کا ذکر آگے آئے گا۔

(۲۶) طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۲۷۰۸۔

(۲۷) یاقوت حموی، ج ۴، ص ۶۹۷۔

(۲۸) طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۲۷۰۸۔

(۲۹) طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۱۶۸۸ و مابعد، ابن حجر عسقلانی، الصابہ، ج ۱، ص ۱۰۹۸ و مابعد، تبریزی، الاکمال فی السماء والرجال جو مشکوٰۃ المصابیح کے ساتھ دہلی میں طبع ہوئی تھی، ص ۶۶۔

(۳۰) صفی الدین خلاصہ تھذیب الکمال، مطبوعہ مصر، ص ۱۲۰۔

(۳۱) عسقلانی، اصابہ، حوالۂ مذکور۔

(۳۲) عسقلانی، اصابہ، ج ۱، ص ۳-۲۰۷-۸۔ ذہبی، تجرید اسماء الصحابہ، ج ۱، ص ۴۴۔

(۳۳) عبدالحی ندوی، نزھتہ الخواطر، مخطوطہ، مملوکہ ڈاکٹر عبدالعلی لکھنوی، ج ۱: الطبقۃ الاولی فیمن قصد الھند فی القرن الاوّل یادِ ایام یا تاریخِ گجرات، مطبوعہ لکھنؤ، ص ۵۰۴۔

(۳۴) بلاذری، فتوح البلدان، ص ۳۲-۴۳۱: مرگاٹن، ص ۱۰-۲۰۹۔

(۳۵) ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۴، ۶ میں مغیرہ کو مغارہ لکھا ہے، جو درست نہیں۔

(۳۶) ہند پر عربوں کے پہلے حملے کی تاریخ عام طور پر ۱۵ھ/۶۳۷ء بتلائی جاتی ہے جو دراصل ہند کے خلاف بحری مہم روانہ کرنے والے حاکم عثمان ثقفی کے بحرین اور عمان کا عامل مقرر ہونے کی تاریخ ہے۔ (بلاذری)

(۳۷) بلاذری، فتوح، ص ۸۱-۸۲، ہٹی P.K. Hitti فتوح البلدان کا انگریزی ترجمہ، مطبوعہ نیویارک، ۱۹۱۶ء، ج ۱، ص ۱۲۵۔

(۳۸) لوط بن یحییٰ جوابی مخنف کے نام سے مشہور ہے، ایک مؤرخ تھا۔ اس نے ۱۷۰ھ/۷۸۶ء سے قبل وفات پائی۔ ذہبی، میزان الاعتدال، مطبوعہ مصر، ۱۳۲۵ھ، ج ۲، ص ۳۶۰ عسقلانی، لسان المیزان، حیدرآباد دکن، ج ۴، ص ۴۹۲۔

(۳۹) علی بن محمد بن عبداللہ بن ابی سیف جو المدائنی کے نام سے مشہور ہے، ابومخنف کا شاگرد تھا۔ اس نے ۲۲۴ھ/۲۲۸ء تا ۲۲۵ھ/۸۳۹ء میں ۹۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (میزان، ج ۲، ص ۲۳۶، لسان ج ۴، ص ۴۹۲۔

(۴۰) بلاذری، فتوح، ص ۴۳۱: مرگاٹن، ص ۲۰۹۔

(۴۱) علامہ سید سلیمان ندوی کو اس بات میں شبہ ہے کہ عثمان ثقفی کو ۱۵ھ میں عامل مقرر کیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو، ان کی کتاب عربوں کی جہاز رانی، اعظم گڑھ ۱۹۳۵ء، ص ۵۹، نوٹ اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن، ج ۱۵، ش ۴، اکتوبر ۱۹۴۱ء مضمون Arab Navigation، ص ۴۲۸، نوٹ۔

(۴۲) سمعانی کتاب الانساب، و ۸۴ ب، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۱، ص ۶۷۳، ہٹی Hitti: History of the Arabs، لندن، ۱۹۱۴ء، ص ۲۴۱۔

(۴۳) ابن سعد، طبقات الکبیر، مرتبہ سخاؤ Sachau لائیڈن ۱۹۱۵ء، ج ۷، ج ۱، ص ۳۶ و مابعد۔

(۴۴) جہاں تک مدائنی کے بیان (بلاذری، ۴۳۱) کا تعلق ہے، یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے استاد ابومخنف سے معلومات حاصل کی تھیں۔ چنانچہ ان دونوں میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔

(۴۵) طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۲۴۸۱۔

(۴۶) طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۲۵۴۵ و مابعد۔

(۴۷) ابنِ اثیر، تاریخ الکامل، مصر، ۱۳۰۱ھ، ج ۳، ص ۱۰۔ ذہبی، تجرید، ج ۱، ص ۴۰۹، بلاذری کے ایک بیان (فتوح، ص 81: ہتی، ص ۱۳۴) کے مطابق علاء نے ۲۰ھ/۶۴۰ء میں وفات پائی۔

(۴۸) بلاذری، فتوح، ص ۳۴۶: مرگاٹن، ص ۶۰، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

(۴۹) طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۸۹-۲۳۸۸، ۲۴۲۶۔

(۵۰) ایضاً، ص ۲۳۸۹، ۲۴۲۶۔

(۵۱) ایضاً، ص ۲۴۸۱۔

(۵۲) ملاحظہ ہو، سابقہ حوالہ۔

(۵۳) ابن سعد حوالۂ مذکور۔ طبری، تاریخ، ص ۲۷۵۔

(۵۴) طبری، تاریخ، ص ۲۵۷۰۔

(۵۵) ایضاً، ص ۲۷۳۷۔

(۵۶) ایضاً۔

(۵۷) ابن اثیر، تاریخ، ج ۲، ص ۳۷۹، بلاذری، فتوح، ص ۸۲ و مابعد، ہتی: ص ۱۲۵ و مابعد۔

(۵۸) بلاذری حوالۂ مذکور۔

(۵۹) ایضاً، عثمان کو بحرین اور عمان دونوں کا عامل بنایا گیا تھا، اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جب وہ فارس میں مصروفِ جنگ تھا تو ان صوبوں میں اس کا مقام اس کے بھائی مغیرہ یا حفص کو حاصل تھا۔ اس کے علاوہ معجم البلدان، ج ۱، ص ۵۰۹ میں بھی یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ ”پھر اُنہوں نے (حضرت عمرؓ نے) بحرین اور عمان کا عامل عثمان الثقفی کو مقرر کیا۔ اور وہ حضرت عمرؓ کی وفات تک اس عہدہ پر فائز رہے۔“

(۶۰) چچ نامہ، ص ۵۷-۵۸۔ انگریزی ترجمہ از مرزا قلیچ بیگ فریدون بیگ، کراچی، ۱۹۰۰ء، اس میں یہ ۱۱ھ/۶۳۲ء کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔ کیوں کہ حضرت عمرؓ ۱۳ھ/۶۳۴ء میں خلیفہ ہوئے تھے۔ اور سہ شنبہ ۲۷ ذوالحجہ ۲۳ھ (اکتوبر ۶۴۴ء) کو ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا۔ (ابنِ اثیر، تاریخ، ج ۲، ص ۲۶)۔

(۶۱) موئز، کتاب مذکور، ص ۲۰۶۔

(۶۲) احمد حسین، ترجمہ تاریخ ابنِ خلدون، الٰہ آباد، ۱۹۰۱ء، ج ۴، ک ۲، ص ۱۵۵۔

(۶۳) سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہاز رانی، ص ۵۲-۵۳، اسلامک کلچر، حیدرآباد، دکن، ج ۱۵، مضمون Arab Navigation، ص ۴۳۵۔

(۶۴) طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۲۵۴۵ و مابعد۔ ابنِ اثیر، تاریخ، ج ۲، ص ۶۵، ۲۶۴

(۶۵) طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۴۹-۲۵۴۸۔

(۶۶) ایضاً، ص ۲۸۲۲۔ اقتباس، عربوں کی جہاز رانی، ص ۵۳ اور اسلامک کلچر، حیدرآباد۔ الاعلیٰ کو عاملِ بحرین کے عہدے سے برطرفی کی سزادی گئی تھی۔ (طبری)، تاریخ، ج ۱، ص ۲۵۴۸۔

(۶۷) بلاذری، فتوح، ص ۴۳۲: مرگاٹن، ص ۲۰۹۔

(۶۸) یاقوت، معجم البلدان، ج ۳، ص ۹۱-۲۹۰ اور ۵، ص ۶۴۵۔

(۶۹) عثمان ثقفی کے چار بھائی تھے۔ حکم، مغیرہ، حفص اور امیہ۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں وہ بصرہ آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ عثمان ثقفی کو دریائے فرات کے کنارے الابلہ کے قریب ایک وسیع قطعۂ زمین عطا کیا گیا تھا۔ جو شط عثمان کہا جانے لگا۔ عثمان نے اپنے بھائیوں کو بھی اس زمین میں حصہ دیا تاکہ وہ اپنے مکانات تعمیر کر لیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے مکانات بنا لیے، جو اپنے مالکوں کے نام سے موسوم ہوئے۔ مغیرہ کا مکان مغیرتان کہا جاتا تھا۔ اسی طرح دوسرے بھائیوں کے مکان بھی ان کے ناموں سے موسوم ہو کر حکمان، حفصان اور امیان کہے جانے لگے۔ (بلاذری، فتوح، ص ۱۵۲-۱۵۱، ۳۶۱ و مرگاٹن، ص ۶۹، ۶۸۔ یاقوت، معجم البلدان، ج ۱، ص ۶۴۵)۔

عثمان ثقفی کو یہ زمین عطا کیے جانے کے بارے میں امیر المومنین حضرت عثمان کی جانب سے جو وثیقہ دیا گیا تھا، اس پر ۲۲ر جمادی الثانی ۲۹ھ کی تاریخ درج ہے۔ اور اس کا مضمون یہ ہے جو معجم البلدان، ج ۳، ص ۹۱-۲۹۰ سے اخذ کیا گیا ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم، هذا كتاب عبدالله عثمان امير المومنين لعثمان بن ابى العاصى انى اعطيتك الشط لمن ذهب الى الابلة من البصرة و المقابلة توبة الابلة و القرية التى كان الاشعرى عمل فيها واعطيتك ما كان الاشعرى عمل من ذلك واعطيتك براح ذلك الشط اجمة وسبحة فيما بين الحرارة الى دير جابيل الى القبرين اللذين على الشط المقابلين للابلة واعطيتك ما عملت من ذلك انت وبنوك ان واحدا تعبه شيئاً من ذلك من اخرتك فاعتمله عن عطيتك وامرت عبدالله بن عامر ان لايمنعكم شيئاً اخذتموه ترون انكم تستطيعون عمله من ذلك فما كان فيه بعد ماعملتم واخترتم من فضل لاترونكم ما عملتموه فليس لكم ان تتحولو دونه لمن ارادا مير المومنين ان يعمل فيه حجة له واعطيتك ذلك عوضا عن ارضك التى اخذت منك بالمدينة التى اشتراهالك امير المومنين عمر بن الخطابؓ وما كان فيما سميت فضل عن تلك

الارضين وانها عطية اعطيتک ايها اذاعزلتک عن العمل وقد کتبت الی عبدالله بن عامر ان يعينک فی عملک و يحسن لک العون فاعمل باسم الله وعونه وامسک شهدا المغيرة بن الاخفش والحارث بن الحکم بن العاصی وفلان بن ابی فاطمه و کتب و تاريخه لثمان بقين من جمادی الاخرة سنة ۲۹ ۔

(۷۰) بلاذری، حوالۂ مذکور۔

(۷۱) چچ نامہ کا اصل عربی نسخہ جس پر مصنف کا نام درج تھا، گم ہو چکا ہے، اور اس کے ملنے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ایک سند کی حیثیت سے یہ کتاب بہت مشتبہ ہو گئی ہے اور چچ نامہ کے برعکس بلاذری کی رائے مستند اور ناقابلِ تردید ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کی روشنی میں آر۔ سی۔ موجمدار کی مخالفانہ رائے (ملاحظہ ہو، جرنل آف انڈین ہسٹری، مدراس، ج ۱۰، ح ۱، مضمون The Arab Invasion of India، مطبوعہ مدراس، ۱۹۳۱ء، ص ۲۸، ۲۹) اور عربوں اور ان کے خلیفہ کی قوت کے بارے میں مورخ ایلیٹ کی آراء مستند نہیں ہو سکتیں کیوں کہ یہ چچ نامہ ہی پر مبنی ہیں۔

(۷۲) طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۲۶۳۵۔

(۷۳) ایضاً، ص ۰۹-۲۶۰۸۔

(۷۴) عسقلانی، اصابہ، ج ۲، ص ۸۱۷ و مابعد، ذہبی، تجرید، ج ۱، ص ۳۴۵۔ عزالدین اسد الغابہ، ج ۳، ص ۱۹۹۔

(۷۵) طبری، تاریخ، ص ۲۵۶۹۔

(۷۶) ایضاً، ج ۱، ص ۲۰۲۷، ۲۰۵۸ اور مابعد۔

(۷۷) ابن عبدالبر، الاستیعاب، حیدرآباد دکن، ۱۳۳۶ھ، ج ۲، ص ۵۰۰۔ عسقلانی، اصابہ، ج ۲، ص ۶۱۴۔

(۷۸) ابنِ سعد، طبقات، ج ۷، ح ۱، ص ۶۱۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب، ج ۱، ص ۳۲۲، عزالدین، اُسد الغابہ، ج ۲، ص ۱۱۔ ذہبی، تجرید، ج ۱، ص ۲۸۲۔ عسقلانی، اصابہ، ج ۲، ص ۴۷۲۔

(۷۹) طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۲۴۹۹۔

(۸۰) ابن عبدالبر، استیعاب، ج ۱، ص ۵۷۸، عزالدین، اسد الغابہ، ج ۳، ص ۱۲، ذہبی، تجرید، ج ۱، ص ۳۶۳۔ عسقلانی، اصابہ، ج ۳، ص ۲۲۔

(۸۱) ابنِ سعد، طبقات، ج ۷، ص ۲۷۔

(۸۲) عسقلانی، اصابہ، ج ۱، ص ۷۰۳۔

(۸۳) طبری، تاریخ، ج ۲، ص ۸۰۔ ذہبی، تجرید، ج ۱، ص ۱۴۵، عزالدین، اسد الغابہ، ج ۲، ص ۳۵۔ ابن عبدالبر، استیعاب، ج ۱، ص ۱۱۸۔ عسقلانی، اصابہ، ج ۱، ص ۷۰۷۔

(۸۴) ابن عبدالبر، استیعاب، ج ۲، ص ۵۰۴۔ عزالدین، اسد الغابہ، ج ۳، ۳۴۵، ذہبی، تجرید، ج ا، ص ۳۹۱، عسقلانی، اصابہ، ج ۳، ص ۵۳ و مابعد۔

(۸۵) طبری، تاریخ، ج ا، ص ۲۹-۲۸۲۸۔

(۸۶) ایضاً، ص ۲۸۲۹۔

(۸۷) ایضاً، ص ۲۸۳۰۔

(۸۸) ابن سعد، طبقات، ج ۷، ح ۲، ص ۱۰۱، ابن عبدالبر، استیعاب، ج ۲، ص ۳۹۴-۳۹۳۔ عزالدین، اسد الغابہ، ج ۳، ص ۹۸-۲۹۷۔ عسقلانی، اصابہ، ج ۲، ص ۶۴-۹۶۳، عسقلانی، تہذیب التہذیب، حیدرآباد، دکن ۱۳۲۵ھ، ج ۶، ص ۱۹۰، صفی الدین خلاصہ، ص ۱۹۳۔

(۸۹) ایلیٹ، ہسٹری، ج ا، حوالۂ مذکور۔

(۹۰) موجمدار کتاب مذکور، ص ۱۵۔

(۹۱) یاقوت، معجم البلدان، ج ۲، ص ۵۵۶۔ لے اسٹرینج، کتاب مذکور، ص ۳۴۵۔

(۹۲) بلاذری، فتوح البلدان، ص ۳۹۴۔

(۹۳) ایضاً، ص ۳۵۲۔

(۹۴) عسقلانی، اصابہ، ج ا، ص ۴۔

(۹۵) ایضاً، ج ۲، ص ۲۳، ۳۲۲۔

(۹۶) صفی الدین، خلاصہ، ص ۱۳۲۔

(۹۷) ابن العماد، شذرات الذہب، مصر، ۵۳-۱۳۵۱، ج ا، ص ۵۵۔

(۹۸) ذہبی، تجرید، ج ا، ص ۲۵۸۔ عزالدین، اسد الغابہ، ج ۲، ص ۵۸-۳۵۷، ابن عبدالبر، استیعاب، ج ۲، ص ۵۶۶۔

(۹۹) بلاذری، فتوح، ص ۴۳۵: مرگاٹن، ۲۱۳، ایلیٹ، ہسٹری، ج ا، ص ۴۲۴، چچ نامہ، ص ۶۵۔

(۱۰۰) چچ نامہ، ص ۶۵۔

(۱۰۱) بلاذری، حوالۂ مذکور۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ا، ص ۴۲۵ میں اس علاقے کی جغرافیائی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ مکران کی شمال مشرقی سرحد پر ہند کی سرحد کے قریب دو اضلاع کا ذکر عرب جغرافیہ دانوں نے کیا ہے۔ ایک طوران جس کا مستقر قصدار قنداابیل تھا۔ (لے اسٹرینج، کتاب مذکور، ص ۳۳۱) قندیل وہی مقام ہے جسے اب گندالوا کہتے ہیں اور جوبسی کے جنوب اور قلات کے مشرق میں واقع ہے۔ (ایضاً، ص ۳۴۲) بدھ یا بدھ بلاشبہ بدھا ہے اور غالباً اس میں بلس اور دلستن کے اضلاع شامل تھے۔

(موجمدار، کتابِ مذکور، ص ۵۵)

(۱۰۲) ابنِ سعد، طبقات، ج ۸، ح ۱، ص ۱۵۴۔

(۱۰۳) ایضاً، ج ۷، ح ۱، ص ۶۱۔ بلاذری، حوالۂ مذکور، چچ نامہ، ص ۶۵۔

(۱۰۴) عسقلانی، تہذیب، سنان بن سلمہ اور قتادہ کے بیان۔

(۱۰۵) ایضاً، ج ۴، ص ۲۴۱۔

(۱۰۶) طبری، تاریخ، ج ۴، ص ۱۰۸۲ (طبری نے راغول کی جگہ زاغول لکھا ہے)۔ ابنِ سعد، طبقات، ج ۷، ح ۱، ص ۶۴۔ نووی، تہذیب اسماء الرجال اللغت۔ مرتبہ وسلن فلٹ، گوٹنجن، ۴۷۔۱۸۴۲، ص ۵۸۲، ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب، حیدرآباد، دکن ۱۳۲۵ھ، ج ۵، ص ۲۹-۳۲۸۔ ابنِ خلکان، وفیات الاعیان، قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ج ۲، ص ۴۵ اور مابعد۔

(۱۰۷) بلاذری، فتوح، ص ۴۳۲، مرگاٹن ص ۲۱۰۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ۲، ص ۴۱۴۔ بلاذری کے بیان کے مطابق یہ حملہ جس علاقہ پر ہوا، وہ بنہ اور الاہوار کا علاقہ تھا۔ بنہ تو بلاشبہ موجودہ بنو ہے جو شمالی مغربی سرحدی صوبے میں واقعہ ہے۔ لیکن الاہوار کہاں تھا، اس کا یقین کرنے میں حال کے مؤرخوں میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ایلیٹ، ہسٹری، مینارڈ (Dictionaire De La Perese: Maynard)، ص ۱۱۸۔ سلیمان ندوی (فتوح البلدان) مملوکہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ص ۴۳۲ کے حاشیہ پر ایک نوٹ کے مطابق) اسے موجودہ لاہور قرار دیتے ہیں۔ لیکن موجمدار (کتابِ مذکور) اس جگہ کا صحیح تعین نہ کر سکے، اور اسے بنو کے قریب ایک جگہ فرض کر لیا۔ یہ اختلاف فتوح البلدان کے مخطوطات میں فرق کی وجہ سے بھی پیدا ہوا ہے۔ یعنی اسے الاہواز، الاہوار، اور لھاور (فتوح البلدان، ج ۱، ص ۴۷۷) بھی لکھا گیا ہے:

وفی کتاب الفتوح غزا المهلب بن ابی صفرة سنة ۴۴ ایام معاویة ثغر السند فاقی نبه و لاهور.

الاھواز خوزستان کا مستقر تھا۔ لے اسٹرینج، کتابِ مذکور، ص ۲۳۳، اس لیے ہند سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک نقطہ کے فرق سے الاہوار، الاہواز بن جاتا ہے اور یہ مخطوطہ کی کتابت میں غلطی سے ہو سکتا ہے، اس لیے اہواز اور لاہور کو ایک ہی سمجھ لینا خارج از بحث ہے۔ اب یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ لھور کو لاہور ہی سمجھا جائے۔ یاقوت (معجم البلدان اور کننگھم Ancient Geography of India: Cunningham، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۴۱ء، ص ۲۷-۲۲۶) دونوں کے بیان سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔

بابِ دوم

عربوں کے عہد میں سندھ میں علمِ حدیث

فصل اوّل: سندھ میں عربوں کی نوآبادیاں

پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی میں سندھ میں عربوں کی ایک ریاست کا قیام اس اعتبار سے ایک عہد ساز واقعہ تھا کہ اس کی وجہ سے سندھ کے دروازے عربوں کے لیے کھل گئے۔ بحری راستوں کے علاوہ جن سے عرب ہند سے اپنے تجارتی تعلقات کی وجہ سے قدیم زمانے سے واقف تھے، (۱) اب ان کے لیے بصرہ سے براہِ شیراز وکرمان اور ساحلِ مکران سندھ تک ایک برّی راستہ بھی کھل گیا اور اس راستے سے آمدورفت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ (۲) اس طرح سندھ برّی اور بحری دونوں راستوں سے عرب سے مربوط ہوگیا اور ان ملکوں کے درمیان مواصلات کی سہولتیں فراہم ہوگئیں۔ ۹۳ھ/۷۱۱ء میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا اور سندھ میں عرب آباد کار بڑی تعداد میں آنے لگے۔ کیوں کہ محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقہ میں عربوں کو آباد کرنے سے بہت دلچسپی لی۔ (۳) عرب پورے علاقے میں پھیل گئے اور دیبل سے ملتان تک اہم بندرگاہوں اور شہروں میں ان کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں۔ (۴) جنوبی ہند کے عربوں کی طرح ان عربوں نے بھی تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور تجارتی روابط کو سندھ اور ہند کے ہمسایہ ملکوں کے درمیان تعلقات کا ذریعہ بنا دیا۔ (۵) آبادکاروں کے علاوہ عرب سپاہیوں نے بھی سندھ میں سکونت اختیار کر لی، اور اس طرح سے اس علاقے میں عربوں کی آبادی بہت بڑھ گئی۔ عربوں کی تعداد کتنی زیادہ ہوگئی تھی، اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ محمد بن قاسم نے صرف ملتان میں پچاس ہزار سواروں پر مشتمل ایک فوج رکھی تھی۔ (۶) ملتان کے علاوہ منصورہ، الُور وغیرہ کئی اور اہم فوجی مراکز تھے، جہاں عربوں کی فوجیں مستقل طور پر متعین کی گئی تھیں۔

اس طرح اسلامی سلطنت کے بعید مشرقی علاقے میں عربوں کی کئی نوآبادیاں قائم ہو گئیں جن میں منصورہ، ملتان، دیبل، سندان، قصدار اور قندابیل کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور یہ مقامات سندھ میں اسلامی علوم کے ابتدائی مراکز بن گئے۔(۷)

فصلِ دوم: سندھ میں اسلامی علوم کی اشاعت

عرب فوجوں اور آبادکاروں کی آمد سے سندھ میں جو بیداری پیدا ہوئی، اس کی وجہ سے اس علاقے میں اوّلین اصلاحی علوم یعنی قرآن و حدیث کی اشاعت ہونے لگی۔ ان علوم کی اشاعت پہلے دریائے سندھ کے مغربی علاقوں میں ہوئی اور اس کے بعد مشرقی علاقوں میں۔ کیوں کہ مسلمانوں کا قبضہ پہلے مغربی علاقوں پر ہوا، اور پھر مشرقی علاقوں پر۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں عربوں نے ۲۳ھ تا ۹۶ھ/۶۴۳ء میں مکران، طوران اور بدھ فتح کر لیا تھا۔ یہ علاقے دریائے سندھ کے مغرب میں واقع ہیں اور بیس سال کے بعد ہی یہ اسلامی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ لیکن سندھ کا مشرقی علاقہ ولید بن عبدالملک (۸۶ھ/۷۰۵ء تا ۷۱۴ء) کے عہد میں فتح ہوا۔ مزید برآں مغربی علاقے میں کئی اسلامی علوم اسی وقت پہنچ گئے تھے، اگرچہ ان کی اشاعت بعد میں کی گئی۔ تاہم اس بارے میں کوئی قطعی علم نہیں ہے۔

سندھ میں اسلامی علوم کے آغاز اور ان کی اشاعت کے بارے میں سب سے پہلا اور باقاعدہ تحریری ثبوت محمد بن قاسم کی فتحِ سندھ کے وقت سے ملتا ہے۔ چنانچہ واضح طور پر یہ لکھا گیا ہے کہ عرب فوج میں قرآنِ پاک کے بہت سے قاری تھے، جن کو حجاج نے یہ تاکید کی تھی کہ قرأت پابندی سے کیا کریں۔(۸) اس کے علاوہ محمد بن قاسم کے ساتھ ایسے کئی اشخاص بھی سندھ آئے تھے، جن کو علمِ قرآن و سنت پر عبور حاصل تھا۔(۹) اس کے بعد جب عرب بڑی تعداد میں سندھ میں آباد ہونے لگے تو یہاں ایسے عالم بھی آباد ہو گئے جن کی محنت اور علم سے محبت کی بدولت عربوں کی نوآبادیوں میں اسلامی علوم کے مراکز قائم ہو گئے۔

دورِ اوّل کے علمائے حدیث

ذیل میں چند ایسے علماء کا ذکر مختصر طور پر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جنھوں نے اسلامی

علوم اور بالخصوص علمِ حدیث کی اشاعت کی۔

۱۔موسیٰ بن یعقوب الثقفی:

یہ محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ آئے اور محمد بن قاسم نے ان کو الور کا قاضی مقرر کیا تھا۔ثقفی مستقل طور پر سندھ میں آباد ہو گئے تھے۔اور سنتِ رسولؐ کے بڑے عالم تھے۔اُچھ میں ان کا خاندان بڑی مدت تک علم وفضل کے لیے مشہور رہا، جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ صدیوں بعد ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں اسماعیل بن علی الثقفی، جو ان کی اولاد میں سے تھے،معدنِ علم و روحِ عقل تصور کیے جاتے تھے اور علم وتقویٰ اور فصاحت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔(۱۰)

۲۔یزید بن ابی کبشا السکسکی الدمشقی (م ۹۷ھ/۷۱۵ء):

سلیمان بن عبدالملک (۹۶ تا ۹۹ھ/۷۱۴ تا ۷۱۷ء) جب خلیفہ ہوا تو اس نے محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس بلا لیا اور ان کی جگہ یزید بن ابی کبشا کو مقرر کیا۔مگر وہ سندھ میں زیادہ دن نہیں رہ سکے اور وہاں پہنچنے کے صرف اٹھارہ روز بعد ہی فوت ہو گئے۔(۱۱)

یزید ایک تابعی تھے،اور اُنہوں نے ابوالدرداء(۱۲)،شرجیل بن اوس(۱۳)اور مروان بن الحکم(۱۴) سے جو سب صحابیِ رسولؐ تھے، بہت سی احادیث سماعت کیں۔ناقدین حدیث نے ان کو ثقہ راوی شمار کیا ہے۔ان کے شاگردوں میں ابوبشر، الحکم بن العتیبہ، علی بن الاقمر، معاویہ قرالمزنی اور ابراہیم السلسکی مشہور راویانِ حدیث تھے۔(۱۵) ان سے مروی احادیث صحیح بخاری(۱۶) اور محمد بن حسن الشیبانی کی کتاب الآثار اور حاکم نیشاپوری کی المستدرک(۱۶) میں موجود ہیں۔

۳۔المفضل المہلب بن ابی صفرہ (م ۱۰۲ھ/۷۲۱ء):

یزید بن عبدالملک (۱۰۱ تا ۱۰۵ھ/۷۲۰ تا ۷۲۴ء) کے عہدِ خلافت میں خراسان کے ایک سابق والی یزید بن المہلب کے زیرِ سرکردگی ۱۰۲ھ/۷۲۱ء میں عراق میں ایک زبردست بغاوت ہوئی تھی۔بنوامیہ کے خلاف اپنے منصوبوں میں یزید بن المہلب کو کوفہ اور بصرہ کی تائید حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔اور ابتداء میں اسے نمایاں فتوحات حاصل ہوئیں۔چنانچہ فارس، اہواز، کرمان اور قندابیل (سندھ کا حصہ) کے صوبے جن کا سلسلہ دریائے سندھ کے کناروں تک چلا گیا تھا، خلیفہ کے

ہاتھ سے نکل گئے اور یزید بن المہلب نے یہاں اپنے والی مقرر کیے۔(۱۸) اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے خلیفہ نے اپنے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کو روانہ کیا۔ ایک زبردست فیصلہ کن معرکے میں یزید بن المہلب اور اس کے لڑکے مارے گئے۔ اور اس خاندان کے بچے کھچے (۱۹) افراد ایک کشتی میں فرار ہو کر قندابیل (۲۰) (موجودہ گنداوا) پہنچے جو اس وقت کے سندھ کا ایک شمال مغربی صوبہ تھا۔(۲۱) لیکن موت ان لوگوں کے تعاقب میں تھی۔ خلیفہ کا عامل ہلال بن التمیمی جب ان لوگوں کا تعاقب کرتا ہوا پہنچا تو قندابیل کے والی وذّاء بن حامد نے جسے خود یزید بن المہلب نے اس عہدہ پر مقرر کیا تھا، غداری کی۔ لیکن المہلب کے بہادر بیٹوں نے ہتھیار نہیں ڈالے اور بیشتر افراد آخر دم تک لڑتے ہوئے مارے گئے۔(۲۲)

قندابیل (علاقۂ سندھ) میں المہلب کے جو بیٹے مارے گئے، ان میں المفضل راویٔ حدیث تھے۔ وہ تابعی (۲۴) تھے اور ایک صحابی نعمان بن بشیر (۲۵) سے حدیث روایت کرتے تھے۔ ان کے لڑکے حاجب، ثابت البنانی (م ۱۲۷ھ) اور حریز بن حازم المفضل سے حدیث روایت کرتے تھے۔(۲۶)

ابنِ حبّان اور علمِ حدیث کے دوسرے ناقدوں نے المفضل کو ثقہ راوی قرار دیا ہے۔(۲۷)

۴۔ ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ البصری نزیل السند (م ۱۵۵ھ / ۷۷۱ء):

یہ بصرہ کے باشندہ تھے۔ غالباً تاجر کی حیثیت سے سندھ آئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی، جیسا کہ ان کے لقب نزیل السند سے ظاہر ہوتا ہے۔(۲۸)

ابوموسیٰ ایک ثقہ راوی تھے اور حسن البصری (م ۱۱۰ھ) اور ابوالحازم الاشجعی (م ۱۱۵ھ) سے احادیث روایت کی ہیں۔ ایک محدث کی حیثیت سے ان کے مرتبہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سفیان الثوری (م ۱۶۱ھ)، سفیان بن عیینہ (م ۱۹۸ھ) اور یحییٰ بن سعید القطّان (م ۱۹۸ھ) جیسے کامل فنِ محدث ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔(۲۹)

امام بخاری نے ابوموسیٰ سے مروی احادیث کا حوالہ صحیح بخاری میں چار مختلف مقامات پر دیا

ہے۔ اور سنن کی کتابوں میں بھی ان کی احادیث محفوظ کی گئی ہیں۔ (۳۰)

۵۔ عمرو بن مسلم الباہلی (م ۱۲۳ھ / ۷۴۰ء):

عمرو بن مسلم ماوراء النہر کے نامور فاتح قتیبہ بن مسلم الباہلی کے بھائی تھے۔ (۳۱) خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ (۹۹ تا ۱۰۱ھ / ۷۱۷ تا ۷۱۹ء) کے والی کی حیثیت سے وہ سندھ آئے تھے، اور اُنہوں نے ہند پر چند کامیاب حملے بھی کیے تھے۔ (۳۲) اُنہی کے دورِ ولایت میں خلیفہ کی دعوت پر کئی راجاؤں نے، جن میں داہر کا لڑکا ۔جے سنہا بھی شامل ہے، اسلام قبول کیا تھا۔ (۳۳)

ایک سپاہی کی پُر خطر زندگی گزارنے کے باوجود عمرو بن مسلم نے ایک حد تک علمِ حدیث کو ترقی دینے میں بھی حصہ لیا۔ اُنہوں نے لیلیٰ بن عبید سے احادیث روایت کی ہیں اور خود ان سے ابوالطاہر نے حدیثیں سنیں۔ (۳۴)

عمرو بن مسلم کی تاریخ وفات کا علم نہیں۔ تاہم یہ معلوم ہے کہ ان کا انتقال ۱۲۰ھ / ۷۳۸ء کے بعد ہوا۔ کیوں کہ اس سال وہ مَرْو کے عامل تھے۔ (۳۵)

۶۔ الربیع بن صبیح السعدی البصری (م ۱۶۰ھ / ۷۷۶ء):

ربیع بن صبیح ایک محدث اور احادیث کے قدیم مرتبین میں سے تھے۔ ابن صبیح (۳۶) کی کنیت ابوبکر (۳۷) اور ابن سعد کے بیان کے مطابق ابوحفص تھی۔ (۳۸) وہ ۱۶۰ھ / ۷۷۶ء میں ایک بحری فوج کے ساتھ ہند آئے تھے، جس نے المہدی (۱۵۸ تا ۱۶۹ھ / ۷۷۵ تا ۷۸۵ء) کے عہدِ خلافت میں عبدالملک بن شہاب المسمعی کی قیادت میں بربد پر حملہ کیا تھا۔ (۳۹) عربوں نے بربد فتح کر لیا جو اس زمانے میں ایک خوش حال بندرگاہ تھا۔ (۴۰) اب یہ مقام بھار بھٹ کہلاتا ہے اور بروچ کے قریب واقع ہے۔ (۴۱) اس کامیابی کے بعد عربوں کو ایک بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔ وطن واپس جانے کے لیے موافق ہواؤں کے انتظار میں ان کو بربد میں رکنا پڑا، اور اسی دوران میں ساحلی علاقوں میں طاعون پھیل گیا، جس سے بہت جانی نقصان ہوا، اور ربیع بن صبیح بھی اس وبا کا شکار (۴۲) ہو گئے۔ لیکن ابن سعد کا بیان ہے کہ الربیع کا انتقال بحری سفر کے دوران ہوا، اور ان کا ایک جزیرے میں دفن کیا گیا۔ (۴۳) ابنِ عماد کا بھی یہی بیان ہے اور اس نے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ واپسی کے

سفر میں الربیع نے وفات پائی۔(۴۴)

الرّبیع بصرہ کے باشندہ اور حسن البصری (م ۱۱۰ھ) کے شاگرد تھے، جن سے اُنہوں نے حدیث کا درس لیا تھا۔ اس کے علاوہ الربیع نے اس زمانے کے چند ممتاز محدثوں مثلاً حمید الطّویل (م ۱۴۲ھ) ثابت البنانی (م ۱۲۷ھ) مجاہد بن جبر (م ۱۰۳ھ) سے بھی علمِ حدیث حاصل کیا۔ اپنے ہم عصر راویانِ حدیث میں الربیع کو ایک بلند مرتبہ حاصل تھا۔ عبداللہ بن المبارک (م ۱۸۱ھ) سفیان الثوری، وقیعی (م ۱۹۷ھ) ابوداوٗد الطیالسی (م ۲۰۳ھ) اور عبدالرحمٰن بن المہدی (م ۱۹۸ھ) جیسے مشہور محدث الربیع کے شاگردوں میں شامل تھے اور ان سے احادیث روایت کرتے تھے۔(۴۵) مزید برآں وہ علمِ حدیث کے ان اوّلین علمبرداروں میں سے تھے، جنہوں نے دوسری صدی ہجری میں جمع وتدوینِ حدیث کا اہم کام کیا۔(۴۶)

فصل سوم: علمِ حدیث کے مراکز اور محدثین

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، سندھ میں مطالعۂ حدیث کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہو گیا تھا، مگر اس نے چوتھی صدی تک کچھ زیادہ ترقی نہیں کی۔ یہاں تک کہ مقامی طلباء میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا کہ وہ دوسرے ملکوں مین جا کے اس علم کا غائر مطالعہ کریں۔ اسلامی حکومت کی ابتدائی صدیوں میں سندھ میں علمِ حدیث کی ترقی کی رفتار سُست رہنے کے دو سبب قرار دیئے جا سکتے ہیں: (۱) اس زمانے کے حالات فن اور ادب کی ترقی کے لیے سازگار نہ تھے۔ کیوں کہ اموی اور عباسی خلفاء کے زمانے میں مستحکم اور طاقت ور حکومت نہ ہونے کی وجہ سے داخلی امن جو فن و ادب کی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے، ہمیشہ قائم نہیں رکھا جا سکا۔(۴۷) حقیقت یہ ہے کہ سلطنت کے مشرقی حصے میں سندھ کی حیثیت ایک علاقہ سے زیادہ بیرونی فوجی چوکی (ثغر)(۴۸) کی تھی جس پر مرکزی حکومت کوئی خاص توجہ نہ کرتی تھی۔ اور (۲) سندھ، عرب، عراق اور سلطنت کے دوسرے علاقوں کے اسلامی علوم کے مراکز سے روابط پیدا نہ کر سکتا تھا۔ کیوں کہ یہ علاقہ بہت دُور تھا اور آمد و رفت سہولت پیدا کرنے والے ذرائع موجود نہ تھے۔ حوصلہ مند تاجروں اور مہم جو آبادکاروں کے سوا کوئی اور شخص سندھ تک کے بری اور بحری راستوں پر سفر کرنے کے خطرات مول لینے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ چوتھی صدی

ہجری میں بھی نامور جغرافیہ دان المقدسی نے ان مشکلات کا شکوہ کیا ہے جو سندھ کا سفر کرنے والے شخص کو پیش آتی تھیں۔(۴۹)

تیسری صدی ہجری کے آخر نصف میں ملتان اور منصورہ میں دو خود مختار عرب ریاستوں کے قیام سے سندھ میں اچھی حکومت کا ایک دور شروع ہوا۔ سندھ پر عربوں کا اقتدار تین صدیوں تک قائم رہا اور اس طویل دور میں عربوں کی ان آزاد حکومتوں کا زمانہ تاریخ میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ملک میں امن اور خوشحالی کا دور دورہ تھا جس کا ثبوت ان سیاحوں کے بیانات سے ملتا ہے جو وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے۔(۵۰) چنانچہ اس زمانے میں مطالعۂ حدیث کو جو کچھ فروغ حاصل ہوا، وہ بنیادی طور پر اس داخلی امن کی بدولت ہوا جو ان حکومتوں نے قائم کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں سندھی طلباء میں یہ جذبہ بہت نمایاں تھا کہ دوسرے ملکوں میں جا کے علمِ حدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی جائے۔ السمعانی (م ۵۶۲ھ) نے بیان کیا ہے کہ شافعی عالم ابوعثمان الصابونی (۳۷۳-۴۴۹ھ) سے حدیث کا درس لینے کے لیے بلادِ ہند کے طلباء نیشاپور گئے تھے۔(۵۱) دیبل، منصورہ اور قصدار کے شوقین طلباء کی ایک جماعت نے تحصیل علمِ حدیث کے لیے عرب، شام، عراق اور مصر کے دور دراز سفر کیے تھے۔ چوتھی صدی ہجری تک مطالعۂ حدیث کے لیے ایک حلقہ قائم ہو گیا تھا اور سندھ میں احادیث کی زبانی اشاعت کو فروغ ہو رہا تھا۔(۵۲) دیبل اور بغداد(۵۳) اور منصورہ اور خراسان کے مابین محدثین کا تبادلہ بھی عمل میں آیا تھا۔(۵۴) سمعانی کی انتھک محنت کی بدولت ہمیں اس کی کتاب الانساب میں ان سندھی طلباء کی فہرست مل جاتی ہے جو اسلامی ممالک میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

(۱) دیبل میں حدیث کی تعلیم واشاعت:

دیبل ایک مشہور بندرگاہ تھا جو عربوں کے عہدِ حکومت میں موجودہ ٹھٹھہ اور کراچی کے درمیان واقع تھا۔(۵۵) اس بندرگاہ کے ذریعہ بحری راستے سے بیرونی ملکوں سے بڑے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ اسلامی دور میں اس کی اہمیت کا آغاز محمد بن قاسم (۹۳ تا ۹۶ھ/۷۱۱ تا ۷۱۴ء) کی فتحِ سندھ سے ہوا، جنہوں نے اس شہر میں ایک مسجد تعمیر کروائی تھی اور چار ہزار عربوں کو آباد کیا تھا۔

رفتہ رفتہ دیبل میں عربوں کی آبادی بہت زیادہ ہوگئی۔ اس شہر کا رقبہ کافی وسیع تھا۔ اور اس کی آبادی کا اندازہ ایک زلزلے میں ہلاک ہونے والوں کی کثیر تعداد سے ہو سکتا ہے جو المعتضد (۲۷۹ تا ۲۸۹ھ / ۸۹۲ تا ۹۰۲ء) کے عہدِ خلافت میں سنہ ۲۸۰ھ / ۸۹۳ء میں آیا تھا۔ اس زلزلے میں ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کے ہلاک ہو جانے کا تخمینہ کیا گیا تھا۔ عربوں کی آزاد حکومت کے دور میں دیبل ریاستِ منصورہ کی بندرگاہ تھا اور ایک سو گاؤں اس سے ملحق تھے۔

عربوں کی تجارتی اور انتظامی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری تھی۔ دیبل کے محلِ وقوع اس مقصد کے لیے اس اعتبار سے بہت موزوں تھا کہ بحری راستوں کے ذریعے یہ اسلامی ممالک سے مربوط تھا اور ان ملکوں سے باہمت علماء یہاں آتے رہتے تھے۔ مقامی درس گاہیں مسجدوں میں قائم کی گئی تھیں اور ان میں دینی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اگرچہ تیسری صدی ہجری سے عربوں کی ثقافتی سرگرمیوں میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی تھی۔ تاہم دیبل میں علمِ حدیث کے مطالعہ سے دل چسپی شروع ہو چکی تھی اور متعدد راویانِ حدیث پیدا ہو گئے تھے۔ (۶۲) جن کا مختصر حال ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

محدثینِ دیبل

۱۔ ابوجعفر دیبلی (م ۳۲۲ھ / ۹۳۴ء):

دیبل کے پہلے عالم جو حدیث کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک گئے، محمد بن ابراہیم بن عبداللہ دیبلی تھے، جن کا لقب ابوجعفر ہے۔ اُنھوں نے مکہ معظمہ کا سفر کیا اور وہاں کے چند مشہور محدثین سے درس لیا۔ ان کے مکہ پہنچنے کی تاریخوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تیسری صدی ہجری کی چوتھی دہائی تک یہ تمام شیوخ فوت ہو گئے تھے، اس سے یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے پہلے ہی مکہ چلے گئے تھے۔

حدیث کے علاوہ ابوجعفر نے ابن عیینہ کی کتاب التفسیر (۶۳) کا درس بھی ان کے شاگرد عبدالرحمٰن المخزومی (۲۴۹ھ) اور ابن المبارک کی کتاب البر والصلہ کا درس ان کے شاگرد حسین المروزی (م ۲۴۲ء) سے لیا۔ (۶۴) اُنھوں نے مکہ کے ایک محدث محمد بن زنبور، عبدالرحمٰن بن صبیح اور

دوسرے محدثین سے احادیث روایت کی ہیں۔

ابوجعفر علمِ حدیث پر پورا عبور حاصل کر کے محدث بنے۔ وہ وطن واپس نہیں آئے بلکہ مکہ میں قیام کر کے علمِ حدیث کی خدمت کرتے رہے۔ ابوالحسن احمد بن ابراہیم بن فراس مکی، ابوالحسین محمد بن محمد الحجاج (م ۳۶۸ھ) اور محمد بن ابراہیم المقری (م ۳۸۱ھ) نے ابوجعفر سے احادیث روایت کی ہیں۔ ابوجعفر نے جمادی الاوّل ۳۲۲ھ/اپریل ۹۳۴ء میں مکہ میں وفات پائی۔(۶۵)

۲۔ ابراہیم بن محمد دیبلی (م ۳۴۵ھ/۹۵۶ء):

ابراہیم بن محمد، ابوجعفر کے لڑکے تھے۔ وہ راویِ حدیث تھے۔ اُنہوں نے بغداد کے ایک حافظ موسیٰ بن ہارون البزاز(۶۶) (م ۲۹۴ھ) اور مکہ کے ایک محدث محمد بن علی الصائغ (م ۲۹۱ھ) سے حدیثیں روایت(۶۷) کی ہیں۔

۳۔ احمد بن عبداللہ دیبلی (م ۳۴۳ھ/۹۵۴ء):

احمد بن عبداللہ، ابوجعفر کے شاگردِ رشید تھے۔ وہ چوتھی صدی ہجری کے ایک محدث تھے اور دور دور تک سفر کیے تھے۔(۶۸) ماوراء النہر سے لے کر وادیِ نیل تک پورے مشرقِ وسطیٰ کا تنہا سفر کر کے اُنہوں نے ممتاز محدثین سے احادیث سماعت کیں۔ جو معلومات حاصل ہوئیں ہیں، ان سے احمد بن عبداللہ کے صحیح حالاتِ سفر کا علم نہیں ہوتا۔ غالبًا تیسری صدی ہجری کے اوّل نصف میں علمِ حدیث کی تحصیل کے لیے سفر پر نکلے۔ اور مکہ میں اپنے ہم وطن محدث ابوجعفر دیبلی (م ۳۲۲ھ) کے ساتھ مطالعۂ حدیث کیا جو ایک محدث کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ اور معقل بن محمد الجنادی(۶۹) (م ۳۰۸ھ) کے ساتھ بھی مطالعۂ حدیث کیا۔ معقل، شیبی (م ۳۰۸ھ) کی اولاد میں تھے۔(۷۰) مصر میں اُنہوں نے علی بن عبدالرحمٰن اور محمد بن ریان سے، دمشق میں حافظ احمد بن عمیر بن حوسا (م ۳۲۰ھ) سے، بیروت میں ابوعبدالرحمٰن مکحولہ سے، حران میں حافظ حسین بن ابی معشر (م ۳۱۸ھ) سے، بغداد میں جعفر بن محمد الفاریابی (م ۳۰۵ھ) سے، بصرہ میں ابوحنیفہ القاضی (م ۳۰۵ھ) سے، عسکر مکرم میں عبدان بن احمد الجوالقی (۲۱۰ تا ۳۰۶ھ) سے، تستر (م ۳۱۱ھ) میں احمد بن زہیر التستری (م ۳۱۲ھ) سے اور نیشاپور میں محمد بن اسحاق بن خزیمہ (م ۳۱۱ھ) سے احادیث سماعت کیں۔ اور ان

کے علاوہ بھی اُنہوں نے دوسرے کئی ہم عصر محدثین سے حدیثیں سنیں۔

سنہ ۳۱۱ھ / ۹۲۳ء میں خُزیمہ کی وفات سے قبل احمد بن عبداللہ نیشاپور پہنچ گئے تھے جہاں کی ثقافتی اور مذہبی زندگی اور بالخصوص حسن بن یعقوب الحداد (م ۳۳۶ھ) کی خانقاہ جہاں صوفیوں اور زاہدوں کا ہجوم رہا کرتا تھا، اُنہیں بہت پسند آئی۔ (۷۱) نیشاپور پہنچ کر اُنہوں نے جہاں گردی ختم کر دی اور خانقاہ میں شریک ہو گئے۔ تارکِ دُنیا زاہد بن گئے۔ عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے اور روکھی سوکھی غذا کھاتے۔ تاہم اُنہوں نے علمِ حدیث کی اشاعت جاری رکھی۔ حاکم نیشاپوری (۳۲۱ھ تا ۴۰۵ھ) نے کم عمری میں ان سے درسِ حدیث لیا تھا۔ (۷۲)

احمد بن عبداللہ نے ۳۴۳ھ / ۹۵۴ء میں نیشاپور میں وفات پائی اور قبرستان الحیرَہ میں مدفون ہوئے۔ وہ صوف پہنتے اور برہنہ پا رہتے تھے۔ (۷۳)

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اتنے قدیم زمانے میں بھی ایک ہندی عالم نے علمِ حدیث کی تحصیل کے لیے نیشاپور، بغداد، دمشق، بیروت اور مصر جیسے دور دراز مقامات کا سفر کرکے وہاں کے خزانوں سے اپنا دامن بھر لیا۔

۴۔ محمد بن محمد بن عبداللہ دیبلی (م ۳۴۶ھ):

احمد بن عبداللہ کے ہم وطن اور ہم مُلک محمد دیبلی نے بھی علمِ حدیث کی تحصیل کے لیے کافی سفر کیا۔ اگرچہ اتنا نہیں جتنا کہ احمد نے کیا تھا۔ محمد دیبلی نے بصرہ کے ابوخلیفہ القاضی (م ۳۰۵ھ)۔ بغداد کے جعفر بن محمد الفاریابی (م ۳۰۱ھ) عسکر مکرم کے عبدان بن احمد (۲۱۰ تا ۳۰۶ھ) فاریاب کے محمد بن الحسن (۷۴) اور دوسرے محدثین سے حدیث کا درس لیا۔ وہ دراق حدیث تھے۔ حاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ) کے استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ محمد دیبلی نے سنہ ۳۴۶ھ / ۹۵۷ء میں وفات پائی۔ (۷۵)

۵۔ حسن بن محمد بن اسد دیبلی (م ۳۵۰ھ / ۹۶۱ء):

حسن دیبلی، ابویعلیٰ موصلی (م ۳۰۷ھ) کے شاگرد تھے۔ اُنہوں نے ۳۴۰ھ / ۹۵۱ء میں دمشق میں احادیث کی اشاعت کی۔ ان کا سلسلۂ اسناد ایک صحابی جابر بن عبداللہ (م ۷۸ھ) تک جاتا

ہے۔تمام نے حسن دیبلی سے درسِ حدیث لیا تھا۔(۷۶)

۶۔خلف بن محمد دیبلی (۳۶۰ھ):

خلف نے اپنے ہی شہر دیبل میں علی بن موسےٰ دیبلی سے علمِ حدیث کی تعلیم حاصل کی۔(۷۷) وہ بغداد چلے گئے تھے اور وہاں حدیث کا درس دیتے تھے۔ بغداد کے ابوالحسین بن الجندی (۳۰۶ تا ۳۹۶ھ) اور احمد بن عمیر نے خلف بن محمد سے حدیث کا درس لیا تھا۔(۷۸)

۷۔احمد بن محمد بن ہارون دیبلی (۲۷۵-۳۷۰ھ):

احمد بن محمد جن کا لقب ابوبکر تھا، ۲۷۵ھ/۸۸۸ء میں دیبل میں پیدا ہوئے تھے۔ہجرت کر کے رے چلے گئے اور الرازی کے نام سے معروف ہوئے۔اس کے بعد اُنہوں نے حربیہ میں جو بغداد کا نواحی علاقہ تھا، مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اور اسی نسبت سے وہ الحربی کہے جانے لگے۔(۷۹)

بغداد میں ابوبکر نے جعفر بن محمد الفاریابی (م۳۰۱ھ) اور احمد بن شریک الکوفی سے حدیث کا درس لیا۔راوی حدیث ہونے کے علاوہ ابوبکر فنِ قرأت سے بھی بخوبی واقف تھے۔ احمد بن علی البادا (م۴۲۰ھ) ابوعلی بن دوما النعالی (۳۴۶ تا ۴۳۱ھ)(۸۰) اور قاضی ابوالعلاء واسطی (م ۴۳۱ھ) ان کے شاگرد تھے۔ابوبکر نے ۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں وفات پائی۔(۸۱)

۸۔حسن بن حامد دیبلی (م۴۰۷ھ):

حسن بن حامد بھی دیبل کے باشندہ تھے۔اپنے ہم وطن محدثوں کے برعکس اُنہوں نے بحیثیت تاجر بیرونِ ملک سفر کیا اور بغداد میں سکونت اختیار کر لی۔تجارت سے اُنہوں نے کثیر دولت پیدا کی اور بغداد کے ممتاز شہریوں میں شمار کیے جانے لگے،جس کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ مشہور شاعر المتنبی (م۳۵۴ھ) جب بغداد گیا تو حسن کا مہمان ہوا۔حسن میں ایک عالم اور ایک کامیاب تاجر کے اوصاف یکجا دیکھ کر متنبی کافی متاثر ہوا، اور کہنے لگا کہ اگر میں کسی تاجر کی مدح کرتا تو یقیناً وہ تم ہی ہوتے۔(۸۲) حسن انسان دوست تھے اور اُنہوں نے درب الزعفرانی، بغداد میں غربا کے لیے ایک خان یا محتاج خانہ تعمیر کیا تھا جو خان ابن حامد کہا جاتا تھا۔(۸۳) تجارت کے ساتھ ساتھ

وہ ثقافتی سرگرمیوں میں بھی مصروف رہے۔ علمِ حدیث اُنہوں نے علی بن محمد بن سعید الموصلی (م ۳۵۹ھ)(۸۴)، دعلج (م ۳۵۱ھ)، محمد النقاش (م ۳۵۱ھ) اور ابوعلی التمری (م ۳۶۰ھ) سے حاصل کیا۔ حدیث سے ان کو اس قدر دلی انس تھا کہ حدیث روایت کرتے ہوئے اشک بار ہو جاتے تھے۔(۸۵) علمِ حدیث میں ان کی قابلیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ اس کا درس دینے کے لیے مصر اور دمشق گئے تھے۔ حسن شاعر اور ادیب بھی تھے۔ اُنہوں نے ۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء میں مصر میں وفات پائی۔(۸۶)

۹۔ ابوالقاسم شعیب بن محمد بن احمد دیبلی (م ۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء):

ابوالقاسم، ابوقطعان کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ وہ مصر چلے گئے تھے اور وہاں ایک حلقہ قائم کر لیا تھا، جس میں حدیث کا درس دیتے تھے۔ ابوسعید بن یونس ابوقطعان کے شاگرد تھے۔(۸۷)

(۲) منصورہ میں حدیث کی تعلیم و اشاعت:

سندھ کے شہر حیدرآباد کے شمال مشرق میں ۴۷ میل کے فاصلے پر دریائے سندھ کے قدیم راستے کے قریب ایک بڑا ٹیلہ ہے جو بمبھر کا تھل کہلاتا ہے۔ یہ ٹیلہ سندھ کے قدیم شہر منصورہ کے کھنڈروں کی نشان دہی کرتا ہے۔(۸۸) بلاذری کے بیان کے مطابق محمد بن قاسم فاتحِ سندھ کے لڑکے عمرو نے ۱۱۰ھ/۷۲۸ء اور ۱۲۰ھ/۷۲۸ء اور ۱۲۰ھ/۷۳۸ء(۸۹) کے درمیان شہر منصورہ آباد کیا تھا۔(۹۰) سنہ ۲۷۰ھ/۸۸۳ء میں جب زیریں سندھ میں ایک خودمختار عرب ریاست قائم ہو گئی تو منصورہ برابر ترقی کرتا گیا۔(۹۱) اور سنہ ۳۴۰ھ/۹۵۱ء میں جب اصطخری(۹۲) یہاں آیا تھا تو منصورہ ایک خوش حال شہر بن چکا تھا، جس کا رقبہ چار مربع میل تھا اور جہاں مسلمان آباد تھے۔(۹۳) ابنِ حوقل کا بھی یہی بیان ہے۔(۹۴) اور المقدسی نے جو ۳۷۵ھ/۹۸۵ء میں منصورہ آیا تھا، یہ لکھا ہے کہ المنصورہ سندھ کا شہر ہے جو دمشق سے بڑی مشابہت رکھتا ہے۔ عمارتیں شیشم کی لکڑی اور چونے سے تعمیر کی گئی ہیں۔ بڑے بازار میں جامع مسجد ہے جو اینٹ اور پتھر سے بنائی گئی ہے اور اس کی چھت عمان کی مسجد کی طرح ساگوان کی ہے۔ شہر کے چار دروازے تھے جو باب البحر، باب طوران، باب

سندان اور باب ملتان کہے جاتے تھے۔(۹۵)

منصورہ کی مذہبی اور عملی زندگی کے بارے میں المقدسی نے لکھا ہے کہ یہاں کے لوگ عموماً ذہین اور پرہیزگار ہیں، اور ملاؤں کا کوئی عمل دخل نہیں۔ ذمی آزادی کے ساتھ اپنے دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ اسلام کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔لوگ اسلامی احکام پر سختی سے عمل کرتے ہیں، مسلمانوں کی اکثریت اصحابِ حدیث پر مشتمل ہے جو ظاہری امام داؤد الاصبہانی (م ۲۷۰ھ) کے پیرو ہیں۔ مقامی بستیوں میں حنفی فقہاء بھی ہیں، لیکن مالکی، حنبلی یا معتزلی نظر نہیں آتے۔ یہاں اسلام اپنی اصل شان اور فطری سادگی میں موجود ہے، اور ہر جگہ نیکی اور پرہیزگاری کا دور دورہ ہے۔(۹۶)

منصورہ میں علم اور عالم کی بہت قدر کی جاتی تھی۔(۹۷) چوں کہ آبادی کی اکثریت اصحابِ حدیث کی تھی، اس لیے قدرتی طور پر علمِ حدیث کو بہت فروغ ہوا۔ یہاں کے محدث اپنے علم کی اشاعت میں منہمک رہتے تھے۔ شہر کی مختلف مسجدوں میں حدیث کا درس دیا جاتا تھا۔ علماءِ علمِ حدیث سے متعلق کتابیں مرتب کرتے تھے۔ بطور مثال قاضی ابوالعباس المنصوری کا نام محدث و مرتب کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا تھا۔

محدثینِ منصورہ

ا۔ احمد بن محمد بن صالح منصوری:

احمد بن محمد معروف بہ ابوالعباس منصوری نے فارس میں ابوالعباس بن الاثرم (م ۳۳۶ھ) سے اور بصرہ میں احمد الخرانی (۹۸) (م ۳۴۲ھ) سے جو ابوروق کے نام سے معروف ہیں حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ مغربی ارجان کے قاضی بنائے گئے۔(۹۹) جو فارس کے مغربی علاقہ میں ہے۔(۱۰۰) ۳۰۶ھ/۹۷۰ء میں جب وہ بخارا گئے تو حاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ) نے ان سے حدیث کا درس لیا تھا۔ اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک احمد منصوری ایک محدث کی حیثیت سے کافی مشہور ہو چکے تھے۔ حاکم کا یہ بیان ہے کہ وہ جن علماء سے مل چکے ہیں، ان میں منصوری سب سے زیادہ ذہین تھے۔(۱۰۱) چوتھی صدی ہجری کی آٹھویں دہائی میں جب المقدسی منصورہ آیا تھا تو اس نے منصوری کو اپنے قائم کردہ حلقہ (۱۰۲) میں حدیث کا درس دیتے ہوئے دیکھا تھا۔(۱۰۳) منصوری

ظاہری فرقہ کے ایک ممتاز عالم اور مصنف تھے اور اُنہوں نے کئی ضخیم علمی کتابیں مرتب کیں(۱۰۴) جن میں سے کتاب المصباح الکبیر، کتاب الهادی اور کتاب النیر کا تذکرہ ابنِ ندیم نے اپنی الفہرست میں کیا ہے۔(۱۰۵) ان کو ظاہری فرقہ کے امام کا مرتبہ حاصل تھا۔ تاہم ان پر حدیثیں وضع کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے جو غالباً اُنہوں نے اپنے عقائد کو تقویت دینے کے لیے گھڑ لی تھیں۔(۱۰۷)

۲۔ احمد بن محمد منصوری (م ۳۸۰ھ):

احمد بن محمد منصورہ کے ایک اور محدث تھے جنہوں نے فارس اور بصرہ میں ابوالعباس بن الاثر (م ۳۳۶ھ) اور دوسرے محدثین سے حدیث کا درس لیا تھا۔ یہ بھی ظاہری فرقہ کے ایک امام اور حاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ) کے استاد تھے۔ احمد بن محمد کا زمانۂ حیات چوتھی صدی ہجری ہے۔

۳۔ عبداللہ بن جعفر بن مرہ منصوری (م ۳۹۰ھ):

منصورہ کے دوسرے دو محدثوں کی طرح عبداللہ بن جعفر بھی حسن بن المکرّم کے شاگرد تھے۔ وہ حاکم نیشاپوری کے استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ یقیناً چوتھی صدی ہجری کے ایک محدث تھے۔ یہ سیاہ فام تھے(۱۰۸) جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی نژاد تھے۔(۱۰۹)

(۴) قصدار(۱۱۰) میں حدیث کی تعلیم و اشاعت:

قصدار میں جو اب خضدار کہلاتا ہے اور بلوچستان کے علاقے قلات میں واقع ہے، ایک صحابی سنان بن سلمان الہذلی کا مزار ہے جو معاویہ کے عہدِ خلافت میں آئے تھے اور میڈوں کے خلاف ایک فوج کی قیادت کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کبھی عرب اور کبھی میڈ قصدار(۱۱۱) پر قابض ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ محمد بن قاسم نے اس کو خلافت کے مشرقی حصہ میں شامل کر لیا۔(۱۱۲)

عربوں کے عہدِ حکومت میں قصدار کو طوران کا مستقر بنایا گیا۔(۱۱۳) یہ علاقہ موجودہ بلوچستان کے جنوبی حصہ پر مشتمل تھا۔(۱۱۴) چوتھی صدی ہجری کے وسط میں یہاں ایک خودمختار عرب سردار مُعین بن احمد نے حکومت قائم کر لی اور عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔(۱۱۵)

قصدار خارجیوں کا ایک مستحکم مرکز تھا اور سلطان سبکتگین (۳۶۶ تا ۳۸۷ھ/۹۷۶ تا ۹۹۸ء) نے ۳۷۵ھ/۹۸۵ء اور ۳۸۶ھ/۹۹۶ء کے درمیان کسی وقت قصدار پر قبضہ کر لیا تھا۔(۱۱۶)

قصدار ایک تجارتی شہر تھا۔ اور کرمان، فارس اور خراسان سے بڑی راستہ سے ہند کی جو تجارت ہوتی تھی، اس کے لیے یہ بڑا اہم مرکز تھا۔ چنانچہ قصدار میں ان ملکوں کے تاجر اور ہندی تاجر سب ہی آباد ہو گئے تھے۔ اور شہر کے تجارتی علاقے میں اپنے مکان بنوائے تھے۔ یہاں مسلمانوں کے لیے ایک مسجد بھی موجود تھی۔(۱۱۷)

اس امر کی براہِ راست کوئی شہادت موجود نہیں کہ قصدار میں عربوں نے ثقافتی ترقی کے کام کیے تھے۔ اور دینی علوم یعنی قرآن و حدیث کی اشاعت کرتے تھے۔ اس زمانے میں قصدار اور سندھ کے مختلف مقامات میں دینی علوم کی اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ، جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے، یہ تھی کہ اس ملک پر عربوں کے قبضے کی شروع صدیوں میں یہاں مضبوط اور مستحکم حکومت قائم نہیں ہو سکی تھی۔ اس صورتِ حال کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ پانچویں صدی ہجری تک ہمیں قصدار کے صرف دو محدثوں کا حال معلوم ہوا ہے۔ چنانچہ صحیح طور پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قصدار میں حدیث کی تعلیم کا حال معلوم ہوا ہے۔ چنانچہ صحیح طور پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قصدار میں حدیث کی تعلیم کا آغاز چوتھی صدی ہجری میں عربوں کی خودمختار ریاست کے قیام سے ہوا۔

محدثینِ قصدار

۱۔ جعفر بن الخطاب قصداری (م ۴۵۰ھ):

جعفر معروف بہ ابومحمد قصدار کے باشندہ تھے اور بلخ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ فقیہہ بھی تھے اور صوفی بھی۔ اُنہوں نے عبدالصمد بن محمد العاصی سے حدیث کا درس لیا تھا۔ اور ثقہ راوی حدیث تھے۔(۱۱۸) ابوالفتح عبدالغافر کاشغری (م ۴۷۴ھ) نے جو حافظِ حدیث بھی تھے، جعفر سے احادیث روایت کی ہیں۔(۱۱۹) جعفر کا زمانۂ حیات پانچویں صدی ہجری کا ابتدائی حصہ تھا۔

۲۔ سیبویہ بن اسماعیل بن داؤد قصداری (۴۶۳ھ):

سیبویہ، العاصی ابوالقاسم علی بن محمد الحسینی، یحییٰ بن ابراہیم المخول اور رجاء بن عبدالواحد

اصفہانی کے شاگرد تھے۔ وہ ہجرت کر کے مکہ معظّمہ چلے گئے تھے اور وہاں حدیث کا درس دیتے تھے۔
حافظ الفقیان عمرو بن ابوالحسن الرواسی (م ۵۰۳ھ) نے جو صوبۂ جرجان (۱۲۰) کے مقام دہستان (۱۲۱) کے ایک محدث تھے، سیبؤیہ سے احادیث روایت کی ہیں۔ سیبویہ نے سنہ ۴۶۲ھ / ۱۰۷۰ء کے قریب وفات پائی۔ (۱۲۲)

مذکورۂ بالا حالات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں سندھ کے زیریں علاقے میں کئی مخلص وخوش عقیدہ محدثین کی محنت سے علمِ حدیث کی اشاعت ہو رہی تھی۔ اب اس امر پر بحث کی جائے گی کہ ملک میں ایک طوفان برپا ہو جانے کی وجہ سے علمِ حدیث کی تعلیم اچانک کس طرح بند ہو گئی۔

اسماعیلی قبضہ اور اس کے نتائج

چوتھی صدی ہجری کے دوسرے نصف میں ملتان اور منصورہ کی ریاستوں پر اسماعیلیوں کا غاصبانہ قبضہ ہو گیا۔ (۱۲۳) یہ محض سیاسی تبدیلی نہ تھی بلکہ سندھ میں سنیوں کی زندگی اور ان کے مذہب پر اس کے بہت دُور رس اثرات پڑے۔ اسماعیلی یہ تہیہ کیے ہوئے تھے کہ وہ ان ریاستوں میں نہ صرف سنیوں کی حکومت کو بلکہ ان کے مذہب اور ثقافت کو بھی تباہ کر دیں گے اور اس مقصد کے لیے اُنہوں نے کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی۔ اس ایک واقعہ سے کہ اسماعیلیوں نے ملتان کی جامع مسجد بند کر دی تھی۔ (۱۲۴) یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ سنی جن چیزوں کو عزیز رکھتے تھے، ان کو تباہ کر دینے میں اسماعیلی کس حد تک جا سکتے تھے۔ چنانچہ سنیوں کے وہ مذہبی ادارے جو ان کے عالموں اور حکمرانوں کی محنت و کوشش اور سرپرستی کے باعث قائم ہوئے اور بڑھے تھے، بالکل تباہ ہو گئے۔ اسماعیلیوں کے قبضے کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنی عربوں نے صدیوں کی حکومت کے دوران میں جو کچھ تعمیری کام سندھ میں کیے تھے، وہ سب برباد ہو گئے۔

ان حالات میں علمِ حدیث کو جو سنیوں کی فقہ کا سرچشمہ ہے، بہت نقصان پہنچا۔ اسماعیلیوں کے عہد میں سنی علماء کے لیے سندھ کی فضا سازگار نہیں رہی تھی۔ اور یہ بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یا تو محدثین کو ملک چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا گیا ہوگا۔ یا اُنہوں نے اپنی علمی سرگرمیوں کو جو

اُنہیں بہت عزیز تھیں، ملتوی کر دیا ہوگا۔

ایسے شدت پسندوں سے جنہوں نے سنی مسلمانوں کی جامع مسجد تک بند کروا دی تھی۔ یہ بات بھی غیر متوقع نہیں ہوسکتی کہ انہوں نے منصورہ اور دیبل کے علمی اداروں کو جو ملک میں اسلامی علوم و ثقافت کی ترقی و اشاعت کے لیے بہت کام کر رہے تھے، اپنے متشدد انتقام کا نشانہ بنایا ہو۔ ان تمام حالات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں سندھ میں علمِ حدیث کی تعلیم اچانک کیوں بند ہوگئی۔ یہ یقین کر لینا غلط نہ ہوگا کہ اسماعیلیوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرتے ہی، سنیوں کے مذہبی اداروں کو ختم کر دیا۔ اور اس قیاس کو اس واقعہ سے تقویت ہوتی ہے کہ اس کے بعد سندھ سے کوئی طالب علم بھی علمِ حدیث کی تحصیل کے لیے بیرونِ ملک نہیں گیا۔ اور اشاعتِ حدیث کے لیے منصورہ اور دیبل کے محدثین کی کوششیں منظر عام پر نہیں آئیں۔ علمِ حدیث کی تحصیل کے لیے اسلامی ممالک کے دور دراز سفر کرنے والے طلباء کے آخری گروہ کے افراد چوتھی صدی ہجری کے اختتام تک وفات پا گئے تھے۔ ان لوگوں کا تعلق سنیوں کے عہدِ حکومت سے تھا۔ اور اس کے بعد سندھ سے کوئی طالب علم تحصیلِ علمِ حدیث کے لیے بیرونِ ملک نہیں بھیجا گیا، اور نہ بھیجا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سنیوں کے دینی علوم اور ثقافتی سرگرمیوں کو جبراً روک دینے کی ذمہ دار یہ حکومت تھی۔ نامور فاتح سلطان محمود غزنوی (۳۸۸ تا ۴۲۱ھ/۹۹۸ تا ۱۰۳۰ء) سنی تھے اور وہ اسماعیلیوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے انہیں اس علاقے سے نکال دینے میں کامیاب ہوئے۔ مگر سندھ کی گزشتہ تہذیبی عظمت کو بحال کرنے سے قبل ہی ان کی فتوحات کا سلسلہ بند ہوگیا۔ اور وہ بڑے پیمانے پر اس گروہ کو ختم نہ کر سکے جو مقامی باشندوں میں بڑی شدت سے پروپیگنڈا کر رہا تھا اور جسے آخرکار ہندیوں اور عربوں کی مخلوط نسل کے ایک طاقتور قبیلے کو اپنا ہم عقیدہ بنانے میں کامیابی ہوئی۔ یہ قبیلہ تاریخ میں سمرا کے نام سے مشہور ہوا۔ ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء میں سمراؤں نے سلطان محمود کے کمزور جانشینوں سے زیریں سندھ کا علاقہ چھین لیا اور وہاں اپنی حکومت قائم کر دی۔ اس طرح اسماعیلیوں نے کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کر لیا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس یہ اقتدار ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء تک رہا۔ جب سمراؤں نے ان کو شکست دے کر حکومت غصب کر لی۔ اگرچہ اس دوران میں سلطان معز الدین محمد غوری (۵۷۰ھ تا

۶۰۲ھ/ ۱۱۷۴ تا ۱۲۰۵ء) نے یہ علاقہ فتح کر لیا اور سلطان کا نائب ناصر الدین قباچہ اس پر حکومت کرنے لگا تاہم اس پر سلطنتِ دہلی کا موثر اقتدار قائم نہ ہوسکا اور حقیقی اقتدار اب بھی سمراؤں کے ہاتھ رہا۔ چوتھی صدی ہجری کے دوسرے نصف حصہ میں اس حصہ پر اسماعیلیوں کی حکومت کے قیام سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے وسط تک زیریں سندھ میں اسماعیلیوں کا اثر کسی نہ کسی شکل میں مسلسل باقی رہا۔ سندھ پر سنی عربوں کی حکومت ختم ہو جانے کے بعد جو حالات رونما ہوئے ان میں عرب ممالک اور بالخصوص حجاز میں واقع علمِ حدیث کا احیاء کرنے میں بھی تاخیر ہوگئی اور نویں صدی ہجری میں دکن میں بہمنی سلطنت اور گجرات میں مظفر شاہی سلطنت کے قیام کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا۔ اس دوران میں علمِ حدیث کی مدھم سی روشنی شمالی ہند میں نظر آنے لگی جہاں مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ہی وسطِ ایشیاء کے علماء کی آمد شروع ہوگئی تھی۔

حواشی:

(۱) نکلسن Nicholson: A Literary History of the Arabs، کیمبرج، ۱۹۲۸ء، ص ۴، ۵، اقتباس از مُلر Muller: Der Islam in Morgen und Abendland، ج ۱، ص ۴۴ و مابعد، سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات، الٰہ آباد، ۱۹۳۶ء، ص ۲۹۔

(۲) موجمدار، کتابِ مذکور، ص ۴۵۔

(۳) بلاذری، ص ۴۳۷، مرگوٹن، ص ۲۱۸۔

(۴) ندوی، کتابِ مذکور، ص ۳۰۴ و مابعد، ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۴۶۸۔

(۵) آرنلڈ Arnold: The Preaching of Islam، لندن، ۱۹۳۵ء، ص ۲۳۷، ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۴۶۷۔

(۶) چچ نامہ، ص ۱۹۲۔

(۷) سلیمان ندوی، کتابِ مذکور، ص ۳۰۰ و مابعد۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۴۶۵۔

(۸) چچ نامہ، ص ۷۸۔

(۹) ایضاً، ص ۷۹۔

(۱۰) ایضاً، ص ۸۷-۱۸۶۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۱۳۴-۲۰۲۔

(۱۱) ایلیٹ، ہسٹری، ص ۱۳۲۔

(۱۲) بلاذری، فتوح، ص ۴۴۲۔ مرگالن، ص ۲۲۵، ابنِ اثیر، تاریخ، ج ۴، ص ۲۸۲۔

(۱۳) ذہبی، تجرید، ج ۲، ص ۱۷۵۔

(۱۴) ایضاً، ج ۱، ۲۷۳۔

(۱۵) ایضاً، ص ۷۵۔

(۱۶) عسقلانی، تہذیب، ج ۱۱، ص ۵۵-۲۵۴۔ ابنِ حجر عسقلانی، تقریب التہذیب، نول کشور پریس، لکھنؤ، ص ۳۹۹۔

(۱۷) صفی الدین، خلاصہ، ۲، ۳، الجامع الصحیح، مطبوعہ مصر: کتاب الجہاد، ص ۱۱۱۔

(۱۸) عسقلانی، تہذیب، حوالۂ مذکور۔

(۱۹) ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۴۴۰۔

(۲۰) ان کے ناموں کے لیے ملاحظہ ہو، ابنِ اثیر، تاریخ، ج ۵، ص ۴۱۔

(۲۱) بلاذری، فتوح، ۴۴۱: مرگاٹن، ص ۲۲۶۔

(۲۲) ایضاً، ص ۴۳۴: مرگاٹن، ص ۲۱۳۔

(۲۳) ایضاً، کتاب مذکور، ابنِ اثیر، کتاب مذکور۔

(۲۴) ان سے مروی احادیث سنن ابی داوٗد اور نسائی میں شامل ہیں۔ (صفی الدین) خلاصہ، ص ۳۳۰۔

(۲۵) ذہبی، تجرید، ج ۲، ص ۱۱۶۔

(۲۶) عسقلانی، تہذیب، ج ۱۰، ص ۳۶۲۔

(۲۷) ایضاً، عسقلانی، تقریب، ص ۳۶۲۔

(۲۸) ذہبی، میزان، ج ۱، ص ۹۷، عسقلانی، تہذیب، ج ۱، ص ۲۶۱، نزیل السند۔

(۲۹) سمعانی، انساب، ۵۹۳ الف۔ عسقلانی، تہذیب، حوالۂ مذکور، عسقلانی، تقریب، ۳۶۲۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۱، تذکرہ اسرائیل بن موسیٰ۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۵۱۔

(۳۰) صفی الدین، خلاصہ، ص ۳۱۔

(۳۱) بلاذری، فتوح، ص ۴۰۰: مرگاٹن، ص ۱۵۲۔

(۳۲) ایضاً۔

(۳۳) ایضاً، ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۴۴۰۔ آرنلڈ، کتاب مذکور، ص ۲۷۲۔

(۳۴) عسقلانی، تہذیب، ج ۸، ص ۱۰۵۔

(۳۵) طبری، تاریخ، ج ۲، ص ۱۲۶۱۔

(۳۶) حاجی خلیفہ، کشف الظنون، مرتبہ فلوگل (Fluegel)، لندن، ۱۸۴۲ء، ج ۳، ص ۲۸۔

(۳۷) ربیع کے والد کا نام مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے۔ بلاذری، فتوح، ۳۶۹: مرگاٹن، ص ۹۶ اور یاقوت، معجم

البلدان، ج ۳، ص ۹۸-۳۹۷ میں صبح۔ تاراچند، کتاب مذکور، ص ۴۶ میں صاحب اور ابن خلدون، تاریخ، مطبوعہ مصر، ج ۳، ص ۲۰۰ میں ابراہیم لکھا ہے۔ صحیح نام کے لیے ملاحظہ ہو عسقلانی، تقریب، ص ۷۷۔ طاہر پٹنی، المغنی فی ضبط الرجال جو عسقلانی کی تقریب التہذیب کے حاشیہ پر ۱۲۹۰ھ میں دہلی سے چھپی ہے۔ ص ۳۳۔

(۳۸) ابوحفص، بقول ابن سعد طبقات، ج ۷، ح ا، ص ۳۶، جسے تاراچند نے غلط طور پر ابوحفص پڑھا۔

(۳۹) بربد، ایلیٹ، ہسٹری، ج ا، ص ۴۴۶ کے مطابق براد، گجرات میں بروچ کے قریب واقع تھا اور اب اسے بار بھوت کہا جاتا ہے۔ ندوی، کتاب مذکور، ص ۱۸۔

(۴۰) طبری، تاریخ، ج ۳، ص ۴۶۰، ۷۷-۴۷۶۔ ابنِ اثیر، تاریخ، ج ۵، ص ۱۹۔ ابنِ خلدون حوالۂ مذکور۔

(۴۱) ابن العماد، شذرات، ج ا، ص ۲۴۷۔

(۴۲) طبری، تاریخ، حوالۂ مذکور۔

(۴۳) ابنِ سعد، طبقات، ج ۷، ح ا، ص ۳۶۔

(۴۴) ابن عماد، شذرات، ج ا، ص ۲۴۷۔

(۴۵) عسقلانی، تہذیب، ج ۳، ص ۴۸-۲۴۷۔ ذہبی، میزان اور عسقلانی، لسان، تذکرہ الربیع بن صبیح، الربیع سے مروی احادیث التعلیقات البخاری، سنن ابوداؤد اور ابن ماجہ میں درج ہیں۔ صفی الدین خلاصہ ص ۹۸۔

(۴۶) حاجی خلیفہ، کتاب مذکور، ص ۸۰-۸۱۔ ابنِ حجر عسقلانی، مقدمات الفتح، قاہرہ، ۱۳۴۷ء، ج ا، ص ۴۔ تحریر الدمشقی، توجیہہ النظر، قاہرہ، ۱۹۱۰ء، ص ۸-۷۔ الخولی، مفتاح السنۃ، قاہرہ، ۱۹۲۱ء، ص ۲۱، ان کے مختصر حالات آزاد بلگرامی کی سبحۃ المرجان، بمبئی، ۱۳۰۳ء، ابوحکیم عبدالحی حسنی کی نزہۃ الخواطر، ج ا، تذکرہ الربیع بن صبیح اور یادِ ایام، لکھنؤ، ص ۵-۶ میں درج ہیں۔ موخر الذکر میں مصنف نے الربیع کو تابعی قرار دیا ہے اور اس کے حوالے بکثرت دیے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو، معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۵۱۔

(۴۷) رے Dynastic History of Northern India: H.C. Rey، کلکتہ، ۱۹۳۱ء، ج ا، ص ۱۱، ۱۳۔

(۴۸) بلاذری، فتوح۔ ص ۴۴۲، ۴۴: مرگاٹن، ص ۲۶-۲۲۵، ۳۱-۲۳۰۔

(۴۹) بشاری المقدسی، احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم مرتبہ: ڈی گوئے، لائیڈن، ۱۹۰۶ء، ص ۴۷۴۔

(۵۰) ندوی، کتاب مذکور، ص ۳۰۹ و مابعد ۳۴۵۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ا، ص ۵۷-۴۵۴۔

(۵۱) سمعانی، انساب، و ۳۴۷ الف، ۳۴۷ ب۔

(۵۲) خطیب، تاریخ بغداد، ج ۸، ص ۳۳۳۔

(۵۳) ایضاً۔

(۵۴) ذہبی، میزان، ج ا، ص ۲۷۲۔

(۵۵) ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۳۷۴ و ما بعد، کننگھم، کتابِ مذکور، ص ۳۴۰ و مابعد۔ ریورٹی، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۹۲ء، ص ۳۱۷ و ما بعد، ہیگ Indus Delta Country :Haid، لندن، ۱۸۹۴، ص ۴۴ و مابعد، Gazetteer of the Province of Sind، بمبئی، ۱۹۱۹ء، بی، ج ۱، ص ۵۳، ندوی، کتابِ مذکور، ص ۹۲-۳۹۱۔

(۵۶) ندوی، حوالۂ مذکور۔

(۵۷) بلاذری، فتوح، ص ۴۳۷: مرگاٹن، ص ۲۱۸۔

(۵۸) ندوی، حوالۂ مذکور۔

(۵۹) موجد از، کتابِ مذکور، ص ۵۷۔

(۶۰) سیوطی، تاریخ الخلفاء، کلکتہ، ص ۳۸۰، ندوی، حوالۂ مذکور۔

(۶۱) مقدسی، کتاب الانساب، ص ۴۷۹۔ ندوی، حوالۂ مذکور۔

(۶۲) یاقوت، معجم البلدان، ج ۲، ص ۶۳۸۔

(۶۳) ابن الندیم، کتاب الفہرست، مصر، ۱۳۴۸ء، ص ۳۱۶۔

(۶۴) ایضاً، ص ۳۱۹۔

(۶۵) ابن المقری ایک بڑے محدث تھے۔ سمعانی، انساب، و ۲۹۶ ب، ۵۴۰ ب۔

(۶۶) خطیب، تاریخ بغداد، ج ۳، ص ۲۹۳۔ سمعانی، انساب، و ۲۳۷ الف، مقدسی، کتاب الانساب، تذکرۂ الدیبلی، یاقوت، معجم البلدان، ج ۲، ص ۶۳۸۔ عسقلانی، تہذیب، تذکرۂ محمد ابراہیم۔ ابن العماد، شذرات، ج ۲، ص ۲۹۵۔

(۶۷) سمعانی، انساب، و ۲۳۷ الف۔

(۶۸) من الغرباء الرحالة المتقدمین فی طلب العلم و من الزھاد الفقراء العباد سمعانی، حوالۂ مذکور۔

(۶۹) سمعانی، انساب، و ۳۸-۱۳۷۔

(۷۰) ایضاً، و ۱۳۸ الف۔

(۷۱) ایضاً، و ۱۵۸ الف۔

(۷۲) ایضاً، و ۲۳۷ الف۔

(۷۳) ایضاً۔

(۷۴) قرونِ وسطیٰ میں خراسان کے ضلع جزجان میں فاریاب ایک بہت اہم قصبہ تھا، لے اسٹرینج، ص ۴۲۵۔

(۷۵) سمعانی، انساب، ۲۳۷ الف۔

(۷۶) ابن عساکر، تاریخ الکبیر، دمشق ۱۳۳۲ء، ج ۴، ص ۵۶-۳۵۵۔

(۷۷) ایک حدیث جو خلل نے اپنے شیخ علی بن موسیٰ دیبلی سے دیبل میں سنی، اور جس کا سلسلۂ روایت انس تک جاتا ہے (خطیب، تاریخ بغداد، ص ۳۳۳) یہ ہے: کلام اہل السمٰوات لا حول ولا قوۃ۔

(۷۸) خطیب حوالہ مذکور۔

(۷۹) لے اسٹرینج، کتاب مذکور، ص ۵۱۔

(۸۰) النعانی، هذه النسبة الی النعال وبیعھما۔

(۸۱) خطیب، تاریخ، ج ۵، ص ۱۴-۱۱۳۔

(۸۲) ایضاً، لو کنت مادما تاجرا المدحتک۔

(۸۳) ایضاً، ج ۷، ص ۰۴-۳۰۳۔ ابنِ عساکر، تاریخ الکبیر، ج ۴، ص ۱۵۹۔

(۸۴) خطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۲، ص ۸۲۔

(۸۵) ایضاً، و کان یحدث ویبکی۔

(۸۶) ایضاً۔

(۸۷) سمعانی، حوالۂ مذکور، معارف، ج ۲۴، ش ۴، ص ۲۴۷۔

(۸۸) یہ دلچسپ مقام بمبئی سول سروس کے سابق رکن اے، الیف بیلاسس کے شوق اور محنت کی بدولت دریافت ہوا۔ وہاں جو سکے ملے وہ منصور بن جمہور، عبدالرحمٰن، محمد عبداللہ اور عمر کے ہیں۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۳۷۴۔ گنکھم، کتابِ مذکور، ص ۳۱۱۔

(۸۹) بلاذری، فتوح، ص ۴۴۴: مرگاٹن، ص ۲۲۹۔ ایلیٹ، گنکھم وغیرہ نے اسے غلط لکھا ہے، یعنی عمر العمرو۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۳۷۱۔ گنکھم، کتابِ مذکور، ص ۳۱۱۔

(۹۰) ندوی، کتابِ مذکور، ص ۳۳۵۔

(۹۱) ایضاً، ص ۴۲-۳۴۱۔

(۹۲) ایضاً، ص ۳۱۰۔

(۹۳) اصطخری، کتاب المسالک والممالک، ایلیٹ، ہسٹری، ج ۲، ص ۲۷۔

(۹۴) ندوی، کتاب مذکور، ص ۳۴۵، بحوالہ ابن حوقل۔

(۹۵) مقدسی، کتاب الانساب، ص ۴۷۹۔ ندوی، ص ۳۴۶۔

(۹۶) ایضاً۔

(۹۷) ایضاً۔

(۹۸) سمعانی، انساب، و ۵۴۴ الف۔ ذہبی، میزان، ج ۱، ص ۶۶۔ عسقلانی، لسان، ج ۱، ص ۲۷۲۔

(۹۹) عسقلانی، لسان، حوالہ مذکور۔

(۱۰۰) لے اسٹرینج، کتاب مذکور، ص ۲۶۸۔

(۱۰۱) و کان من ظرافته من رایت من العلماء، عسقلانی، لسان، حوالہ مذکور، غالباً طباعت کی غلطی سے ظراف کے بجائے ظرافتہ چھپ گیا ہے۔ سمعانی نے الحاکم کا حوالہ دیئے بغیر لکھا ہے: و کان اظرف من رایت من العلماء۔ اس بیان سے سید سلیمان ندوی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ منصور، سمعانی (م ۵۶۲ھ) کا ہم عصر تھا۔ معارف، ج ۲۴، ش ۴، ص ۲۴۷۔ راقم کی رائے میں یہ بیان الحاکم کا ہے، سمعانی کا نہیں۔ ملاحظہ ہو، عسقلانی، لسان، ج ۱، ص ۲۷۲ و سمعانی، انساب، و ۵۴۴ الف۔

(۱۰۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ المنصوری محدث تھا۔

(۱۰۳) مقدسی، کتاب الانساب، ص ۴۸۱۔

(۱۰۴) وله کتب جلیلة حسنته کبار۔ ابن ندیم، کتاب مذکور، ص ۳۰۶۔

(۱۰۵) ص ۳۰۶۔

(۱۰۶) مقدسی، حوالہ مذکور۔ سمعانی، حوالۂ مذکور۔

(۱۰۷) منصوری کی روایت کردہ گھڑی ہوئی حدیث کی ایک مثال یہ ہے اوّل من قاس ابلیس فلا تقیسوا۔ منصوری نے اس کی سند میں اپنے شیخ ایک مالکی فقیہ ابوورق کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن وہ ثقہ راوی تھے۔ اور حدیث گھڑنے والے خود منصور ہیں، ان کے شیخ نہیں۔ ملاحظہ ہو: عسقلانی، لسان، ج ۱، ص ۲۲۷، ۲۵۶۔

(۱۰۸) سمعانی، انساب و ۵۴۳ ب، ۵۴۴ الف۔

(۱۰۹) قصدار اور قزدار ایک ہی ہیں۔ یاقوت، معجم البلدان، ج ۴، ص ۸۶۔

(۱۱۰) بلاذری، فتوح، ص ۴۳۴: مرگاٹن، ص ۲۱۳۔

(۱۱۱) چچ نامہ۔

(۱۱۲) مقدسی، کتاب الانساب، ص ۴۷۸۔ ندوی، ص ۳۹۵۔ لے اسٹرینج، کتاب مذکور، ص ۳۱۳۔

(۱۱۳) موجمدار، کتاب مذکور، ص ۵۴، ۵۵۔

(۱۱۴) ابنِ حوقل، حوالہ از ندوی۔

(۱۱۵) ندوی، کتاب مذکور، ص ۳۹۵، فرشتہ، تاریخ کانپور، ۱۸۷۴ء، ج ۱، ص ۱۹۔

(۱۱۶) مقدسی، حوالۂ مذکور، یاقوت، معجم البلدان، ج ۴، ص ۱۰۵۔

(۱۱۷) ابوالفتوح عبدالغافر بن الحسن الکاشغرے کان حافظا مکثر اصدوقا، سمعانی، انساب و ۴۷۲ ب۔

(۱۱۸) ایضاً، و ۲۶۱ الف۔

(۱۱۹) ایضاً، ۴۵۶ الف۔

(۱۲۰) لے اسٹرینج، کتاب مذکور، ص ۳۷۹۔

(۱۲۱) سمعانی، انساب، و ۴۵۱ الف، ۴۵۲ ب۔

(۱۲۲) ندوی کتاب مذکور، ص ۳۱۳ و مابعد۔

(۱۲۳) البیرونی، کتاب الہند، مرتبہ سخاؤ، لندن، ۱۸۸۷ء، ص ۵۰۱۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ا، ص ۴۷۰۔ ندوی، کتاب مذکور، ص ۳۱۵۔

(۱۲۴) ندوی، کتاب مذکور، ص ۳۱۴۔ ۵۰-۳۴۹۔

(۱۲۵) ایلیٹ، ہسٹری، ج ا، ص ۴۸۴ و مابعد۔ ندوی، کتاب مذکور، ص ۳۵۸۔

(۱۲۶) ایلیٹ، ہسٹری، ج ا، ۴۹۴ و مابعد۔ ندوی، کتاب مذکور، ص ۳۷۴ و مابعد۔

(۱۲۷) ہیگ، کیمبرج، ہسٹری آف انڈیا، ج ۳، ص ۵۰۰۔

باب سوم

شمالی ہند

(۳۸۸ تا ۹۰۰ھ/ ۹۹۸ تا ۱۴۹۴ء)

فصل اوّل: غزنویوں کا دَور ــــ ۳۸۸ تا ۵۸۲ھ/ ۹۹۸ تا ۱۱۸۶ء

چوتھی صدی ہجری کے آخری حصہ میں مسلمان سلطان محمود غزنوی کے زیرِ قیادت شمالی ہند میں داخل ہو گئے۔(۱) اور سلطان نے پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ آئندہ دو صدیوں کے دوران میں خاندانِ غلاماں کے سلاطین نے مسلمانوں کی سلطنت کے حدود خلیج بنگال تک وسیع کر دیے۔(۲) مسلمانوں کی حیرت انگیز سیاسی فتوحات کے ساتھ ہی پورے شمالی ہند میں اسلام اور اسلامی علوم کی اشاعت ہونے لگی۔ فتوحات نے مسلمانوں کے لیے ہند کے دروازے کھول دیے تھے، ہمسایہ مسلم ممالک سے مسلمان علماء، اولیاء اور مبلغینِ اسلام بڑی تعداد میں ہند آنے لگے تھے، جن کی ذاتی محنت و کوشش اور اثرات سے اسلام اور اسلامی علوم کی خوب اشاعت ہوئی۔

شیخ محمد اسمٰعیل لاہوری (م ۴۴۸ھ/ ۱۰۵۶ء)

لاہور میں علمِ حدیث کی اشاعت کا آغاز ایک مشہور صوفی بزرگ شیخ محمد اسمٰعیل نے کیا جو بخارا سے آئے تھے۔ شیخ اسمٰعیل ۳۹۵ھ/ ۱۰۰۴ء میں ہند آئے اور لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ اور اسی نسبت سے لاہوری کہے جانے لگے۔ اس وقت تک مسلمانوں نے یہ شہر فتح نہیں کیا تھا۔(۳) شیخ اسماعیل حدیث و تفسیر کے متبحر عالم تھے اور ان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ شہر لاہور میں اسلام کی تبلیغ کرنے والے وہ پہلے مبلغ تھے۔ ان کا وعظ سننے کے لیے لوگ کثیر تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایسا کوئی غیر مسلم نہیں تھا جس نے شیخ اسمٰعیل سے ذاتی قرب حاصل ہونے کے بعد اسلام قبول نہ کر لیا ہو۔(۴) شیخ اسماعیل

نے ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء میں لاہور میں وفات پائی۔(۵)

شیخ اسماعیل نے سلطان محمود غزنوی کے عہد میں غزنوی سلطنت کو اپنے انتہائی عروج پر دیکھا اور پھر سلطان کے بعد اس کے نااہل جانشینوں کے عہد میں اس سلطنت کو زوال پذیر ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ لیکن اُنہوں نے سیاست میں کبھی دخل نہیں دیا۔ اور اسلام اور اسلامی علوم کی اشاعت و ترقی کے لیے نصف صدی سے زیادہ مدت تک شدید محنت کرتے رہے۔ ہمیں یہ علم نہیں کہ ان کے مریدوں نے جن کی تعداد غالباً بہت زیادہ ہوگی، اپنے مرشد کے عظیم مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے کیا خدمات انجام دیں، تاہم یہ معلوم ہے کہ وہ حدیث سے محبت وعقیدت کے پرجوش جذبہ سے سرشار تھے۔ چنانچہ لاہور علمِ حدیث کا ایک مرکز بن گیا اور آئندہ سو سال کے دوران میں یہاں کئی مشہور محدث ہوئے۔ چھٹی صدی ہجری میں ایک علمی و ثقافتی مرکز کی حیثیت سے لاہور کی شہرت ہند سے باہر دوسرے ملکوں میں بھی پھیل گئی، اور اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ سمعانی نے کتاب الانساب(٦) میں نسبہ الاّہوری کے ذیل میں ان محدثین کے نام لکھے ہیں، جنہوں نے لاہور میں زندگی بسر کی اور اس شہر سے نسبت رکھتے تھے۔

سیّد مرتضٰی کوفی (م ۵۸۹ھ/ ۱۱۹۳ء)

سیّد مرتضٰی کوفہ کے رہنے والے تھے۔ حدیث اور تفسیر کے عالم کی حیثیت سے ان کی شہرت سلطان شہاب الدین غوری (۵۷۰ تا ۶۰۲ھ/ ۱۱۷۵ تا ۱۲۰۶ء) کی توجہ کا باعث بنی اور سلطان نے ان کو اپنے درباریوں میں شامل کر لیا۔ سیّد مرتضٰی میں چونکہ سپاہیانہ اوصاف بھی فطری طور پر موجود تھے، اس لیے سلطان نے ان کو فوجی خدمت پر مامور کر دیا اور ترقی دے کر سپہ سالار بنا دیا۔ ۵۸۹ھ/ ۱۱۹۳ء(۷) میں فتح قنوج کے دوران میں سلطان شہاب الدین جب بنارس کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے، تو ظفر آباد کے مقام پر جو اتر پردیش کے ضلع جونپور میں واقع ہے۔ سیّد مرتضٰی کا مقابلہ ظفر آباد کے راجہ اودے پال سے ہوا، اور سیّد مرتضٰی لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔(۸)

محدثینِ لاہور

۱۔ ابوالحسن علی بن عمر لاہوری (م ۵۲۹ھ/ ۱۱۳۶ء)

ابوالحسن علی محدث بھی تھے اور شاعر و ادیب بھی۔ اُنہوں نے ابوالمظفر السعیدی حافظ سے تحصیلِ علم حدیث کیا اور ایک محدث کی حیثیت سے ان کی شہرت بغداد تک پہنچ گئی۔ چنانچہ ابوالفضل محمد بن نصیر السلمی البغدادی (۴۶۷ تا ۵۵۰ء)(۹) جو خود بھی حافظ تھے، ان سے احادیث سماعت کیں، اور پھر ان کو مشہور محدث السمعانی تک پہنچا دیا اور اس طرح السمعانی بھی ابوالحسن لاہور کے ایک شاگرد ہو گئے۔ ابوالحسن منکسر مزاج شخص تھے۔ انہوں نے ۵۲۹ھ/ ۱۱۳۴ء کو وفات پائی۔ (۱۰)

۲۔ ابوالفتوح عبدالصمد بن عبدالرحمٰن لاہوری (م ۵۵۰ھ/ ۱۱۵۸ء)

ابوالفتوح، ابوالحسن لاہوری کے شاگرد تھے، وہ سمرقند میں حدیث کا درس دیتے تھے اور وہاں اُنہوں نے السمعانی سے وہ احادیث سنیں جو خود اپنے استاد شیخ ابوالحسن سے سماعت کی تھیں۔ اُن کا زمانہ حیات چھٹی صدی ہجری کا پہلا نصف حصہ تھا۔ (۱۱)

۳۔ ابوالقاسم محمد بن خلف لاہوری (م ۵۴۰ھ/ ۱۱۴۸ء)

ابوالقاسم لاہور سے ہجرت کر کے اسفرائین چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اُنہوں نے فقہ اور حدیث کی تعلیم ابوالمظفر السمعانی سے حاصل کی تھی جو مشہور محدث السمعانی کے دادا تھے۔ (۱۲) ابوالقاسم نے اس زمانہ کے دوسرے محدثین سے بھی حدیث کا درس لیا۔ محدث ہونے کے علاوہ ابوالقاسم ایک مناظر کی حیثیت سے بھی مشہور ہو گئے تھے۔ السمعانی ان سے اسفرائین میں ملے تھے اور احادیث سماعت کی تھیں۔ ابوالقاسم کا انتقال ۵۴۰ھ/ ۱۱۴۸ء کے قریب ہوا۔ (۱۳)

فصل دوم: قدیم سلطنتِ دہلی

(۶۰۲ تا ۷۰۰ھ/ ۱۲۰۵ تا ۱۳۰۰ء)

غزنوی سلاطین کے عہد میں جو شافعی مسلک کے پیرو تھے، لاہور علمِ حدیث کا ایک مرکز بن گیا تھا اور چھٹی صدی ہجری کے آخر تک اپنی تابانیاں بکھیرتا رہا۔ (۱۴) لیکن ۶۰۲ھ/ ۱۲۰۵ء میں

جب سلطنتِ دہلی کی بنیاد پڑی تو ہند میں فقہ کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ دہلی کے سلاطین حنفی تھے، اس لیے قدرتی طور پر عراق، فارس، خراسان اور ماوراء النہر کے علمائے فقہ و معقولات (۱۵) کے لیے دہلی میں بڑی کشش تھی۔ چنگیز خاں کی غارت گری نے وسطی ایشیا میں امن و امان اور سیاسی نظام کو تہہ و بالا کر ڈالا تھا۔(۱۶) چنانچہ وہاں کے علماء نے ہند کا رُخ کیا جس کے علم دوست سلاطین علماء کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ملتان، لاہور، بھکر، ہانسی اور تھانیسر جیسے اہم شہروں میں علماء بڑی تعداد میں آباد ہو گئے، اور یہ شہر بلخ و بخارا کے ہم پلہ بن گئے، اس کے بعد علمی اور ثقافتی ترقی کا دائرہ مشرق کی طرف پھیلنے لگا اور دہلی کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی (۱۷) پھر ساتویں صدی ہجری کے وسط میں رفتہ رفتہ یہ دائرہ بنگال تک وسیع ہو گیا۔ سلاطین کی فیاضانہ امداد و سرپرستی کی بدولت شمالی ہند میں مکاتب و مدارس قائم ہو گئے، جن میں اوچ کا مدرسۂ فیروز (۱۸)، دہلی کا مدرسۂ معزی اور مدرسۂ نصیریہ (۱۹) اور بدایوں کا مدرسۂ معزی (۲۰) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مدارس کے علاوہ ملک کے مختلف شہروں اور قصبوں میں علماء انفرادی طور پر بھی لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے اور حکومت سے ان کو امداد ملتی تھی۔ ہند میں سلاطینِ دہلی کے سیاسی اقتدار میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا، وہ اسلامی علوم کو زیادہ سے زیادہ ترقی دیتے گئے۔

ساتویں صدی ہجری میں نصابِ تعلیم عربی ادب، صرف و نحو، لسانیات، فقہ، اصولِ فقہ، منطق، تصوف، تفسیر اور حدیث پر مشتمل تھا۔ فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا اور اتنی ہی اہمیت صرف و نحو اور ادبیات کو حاصل تھی۔ لیکن اسلامی علوم کے دو اہم ترین شعبوں یعنی حدیث اور تفسیر پر معمولی توجہ کی جاتی تھی اور ان میں بھی حدیث کی تعلیم تو برائے نام ہی ہوتی تھی۔ چنانچہ صنعانی کی مشارق الانوار اور بغوی کی مصابیح السنۃ (۲۱) کے سوا حدیث کی کوئی اور کتاب یہاں تک کے صحاح ستہ میں سے بھی کوئی کتاب نصاب میں داخل نہ تھی۔ اس وقت جو حالات تھے، ان میں اس کے علاوہ کسی اور بات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ کیوں کہ ہند میں جس نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی، اس کا مقصد بھی وہی تھی، جو وسطی ایشیا کے ملکوں میں تھا یعنی طالب علم کو قاضی کے عہدے کے لیے تیار کرنا۔(۲۲) ان حالات میں یہ بات غیر معمولی نہ تھی کہ علاؤالدین خلجی

(۶۹۵ تا ۷۱۵ھ/۱۲۹۶ تا ۱۳۱۶ء) کے عہدِ حکومت کے چھیالیس علماء میں صرف شمس الدین یحییٰ (م ۷۴۷ھ) کو علمِ حدیث سے کچھ دلچسپی تھی۔ مورخ ضیاء الدین برنی نے جس سے ہمیں مذکورہ معلومات حاصل ہوئی ہیں، حدیث کو ان مضامین میں شامل نہیں کیا ہے جن کی اس زمانہ میں تعلیم دی جاتی تھی۔(۲۳) اس لیے یہ بات بہت مشتبہ ہے کہ حدیث کی کتابوں کا غائر مطالعہ بھی کیا جاتا تھا۔ ہمارے اس قیاس کو اس واقعہ سے تقویت ہوتی ہے کہ ۷۰۰ھ/۱۳۰۰ء میں ایک ممتاز مصری محدث شمس الدین ترک حدیث کی بہت سی کتابیں لے کر ہند آئے تھے تا کہ یہاں ان کتابوں کو رائج کیا جائے۔ لیکن جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ علاء الدین نماز کا پابند نہیں ہے، اور جمعہ کی نماز بھی نہیں پڑھتا ہے تو ان کو بڑی مایوسی ہوئی، اور اُنہیں اس قدر رنج پہنچا کہ اُنہوں نے اس ملک میں علمِ حدیث کی اشاعت کا خیال ترک کر دیا۔ لیکن وطن واپس جانے سے قبل اُنہوں نے حدیث پر ایک رسالہ لکھا اور اس کا انتساب سلطانِ دہلی کے نام کیا۔ شمس الدین نے یہ رسالہ اور علاء الدین خلجی کے نام ایک خط شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (م ۶۶۶ھ) کے پوتے مولانا فضل اللہ کے پاس چھوڑ دیا۔ اس خط میں اُنہوں نے یہ لکھا تھا کہ علاء الدین کے زمانے کے علماء نے علمِ حدیث کو ترک کر دیا ہے اور صرف فقہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے متنفر ہو کر وہ وطن واپس جا رہے ہیں، کیوں کہ وہ یہاں علمِ حدیث کی تعلیم دینے کے خیال سے آئے تھے۔(۲۴) شمس الدین کے اس طرح واپس چلے جانے سے ہند میں اشاعتِ حدیث کا ایک بہت اچھا موقع ضائع ہو گیا۔

ساتویں صدی ہجری میں علمِ حدیث کے بارے میں علماء کا رجحان اگرچہ وہی رہا، جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ تاہم اس زمانے میں کچھ ایسے علماء بھی ہوئے جن کو اس علم سے دلچسپی تھی اور وہ اس میں کافی قابلیت بھی رکھتے تھے۔ طبقاتِ ناصری کے مصنف منہاج السراج جزجانی کے پاس سنن ابوداؤد کا ایک نسخہ بھی موجود تھا اور غالباً ہند میں اس کی کتاب کا یہ واحد نسخہ تھا۔

ساتویں صدی ہجری کے محدثین

۱۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (م ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء)

ملتان کے مشہور ولی اور شیخ شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ھ) کے مرید شیخ بہاء الدین

زکریا ایک صحابیِ رسولؐ ہبار بن اسود کی اولاد میں تھے۔ وہ ملتان کے قریب قلعہ کٹ کرا میں پیدا ہوئے تھے۔ بخارا اور خراسان میں تعلیم حاصل کی۔ پھر زیارتِ حرمین کے لیے حجاز گئے۔ اور مدینہ منورہ کے ایک محدث کمال الدین محمد الیمنی سے پانچ سال تک حدیث کی تعلیم حاصل کر کے اس علم میں مہارت پیدا کر لی۔ شیخ بہاء الدین نے صفر ۶۶۶ھ/اکتوبر ۱۲۶۷ء میں ملتان میں وفات پائی۔ (۲۶)

۲۔ قاضی منہاج السراج جزجانی (م ۶۶۸ھ/۱۲۷۰ء)

قاضی منہاج کا تعلق خراسان کے شہر جزجان کے ایک مہذب و شائستہ خاندان سے تھا۔ اُنہوں نے ۶۲۳ھ/۱۲۲۸ء میں وطن کو خیر باد کہا اور ہند کا رُخ کیا۔ منہاج نے اپنے والد سے جو سلطان محمد غوری (۵۷۰ تا ۶۰۲ھ/۱۱۷۵ تا ۱۲۰۵ء) کی ہندی فوج میں قاضی مقرر کیے گئے تھے، عمدہ تعلیم حاصل کی جس کی بدولت وہ ملتان کے حاکم ناصر الدین قباچہ اور سلاطینِ دہلی التتمش (۶۰۷ تا ۶۳۳ھ/۱۲۱۰ تا ۱۲۳۶ء) رضیہ (۶۳۴ تا ۶۳۷ھ/۱۲۳۶ تا ۱۲۴۰ء) بہرام (۶۳۷ تا ۶۳۹ھ/۱۲۴۰ تا ۱۲۴۲ء) اور ناسر الدین محمود (۶۴۴ تا ۶۶۴ھ/۱۲۴۶ تا ۱۲۶۶ء) کے عہد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اُچھ کے مدرسۂ فیروز اور دہلی کے مدرسۂ نصیریہ کے صدر معلم اور منصفِ اعلیٰ اور مبلغ کی حیثیت سے منہاج نے بڑی قابلیت کا ثبوت دیا۔ ۶۴۰ھ/۱۲۴۲ء میں وہ بنگال میں لکھنوتی گئے اور وہاں دو سال تک قیام کیا۔ منہاج نے ۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء کے بعد وفات پائی۔ لیکن ان کی صحیح تاریخِ وفات کا علم نہیں ہے۔ (۲۷)

طبقاتِ ناصری (۲۸) میں منہاج نے سنن ابوداؤد سے متعلق احادیث نقل کی ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اس کا بخوبی مطالعہ کیا تھا۔ (۲۹) منہاج نے چند موضوع اور کمزور احادیث کو متواتر کہا ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہوں نے علمِ حدیث کا وسیع اور غائر مطالعہ نہیں کیا تھا۔ (۳۰)

۳۔ برہان الدین محمود ابی الخیر اسعد بخاری (م ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء)

برہان الدین محمود، سلطان غیاث الدین بلبن (۶۶۴ تا ۶۸۶ھ/۱۲۶۶ تا ۱۲۸۶ء) کے زمانے میں بقیدِ حیات تھے۔ وہ الصغانی (م ۶۵۰ھ) کے شاگرد تھے اور ان سے مشارق الانوار کی سند

حاصل کی تھی۔ وہ دہلی میں مشارق الانوار کی تعلیم کا آغاز کرنے والے پہلے محدث تھے۔ برہان الدین محمود کے مرغینان میں الہدایہ کے نامور مصنف برہان الدین المرغینانی (م ۵۹۳ھ) سے ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ سلطان بلبن برہان الدین محمود کی بہت عزت کرتا تھا اور حصولِ برکت کے لیے جمعہ کے روز ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ اُنہوں نے ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں دہلی میں وفات پائی اور حوض شمسی کے مشرقی حصہ میں دفن کیے گئے۔ (۳۱)

۴۔ کمال الدین زاہد (م ۶۸۴ھ/۱۲۸۵ء)

محمد بن احمد بن محمد المرکلی جو کمال الدین زاہد کے نام سے معروف ہیں، علمِ حدیث میں شیخ نظام الدین اولیا (م ۷۲۵ھ) کے اُستاد ہونے کے باعث ممتاز ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے مشارق الانوار الصغانی کے دو شاگردوں، برہان الدین محمود (م ۶۸۷ھ) اور شرح آثار النیرین فی اخبار الصحیحین کے مصنف کے ساتھ پڑھی تھی۔ ان کے نہایت پاکیزہ خصائل کی وجہ سے سلطان غیاث الدین بلبن نے ان کو امام کے عہدے پر مقرر کرنا چاہا تھا، مگر اُنہوں نے انکار کر دیا۔ کمال الدین نے ۶۸۴ھ/۱۲۸۵ء میں دہلی میں وفات پائی۔ (۳۲)

۵۔ رضی الدین بدایونی (م ۷۰۰ھ)

رضی الدین اپنے ہم عصر علمائے دہلی میں علمِ حدیث پر کافی عبور رکھتے تھے۔ وہ کوئل (موجودہ علی گڑھ) کے قاضی تھے۔ رضی الدین مکہ معظّمہ اور وہاں سے بغداد گئے جہاں خلیفہ نے محدث ہونے کی بنا پر ان کو شرفِ بازیابی عطا کیا۔ پھر وہ ہند واپس آئے اور لاہور میں وفات پائی۔ ان کی تاریخِ وفات کا علم نہیں ہے۔ (۳۳)

۶۔ ابوتوّامہ البخاری حنبلی (م ۷۰۰ھ)

شرف الدین ابوتوامہ بخارا کے رہنے والے تھے۔ اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں ترکِ وطن کر کے دہلی آ گئے۔ سلطان التتمش (۶۰۷ تا ۶۳۳ھ/۱۲۱۰ تا ۱۲۳۶ء) کے عہد میں بنگال کے شہر سنار گاؤں چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی، ابوتوامہ بہت مشہور استاد تھے۔ اور حنبلی ہونے کے باعثِ علمِ حدیث میں بہت قابلِ تھے۔ ان کی وجہ سے سنار گاؤں بہت جلد بنگال میں علمِ

حدیث کا ایک مرکز بن گیا جس سے فیض پانے والوں میں بہار کے مشہور ولی اور محدث مخدوم شرف الدین منیری (م ۷۸۲ھ) بھی شامل تھے۔ ابوتوامہ نے ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں سنار گاؤں میں وفات پائی۔ (۳۴)

فصلِ سوم: سلطنتِ دہلی، دورِ آخر

(۷۰۰ تا ۹۰۰ھ / ۱۳۰۰ تا ۱۴۹۴ء)

فقہ کے بعد جس علم پر علماء نے سب سے زیادہ توجہ کی وہ معقولات ہے اور سلطان محمد تغلق (۷۲۵ تا ۷۵۲ھ / ۱۳۲۵ تا ۱۳۵۱ء) کے عہد میں اس کو دہلی میں بہت فروغ ہوا۔ سلطان محمد تغلق خود ایک جید عالم تھا اور اس نے معقولات کی بہت سرپرستی کی۔ اس کے حلقۂ علماء میں منجملہ دیگر اشخاص کے ایک فلسفی عالم مولانا علیم الدین بھی شامل تھے جن سے وہ اس موضوع پر باقاعدہ بحث کیا کرتا تھا۔ (۳۵) سلطان معقولات کا اس قدر گرویدہ تھا کہ وہ بذاتِ خود معقولات کے درس کا انتظام کیا کرتا تھا۔ (۳۶) اس زمانے میں معقولات اور فقہ عام دلچسپی کے مضامین تھے اور قرآن اور حدیث کی تعلیم کو اس حد تک نظر انداز کر دیا گیا تھا کہ سلطان محمد تغلق کے ہم عصر مؤرخ ضیاء الدین برنی (۳۷) نے محمد تغلق کی بے رحمی اور سنک کو منقولات کے بجائے معقولات کا مطالعہ کرنے کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ (۳۸) فلسفہ اور منطق کے برے اثرات محمد تغلق میں سنک اور ایک مخصوص مزاج پیدا کرنے کے کہاں تک ذمہ دار تھے، یہ تو ایک بحث طلب سوال ہے۔ (۳۹) لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانے کے سنجیدہ طبع لوگ قرآن و حدیث کی تعلیم کے فقدان کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ تاہم ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ علماء کی عظیم اکثریت حنفی مسلک کی حامل تھی۔ اور وہ اپنی تمام توجہ فقہ پر مرتکز کیے ہوئے تھے جو سرکاری ملازمت مل جانے کی قطعی ضمانت تھی۔ ان میں وسیع النظری اور آزادانہ طور پر فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہ تھی، اس لیے وہ شرعی مسائل کو صرف حنفی فقہ کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ اور اس مسلک کے اصولوں سے کسی انحراف کی، خواہ وہ حدیث کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، شدید ترین مخالفت کرتے تھے۔ علماء کے اس بے لچک رویہ کی مثال اس مشہور مناظرہ سے ملتی ہے جو شیخ نظام الدین اولیاء اور فقہا کے درمیان سلطان غیاث الدین تغلق (۷۲۰ تا

۷۲۵ھ/۱۳۲۱ تا ۱۳۲۵ء) کے عہد میں ہوا تھا۔(۴۰) شافعی مسلک کی اتباع کرتے ہوئے شیخ نظام الدین نے سماع کی حمایت میں احادیث پیش کیں۔لیکن فقہا نے احادیث کو مسترد کر دیا۔اولاً اس بنا پر کہ شیخ مقلد ابوحنیفہ ہیں، اس لیے اُنہیں حدیث سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہیے اور ثانیاً اس وجہ سے کہ یہ احادیث شافعی مسلک کی حمایت میں ہیں، اس لیے حنفی فقہا ان کو قبول کرنے کے پابند نہیں۔مزید براں اُنہوں نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ ہند میں فقہی روایات کی قانونی حیثیت خود احادیث سے بھی زیادہ ہے۔چنانچہ ان فقہا نے شیخ نظام الدین اولیاء سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس مسئلہ پر امام ابوحنیفہؒ کی قطعی رائے پیش کریں۔فقہا نے حدیثِ نبوی کو مسترد کر دینے کی جو جسارت کی اس سے نظام الدین اولیاء کو شدید صدمہ پہنچا اور وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ ایک ایسے ملک کے مسلمان کب تک باقی رہیں گے جہاں ایک فرد کی رائے کو احادیث پر فوقیت دی جاتی ہو۔شمس الدین ترک اور نظام الدین اولیاء کے ان اقوال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے علماء میں جو اپنے دور کے علمی طبقہ کے نمائندہ تھے، جس قسم کے رجحانات پائے جاتے تھے، وہ ہند میں علمِ حدیث کی اشاعت کے لیے سازگار نہ تھے۔اور یہاں اس کا مستقبل بہت مایوس کن معلوم ہوتا تھا۔تاہم اس تاریکی میں روشنی کی کرن نظر آ رہی تھی۔رسولؐ اور سنتِ رسولؐ کی محبت سے سرشار صوفی علماء نے علمِ حدیث کی تحصیل پر خود بھی توجہ کی اور اپنے مریدوں میں بھی اسے حاصل کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔اس ذوق وشوق کا نتیجہ یہ نکلا کہ چار صوفی علماء کی سرکردگی میں شمالی ہند میں علمِ حدیث کے چار مکاتب قائم ہو گئے۔ چنانچہ دہلی میں شیخ نظام الدین اولیاء اور ان کے مکتبِ محدثین۔بہار میں مخدوم شرف الدین منیری اور ان کے مکتبِ محدثین، ملتان میں شیخ زکریا ملتانی اور ان کے مکتبِ محدثین اور کشمیر میں سر سیّد علی ہمدانی اور ان کے مکتبِ محدثین نے علمِ حدیث کی اشاعت پر پوری توجہ کی۔اور ان چاروں مکاتبِ حدیث کے صوفی علماء شمالی ہند میں نویں صدی ہجری کے آخر تک اس علم کی ترقی و اشاعت میں مصروف رہے۔یہاں تک کہ اس ملک میں علمِ حدیث کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہو گیا۔

نظام الدین اولیاء اور ان کا مکتبِ محدثین

ا۔ شیخ نظام الدین اولیاء (۶۳۴ تا ۷۲۵ھ/۱۲۳۶ تا ۱۳۲۵ء)

محمد بن احمد بن علی، جو نظام الدین اولیاء کے نام سے مشہور ہیں، ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء میں بدایون میں پیدا ہوئے تھے جہاں ان کے دادا شیخ علی اور نانا خواجہ عرب دونوں منگولوں کے حملے کے دوران بخارا سے ہجرت کر کے آباد ہو گئے تھے۔ شیخ نظام الدین نے علاء الدین اصولی بدایونی اور شمس الدین خوارزمی سے جن کو آگے چل کر شمس الملک کا خطاب ملا اور سلطان غیاث الدین بلبن کے وزیر ہوئے، تحصیلِ علم کیا۔ اور صرف بیس سال کی عمر میں عربی ادب اور فقہ کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد سرکاری قاضی کے عہدہ پر مقرر کیے جانے کے خواہش مند ہوئے۔ لیکن شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر(۴۱) (م ۶۶۴ھ) کے بھائی شیخ نجیب الدین المتوکل (م ۶۸۱ھ) کے ایماء پر، جنہوں نے اس نوجوان عالم میں ایک بہت بڑے ولی کے آثار دیکھ لیے تھے۔ وہ ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء میں اجودھن یا پاک پٹن گئے اور شیخ فریدالدین گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے مرید ہو گئے۔(۴۲) اس طرح شیخ نظام الدین کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اور رفتہ رفتہ وہ شیخ فریدالدین گنج شکر کے خلیفہ اور ہند کے ایک عظیم ترین ولی ہو گئے۔ اُنہوں نے بمقام غیاث پور جسے اب بستی نظام الدین کہتے ہیں اور دہلی سے تین میل کے فاصلے پر ہے، اپنی خانقاہ میں ۱۸ ربیع الثانی سنہ ۷۲۵ھ/اپریل ۱۳۲۵ء بروز جمعہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔(۴۳)

شیخ نظام الدین اور مطالعہٗ حدیث

یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ شیخ نظام الدین نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں حدیث کی تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ اُنہوں نے علمِ حدیث کا مطالعہ اس وقت شروع کیا جب وہ ایک ممتاز ولی کی حیثیت سے بہت مشہور ہو چکے تھے۔ لیکن اس کا سبب معلوم کرنا دشوار نہیں۔ اس زمانے میں قاضی کا منصب حاصل کرنے کے لیے جن علوم کا حاصل کرنا ضروری تھا، ان سے فراغت کے بعد شیخ نظام الدین کو اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ علمِ حدیث کی تحصیل پر توجہ کر سکیں، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ قاضی مقرر کر دیے جاتے جیسا کہ وہ چاہتے تھے تو حدیث کا مطالعہ کرنے کی اُنہیں ضرورت ہی نہ

ہوتی۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اللہ نے ان کو ولایت بخشی، اور وہ جیسے جیسے روحانیت کی منزلیں طے کرتے گئے ان کو مطالعۂ حدیث کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوتی گئی۔ چنانچہ ایک عالم اور ولی کے اوصاف سے پوری طرح متصف ہونے کے باوجود اُنہوں نے مولانا کمال الدین زاہد کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور ان سے مشارق الانوار کا درس لینے لگے۔ شیخ نظام الدین نے اس کتاب کا بہت غائر اور تنقیدی مطالعہ کیا اور ۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء میں اس کی تکمیل کے بعد مولانا کمال الدین سے سند حاصل کی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نظام الدین نے جب مطالعۂ حدیث کا آغاز کیا تو وہ ایک ولی کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ اس سند کا متن درج ذیل ہے۔(۴۴)

بسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لمن له الاهتداء مالا عطاء والصباح والرواح، والمدح لمن له الا لاء والنعماء والصباح والمداح، والصلوة الفصاح على ذى الفضائل والسماء والكلمة الكلام المفتاح والمناقب العلياء والاحاديث الصحاح صلوة قدوم دوام الصباح والرواح، وبعد فان الله فق الشيخ الامام العالم الناسك المسالك نظام الدين محمد بن احمد بن على مع وفور فضله فى العلم وبلوغ قدرة ذروة الحلم مقبول المشائخ الكبار منظور العلماء الاخيار والابراربان قرء هذا الاصل المستخرج من الصحيحين على الساطر هذه السطور فى الزمان الهارو ورود الامطار من اوله الى آخره قرأة وسماعاً عن الشيخين الا مامين العالمين احد الشيخين مؤلف شرح اثار الشيرين فى اخبار الصحيحين والآخر صاحب الدرين المنيرين الام الاجل الكامل هالك رقاب النظم والنثر برهان الملة والدين محمود بن ابى الحسن اسعد البلخى رحمة عليهما رحمة واسعة كتابة وشفاهة وهما يروبانه عن مؤلفه، واجزت له ان يروى عنى كما هو المشروط فى هذا الباب، والله اعلم بالصواب، وصيّة ان لاينسيانى واولادى فى دعواته فى خلواته، وصح له القرأة والسماع فى المسجد المنسوب الى نجم الدين ابى بكر التواسى رحمه الله فى بلدة دهلى صانها الله من الآناتو العاهات، وهذا خط اَضعف عباد الله واحقر خلقه محمد بن احمدُ المار لكلى الملقب بكمال الزاهد والفراغ من القرأة والسماع وكتب هذاه السطور فى الثانى

والعشرين من ربیع الاوّل سنۃ تسع وسبعین وست مائۃ، حامد اللہ تعالیٰ ومصلیا علی رسولہ۔

مطالعۂ حدیث نے شیخ نظام الدین کے خیالات پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ مدرسہ میں تعلیم کے دوران میں شیخ نظام الدین نے چالیس مقامات الحریری زبانی یاد کر لیے تھے اور وہ اسے ایک ایسا گناہ تصور کرتے تھے جس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اُنہوں نے مشارق الانوار مین درج تمام احادیث حفظ کر لیں۔ حدیث کے مطالعہ نے زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر اس قدر وسیع کر دیا تھا کہ اُنہوں نے علماء کی جامد تقلید پسندی ترک کر دی اور محدثین کا مسلک اختیار کر لیا۔ چنانچہ حلتِ سماع، قرأت خلف الامام اور صلوۃ الجنازۃ علی الغائب کے متعلق ان کی رائے سے اس تبدیلی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

شیخ نظام الدین بحیثیت محدث

شیخ نظام الدین کے ملفوظات فوائد الفواد کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہت بڑے پائے کے محدث نہیں تھے۔ کیوں کہ اس کتاب میں منجملہ دوسری باتوں کے بہت سی موضوع احادیث بھی موجود ہیں۔ (۴۵) ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہوا کہ مشارق الانوار کے سوا حدیث کی کسی اور مستند کتاب کا اُنہوں نے مطالعہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مستحقِ ستائش ہیں کہ اُنہوں نے اپنی خانقاہ کے لوگوں میں مطالعۂ حدیث سے گہری دلچسپی پیدا کر دی، جس کی بدولت ان کے مریدوں اور مریدوں کے جانشینوں میں کافی بڑی تعداد ایسے علماء کی ہو گئی جنہوں نے علمِ حدیث میں مہارت حاصل کر لی تھی۔

شمسُ الدین محمد بن یحییٰ اودھی (م ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء)

ان کا تعلق شیخ نظام الدین کے دبستانِ حدیث سے تھا۔ اور یہ اس زمانہ کے دو مشہور علماء فرید الدین شافعی اور ظہیر الدین بھکری کے شاگرد تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے مرشد شیخ نظام الدین اولیاء سے مشارق الانوار کا درس بھی لیا تھا، اور اس سے فراغت کے بعد سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں دہلی کے شاہی مدرسہ میں مدرس مقرر کیے گئے تھے۔ ۷۲۴ھ/۱۳۲۳ء میں شیخ نظام الدین نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ اس کے بعد سلطان محمد بن تغلق نے کشمیر میں تبلیغِ اسلام کا

فرض ان کو تفویض کیا، لیکن مامور بہ کار ہونے سے قبل ہی ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء میں وہ اچانک انتقال کر گئے۔ اور دہلی میں مدفون ہوئے۔(۴۶)

شمس الدین پہلے ہندی محدث اور دوسرے مسلمان شارح ہیں جنہوں نے مشارق الانوار کی شرح لکھی۔(۴۷) بدقسمتی سے یہ شرح اب ناپید ہے۔ شمس الدین کے نامور شاگرد نصیر الدین چراغِ دہلی نے ان کی مدح میں جو شعر کہا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتنے بڑے عالم تھے۔(۴۸)

فخر الدین زرّادسانوی دہلوی (م ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء)

یہ شمس الدین اودھی اور دہلی کے بعض دوسرے مشہور علماء کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ فخر الدین فقیہ بھی تھے اور محدث بھی۔ اُنہوں نے علمِ حدیث کا بہت وسیع اور غائر مطالعہ کیا تھا۔ دہلی میں الھدایہ کا درس دیتے ہوئے وہ صحیحین سے مماثل احادیث بطور سند بیان کرتے جاتے تھے۔ جس سے خود ہدایہ کی صحت زیادہ واضح ہوتی جاتی تھی۔(۴۹) سماع کے بارے میں اُنہوں نے عربی میں دو رسالے اصول السماع (۵۰) اور کشف القناعن وجوہ السماع لکھے ہیں(۵۱) جن میں احادیث کے حوالے بکثرت دیئے ہیں، بالخصوص موخر الذکر رسالہ کی آٹھویں فصل جس میں احادیثِ نبوی کی رو سے سماع کو جائز قرار دیا گیا ہے۔(۵۲)

شیخ نظام الدین اولیاء نے سماع کے بارے میں جو مشہور مناظرہ کیا تھا، اس میں فخر الدین نے بھی اپنے مرشد کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ محمد بن تغلق کے حسبِ ایماء فخر الدین بھی دولت آباد چلے گئے تھے، جہاں سے وہ مکہ معظمہ اور بغداد گئے اور وہاں کے ممتاز محدثین کے درس میں شرکت کی۔ ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں وطن واپس آتے ہوئے سمندر میں غرق ہو گئے۔(۵۳)

ضیاء الدین بن معید الملک برنی

تاریخِ فیروز شاہی کے مشہور مصنف ضیاء الدین برنی نے شیخ نظام الدین اولیاء کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد غیاث پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔(۵۴) اور اس طرح ان کو اپنے مرشد سے بہت قریب ہونے کا موقع ملا۔ ضیاء الدین برنی ایک شائستہ انسان تھے اور ان کا

مطالعہ بہت وسیع تھا۔(۵۵) علمِ حدیث پر اُنہیں کتنا عبور حاصل تھا، اس کا اندازہ ان احادیث سے ہو سکتا ہے، جن کا حوالہ اُنہوں نے اپنی تاریخ میں دیا ہے۔(۵۶) اور بالخصوص کتاب کے مقدمے سے جس میں اُنہوں نے حدیث اور تاریخ کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔(۵۷) اس میں برنی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قرآنِ حکیم اور سنتِ رسولؐ کا مطالعہ کرنے سے انسان اعتدال پسند اور کریم النفس ہو جاتا ہے۔(۵۸) ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء میں برنی کی تاریخِ فیروز شاہی مکمل ہوئی، اور اس کے کچھ عرصہ بعد اُنہوں نے وفات پائی۔(۵۹)

محی الدین بن جلال الدین بن قطب الدین کاشانی (م ۷۱۹ھ/۱۳۱۹ء)

یہ شیخ نظام الدین اولیاء کے ان مریدوں میں سے تھے، جو علمِ حدیث سے بہت گہرا شغف رکھتے تھے۔ وہ خود شیخ نظام الدین کے درس میں بھی شریک ہوتے تھے جس میں وہ مشکل احادیث کی تشریح کیا کرتے تھے۔(۶۰) خزینۃ الاصفیاء(۶۱) میں مذکور ہے کہ محی الدین علمِ حدیث، تفسیر اور فقہ کے عالم تھے۔ ان کا تعلق اودھ کے موروثی قاضیوں کے ایک خاندان سے تھا۔ مگر اُنہوں نے درویشانہ زندگی اختیار کر لی اور انتہائی افلاس سے دوچار رہے۔ ان کے ایک دوست نے سلطان علاء الدین خلجی کو ان کی حالتِ زار سے آگاہ کیا تھا اور سلطان نے ان کو اودھ کا قاضی بنا دینے کی پیش کش کی تھی، مگر اُنہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ۷۱۹ھ/۱۳۱۹ء میں محی الدین نے دہلی میں انتقال کیا۔(۶۲)

نظام الدین علامی الہاشمی ظفر آبادی (م ۷۳۵ھ/۱۳۳۴ء)

نظام الدین علامی بہت مشہور عالم تھے۔ علمِ حدیث پر ان کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ انہیں زبدۃ المحدثین کہا جانے لگا۔ شیخ نظام الدین سے بیعت کر کے اُنہوں نے اپنی زندگی کے علمی دور کا آغاز کیا تھا، اور غالباً اُن کی وفات کے بعد جون پور کے قریب ظفر آباد کے محلّہ سیّد واڑہ میں مخدوم اسد الدین آفتابِ ہند (۶۶۱ھ تا ۷۹۳ھ) کی رہبری میں تصوف کی تعلیم کے مدارج طے کیے۔ مخدوم اسد الدین ایک مشہور ولی تھے اور اُنہوں نے نظام الدین کو اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔ نظام الدین نے تصوف پر دو رسالے قلم بند کیے ہیں، ایک عربی میں ہے جس کا نام زادِ الصلحاء ہے اور دوسرا فارسی میں

ہے، اور اس کا نام زادِ سالکان ہے۔ نظام الدین نے ۷۴۵ھ/۱۳۴۴ء میں ظفر آباد میں وفات پائی۔(۶۴)

شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی (م ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء)

نصیر الدین محمود بن یحییٰ بن عبداللطیف الحسینی، یزدی اودھی ''چراغِ دہلی'' کے نام سے بہت مشہور ہیں۔ شیخ نصیر الدین غیاث پور کی خانقاہ میں شیخ نظام الدین اولیاء کے جانشین ہوئے تھے۔ اُنہوں نے محی الدین کاشانی، شمس الدین محمد اودھی اور دوسرے علماء کے ساتھ اسلامی علوم کا مطالعہ کیا تھا۔ علمِ حدیث پر ان کو کافی عبور حاصل تھا، جس کا ثبوت ان کے ملفوظات خیر المجالس سے ملتا ہے۔(۶۵) جمعہ ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ (ستمبر ۱۳۵۶ء) کو شیخ نصیر الدین نے دہلی میں وفات پائی۔(۶۶)

سیّد محمد گیسودراز (۷۲۱ تا ۸۲۵ھ/۱۳۲۱ تا ۱۴۲۲ء)

ابوالفتح صدر الدین محمد بن یوسف بن علی الحسینی دہلوی جو گیسودراز کے نام سے بہت مشہور ہیں، بہت بڑے اور نامور ولی تھے۔ وہ شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی کے مرید تھے اور خانقاہِ غیاث پور میں ان کے جانشین ہوئے۔ سیّد محمد ۴ رجب ۷۲۱ھ (جولائی ۱۳۲۱ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ شرف الدین کیتھلی، تاج الدین مقدم اور قاضی عبدالمقتدر (م ۷۹۱ھ) کے ساتھ تحصیلِ علم کیا۔ تیمور کے حملے کی وجہ سے سیّد محمد نے ۸۰۱ھ/۱۳۹۹ء میں دہلی کو خیر باد کہا اور کچھ عرصہ گجرات اور دولت آباد میں مقیم رہنے کے بعد ۸۰۳ھ/۱۴۰۲ء میں گلبرگہ پہنچے۔ جہاں سلطان فیروز شاہ بہمنی (۸۰۰ تا ۸۲۵ھ/۱۳۹۷ تا ۱۴۲۲ء) نے بہت عزت اور اعزاز و احترام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ شہزادہ احمد شاہ بہمنی ان کا مرید ہو گیا تھا اور اس نے ان کے لیے بہت عمدہ رہائش گاہ اور اس سے متصل خانقاہ تعمیر کی۔ سیّد محمد نے دوشنبہ ۱۶ ذیقعدہ ۸۲۵ھ/ اکتوبر ۱۴۲۲ء کو وفات پائی۔(۶۷)

سیّد محمد گیسودراز نے مختلف اسلامی علوم کے بارے میں ایک سو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔(۶۰) جن میں حدیث سے متعلق تصانیف درج ذیل ہیں:

ا۔ شرح مشارق الانوار: اس شرح کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ حدیث کی تاویل تصوف کا نقطۂ

نظر ملحوظ رکھ کر کی گئی ہے۔(۶۹)

۲۔ ترجمانِ مشارق الانوار: یہ کتاب مشارق الانوار کا فارسی ترجمہ ہے۔(۷۰)

۳۔ کتاب الاربعین: یہ رسالہ چالیس منتخب احادیث کا مجموعہ ہے۔ مصنف نے ہر حدیث کے ساتھ صحابہ، تابعین اور مشائخ کے ہم مفہوم اقوال بھی قلم بند کیے ہیں۔(۷۱)

۴۔ رسالہ سیرت النبیؐ۔(۷۲)

شیخ وجیہہ الدین

وجیہہ الدین شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی کے ایک ممتاز مرید تھے۔ علمِ حدیث پر ان کو کافی عبور حاصل تھا۔ اپنی تصنیف مفتاح الجنان (۷۳) کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے جو فارسی میں لکھی گئی ہے اور اس میں اوراد و عبادات اور اخلاقیات سے متعلق ہدایات قلم بند کی گئی ہیں۔ کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ یہ کتاب قرآن حکیم اور صحیح ترین احادیث پر مبنی ہے۔ اور اس سے غالباً مصنف کی مراد مشارق الانوار ہے۔ مفتاح الجنان کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۰۸۴ھ/ ۱۶۷۳ء میں لکھا گیا تھا، برٹش میوزیم میں موجود ہے۔(۷۵)

قاضی شہابُ الدین دولت آبادی (م ۸۴۹ھ/ ۱۴۴۵ء)

ملک العلماء شہابُ الدین بن شمسُ الدین بن عمر الزوالی، غزنوی، دولت آبادی اوائلِ نویں صدی ہجری کے ایک نامور عالم تھے۔ دولت آباد، دکن میں پیدا ہوئے تھے اور دہلی میں مُعین الدین عمرانی (م ۸۰۷ھ)، مولانا خواجگی (م ۸۱۹ھ) اور قاضی عبدالمقتدر الشریحی (م ۷۹۱ھ) جیسے ممتاز علماء سے تعلیم حاصل کی۔ قاضی عبدالمقتدر شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی کے مرید تھے۔(۷۶) اور یہی قاضی شہابُ الدین کے روحانی مرشد تھے۔ تیمور کے حملہ کی وجہ سے قاضی شہابُ الدین مولانا خواجگی کے ساتھ دہلی کو چھوڑ کر کالپی چلے گئے۔(۷۷) اور پھر وہاں سے جون پور جا کے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ سلطان ابراہیم شرقی (۸۰۴ تا ۸۴۴ھ/ ۱۴۰۱ تا ۱۴۴۸ء) نے قاضی شہابُ الدین کی بہت سرپرستی کی، اور ان کو ملک العلماء کا خطاب دیا۔ ۲۵ رجب ۸۴۹ھ (اکتوبر ۱۴۴۵ء) کو قاضی شہاب الدین کا انتقال ہوا، اور جون پور میں ابراہیم شرقی کی مسجد کے قریب دفن کیے گئے۔(۷۸)

قاضی شہاب الدین کی تصانیف میں ایک رسالہ سیّدوں کی فضیلت کے بارے میں ہے، جس کا نام مناقب السادات یا شرف السادات ہے۔(۷۹) اس رسالے میں مصنف نے قرآن مجید کی آیات اور احادیث کا بکثرت حوالہ دیا ہے۔ یہ احادیث مشارق الانوار، مصابیح السنہ، مشکوۃ المصابیح اور الطحاوی کی شرح معانی لآ ثار سے لی گئی ہیں۔

شمسُ الدین خواجگی کڑاوی (م ۸۷۸ھ / ۱۴۷۳ء)

شمسُ الدین خواجگی بن احمد بن شمسُ الدین ملتانی، کڑاوی، اسمٰعیل بن حضرت جعفر صادق (م ۱۴۸ھ) کی اولاد میں ہیں۔ وہ ایک صوفی عالم تھے۔ اُنہوں نے مشارق الانوار میں سے احادیث منتخب کر کے ایک اربعین مرتب کیا تھا اور اسے حفظ بھی کر لیا۔ مولانا شمسُ الدین خواجگی نے اپنے وطن کڑا میں، جو الہٰ آباد کے قریب ہے، ۱۸ محرم ۸۷۸ھ / مئی ۱۴۷۳ء کو وفات پائی۔ (۸۰) ان کا مقبرہ دریائے گنگا کے کنارے تھا (۸۱) جو ۱۹۴۰ء کے سیلاب میں بہ گیا۔ اگر چہ اس کا قطعی ثبوت موجود نہیں کہ مولانا خواجگی کا تعلق شیخ نظام الدین اولیاء کے حلقۂ محدثین سے تھا، تاہم گمانِ غالب یہ ہے کہ وہ اس حلقہ سے متعلق تھے کیوں کہ وہ اودھ میں رہے، اور یہ علاقہ شمسُ الدین اودھی اور شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی جیسے شیخ نظام الدین کے ممتاز مریدوں کے زیرِ اثر تھا۔ (۸۲)

۲۔ شرف الدین منیری اور ان کے مکتبِ محدثین

مخدوم الملک شرف الدین منیری بہاری (۶۶۱ تا ۷۸۲ھ / ۱۲۶۳ تا ۱۳۸۱ء)

بہار کے مشہور و معروف ولی شرف الدین احمد بن یحیٰی منیری ماہِ شوال ۶۶۱ھ (اگست ۱۲۶۳ء) میں بروز جمعہ بہار شریف سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر ایک موضع منیر (۸۳) میں پیدا ہوئے اور سنار گاؤں میں اپنے شفیق استاد ابو توامہ حنبلی کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ جن کی لڑکی سے شرف الدین نے شادی بھی کر لی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد شرف الدین ۶۹۱ھ / ۱۲۹۱ء میں دہلی گئے، اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے ملاقات کی۔ (۸۴) پھر وہ لاہور گئے اور شیخ نجیب الدین فردوسی (۸۵) (م ۷۳۳ھ) کے مرید ہوئے۔ اس کے بعد اُنہوں نے تیس سال بہیا اور راج گیر کے جنگلوں میں گزارے اور قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے عبادت اور مراقبے کرتے رہے۔ ۷۲۰ اور ۷۲۴ھ

(۱۳۲۰-۲۴ء) کے درمیانی زمانے میں اُنہوں نے گوشہ نشینی ترک کر دی، اور لوگوں کی روحانی رہبری کرنے لگے۔ منیر میں ان کی خانقاہ کی ابتدائی تعمیر ان کے دوستوں اور مداحوں نے کی تھی، جسے سلطان محمد تغلق نے وسعت دے کر دوبارہ تعمیر کیا، اور اس کے اخراجات کے لیے راج گیر کا پرگنہ بھی وقف کر دیا۔ یہ خانقاہ اب تک موجود ہے۔ شرف الدین منیری نے ۶ شوال ۷۸۲ھ (جنوری ۱۳۸۱ء) کو منیر میں وفات پائی۔(۸۶)

شرف الدین بحیثیت محدث

شرفُ الدین منیری علاقہ ُ بہار کے ایک ممتاز محدث تھے۔ وہ حدیث سے متعلق تمام علوم مثلاً علمِ تاویل الحدیث، علم رجال الحدیث اور علم مصطلحات الحدیث (۸۷) پر پورا عبور رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے مکتوبات اور تصوف کی کتابوں (۸۸) میں احادیث کثرت سے نقل کی ہیں، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بہت سے مواقع پر اُنہوں نے علمِ حدیث کے مختلف پہلوؤں مثلاً روایت بالمعنیٰ، شروط الراوی وغیرہ پر اپنی تصانیف میں طویل بحثیں بھی کی ہیں اور صحیحین، مسندِ ابویعلی، الموصلی، شرح المصابیح اور مشارق الانوار کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ النووی (م ۶۷۲ھ) کی شرح صحیح مسلم کا ایک نسخہ ان کے پاس موجود تھا اور اُنہوں نے اس کا غائر مطالعہ کیا تھا۔(۸۹) کہا جاتا ہے کہ ان کو نہ صرف بہار بلکہ پورے ہند میں صحیحین کی تعلیم شروع کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اُنہیں احادیث نہ صرف زبانی یاد تھیں بلکہ وہ ان کے مطابق عمل بھی کرتے تھے، چنانچہ اُنہوں نے محض اس وجہ سے خربزہ نہیں کھایا کہ اُنہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خربزہ کس طرح نوش فرمایا تھا۔(۹۰) ان اوصاف کے علاوہ شرف الدین منیری قرآن و حدیث دونوں کی متصوفانہ تعلیمات پر بھی سند مانے جاتے تھے۔(۹۱)

نظام الدین اولیاء اور شرف الدین منیری محدث کی حیثیت سے

شیخ نظام الدین اولیاء دہلوی اور شیخ شرف الدین منیری بہاری دونوں صوفی تھے اور ہند میں علمِ حدیث کو فروغ دینے میں دونوں نے اہم حصہ لیا۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے جس طرح دہلی میں ایک ممتاز روحانی مرشد کی حیثیت سے کام کیا، اسی طرح شرف الدین بھی بہار میں سرگرمِ عمل رہے۔

یہ دونوں بزرگ اسلامی علوم کے جیّد عالم تھے۔ علمِ حدیث کے مطالعہ میں شرف الدین نے سبقت حاصل کر لی تھی اور اس کا سبب یہ ہے کہ شیخ نظام الدین نے حدیث کا مطالعہ بڑی عمر میں شروع کیا تھا اور اس موضوع پر الصغانی کی مشارق الانور کے سوا کوئی اور مستند مجموعہ ان کے زیرِ مطالعہ نہیں رہا۔ لیکن شرف الدین منیری کی تعلیم ایک حنبلی عالم ابوتوامہ کی نگرانی میں ہوئی تھی اور اُنہوں نے قدرتی طور پر حدیث کی تعلیم کو بہت اہمیت دی۔ چنانچہ شرف الدین نے علمِ حدیث پر زیادہ عبور حاصل کر لیا۔ اس کے علاوہ شیخ نظام الدین کے برعکس شیخ شرف الدین کو کافی تعداد میں علمِ حدیث کی مستند کتابوں کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی ملا جو غالباً اُنہوں نے اپنے استاد اور دوستوں سے حاصل کی تھیں۔ اس قیاس کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ شیخ زین الدین ساکن دیوہ (۹۳) نے ان کو صحیح مسلم کا ایک نسخہ بطور ہدیہ دیا تھا۔ (۹۴)

شیخ مظفر بلخی (م ۷۸۶ھ/ ۱۳۸۴ء)

مظفر بن شمسُ الدین بلخی منیر میں شرف الدین منیری کے خلیفہ ہوئے تھے۔ مظفر کی ولادت اور تعلیم دہلی میں ہوئی تھی اور سلطان فیروز تغلق (۹۰-۷۵۲ھ/ ۸۰-۱۳۵۱ء) نے ان کو دہلی کے مدرسہ کوشک لال میں استاد مقرر کیا تھا۔ شیخ مظفر کے والد شیخ شمسُ الدین بہار کے ایک ولی احمد چرم پوش کے مرید تھے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ شیخ مظفر بھی چرم پوش کے مرید ہو جائیں۔ لیکن چرم پوش بالکل ان پڑھ تھے، اس لیے مظفر ان کی طرف مائل نہ ہوئے، اور شیخ شرف الدین سے بیعت کرنے کو ترجیح دی۔ لیکن دہلی میں سرکاری مصروفیات کی وجہ سے شیخ مظفر مرید ہونے کے بعد پچیس برس تک شرف الدین منیری کی خانقاہ میں شامل نہ ہو سکے۔ اور مراسلت کر کے اپنے مرشد سے ہدایات حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ مع اہل وعیال کے دہلی سے منیر منتقل ہو گئے۔ اسلامی علوم میں شیخ مظفر کو جو تبحر حاصل تھا، اس کے اعتراف میں شیخ شرف الدین نے ان کو امام کا لقب دیا تھا۔

شیخ مظفر بحیثیت محدث:

شیخ مظفر نے مشارق الانوار کی ایک شرح لکھی تھی، جو غالباً ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی ضائع ہو گئی تھی۔ ان کو محدث کی حیثیت حاصل تھی، جس کی شہادت اس سند سے ملتی ہے جو اُنہوں

نے اپنے بھتیجے اور شاگرد حسین نوشاۂ توحید کو دی تھی۔ سند کے الفاظ یہ ہیں:

''فرزند حسین سند حدیث بریں فقیر کردہ صحیح مسلم و صحیح بخاری من اولہٖ و آخرہٖ لفظاً بریں فقیر تحقیق کردہ۔'' (۹۵)

اپنے محبوب مرشد شرف الدین منیری کی وفات کے بعد شیخ مظفر مکہ کو ہجرت کر گئے، اور ماہِ جمادی الاوّل ۷۸۸ھ / جون ۱۳۸۴ء میں عدن میں وفات پائی۔ (۹۶)

حسین بن معز بہاری (م ۸۴۴ھ / ۱۴۴۱ء)

حسین بخاری جو نوشاۂ توحید کے نام سے معروف ہیں، شیخ مظفر بلخی کے بھتیجے اور خلیفہ تھے۔ وہ سلسلۂ فردوسیہ سے تعلق رکھنے والے صوفی تھے۔ اور محدث بھی تھے۔ ان کی پرورش مخدوم شرف الدین نے کی تھی۔ اور اُنہوں نے اپنے چچا شیخ مظفر سے صحیحین کا درس لیا۔ حسین کے والد شیخ الاسلام معز بہاری بھی کافی معروف محدث تھے اور علمِ حدیث سے حسین کی گہری دلچسپی کے پیشِ نظر اُنہوں نے حسین کو صحیح مسلم کا ایک نسخہ بطور تحفہ دیا جو ریشمی کپڑے پر عمدہ عربی خط میں لکھا گیا تھا۔ (۹۷) حسین اپنے چچا مظفر کے ساتھ حجاز گئے تھے اور عدن میں خطیب العدنی سے حدیث کا درس لیا تھا۔

حسین نوشاۂ توحید نے منیر کی خانقاہ میں حدیث کی کئی کتابوں کا اضافہ کیا جو وہ حجاز سے لائے تھے۔ اُنہوں نے تصوف پر کئی کتابیں بھی لکھیں جن میں حضرات خمس اور فارسی میں ایک دیوان زیادہ مشہور ہیں۔ اُن کے ایک رسالے کا نام رسالہ اورادِ دہ فصلی ہے جس میں نہ صرف صحاح ستہ بلکہ بیہقی کی سنن اور حاکم نیشاپوری کی مستدرک سے بھی احادیث کثیر تعداد میں نقل کی گئی ہیں۔ حسین نوشاۂ توحید نے ماہِ ذی الحجہ ۸۴۴ھ (مئی ۱۴۴۱ء) میں منیر میں وفات پائی۔ (۹۸)

احمد لنگرِ دریا (م ۸۹۱ھ / ۱۴۸۱ء)

احمد لنگرِ دریا بن حسن بن مظفر خانقاہِ منیر میں اپنے والد کے جانشین ہوئے تھے۔ اپنے دادا شیخ مظفر بلخی کو خوش کرنے کے لیے اُنہوں نے پوری مصابیح السنۃ صرف چھ مہینے میں حفظ کر لی تھی۔ احمد لنگر نے اپنی تصنیف مونس القلوب میں، جو اُن کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، صحیحین، مشارق الانوار

اور احادیث کی دوسری کتابوں سے بکثرت حوالے دیئے ہیں۔ ان کا انتقال ۸۹۱ھ/۱۴۸۶ء میں ہوا، (۹۹) اوران کے ساتھ ہی خانوادۂ مظفر بلخی کے مشہور علماء کا سلسلہ ختم ہو گیا جو خانقاہِ منیر میں شرف الدین منیری کے جانشین ہوتے رہے۔

سیّد علی ہمدانی اوران کا مکتبِ محدثین

امیر کبیر سیّد علی بن شہاب ہمدانی (۷۱۴ تا ۷۸۶ھ/۱۳۱۴ تا ۱۳۸۵ء)

کشمیر میں علمِ حدیث کا آغاز خراسان کے ایک جہاں گشت درویش امیر کبیر سیّد علی ہمدانی نے کیا تھا۔ وہ ۷۷۳ھ/۱۳۷۱ء میں اپنے سات سو معتقدین کے ساتھ کشمیر آئے تھے۔ اور اُنہوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کی۔ چنانچہ کشمیر میں اسلام کی اشاعت کا سہرا سیّد علی ہمدانی اور ان کے مریدوں کے سر ہے۔ (۱۰۰) اس علاقے میں سیّد علی ہمدانی کا اثر اس قدر زیادہ تھا کہ سلطان قطب الدین فرمانروائے کشمیر (۷۷۰ تا ۷۹۵ھ/۱۳۶۸ تا ۱۳۹۲ء) اُن کا مرید ہونے پر فخر کرتا تھا۔ سیّد علی ہمدانی نے اپنی عمر کے آخری سال کشمیر میں گزارے۔ ۶ رذی الحجہ ۷۸۶ھ (جنوری ۱۳۸۵ء) کو ایران جاتے ہوئے، راستہ میں وفات پائی اور ماوراء النہر میں بمقام ختلان مدفون ہوئے۔ (۱۰۱)

تصانیف:

سیّد علی ہمدانی نے حدیث میں مندرجہ ذیل رسائل لکھے ہیں۔

(۱) السبعین فی فضائل امیر المومنین: یہ ستر احادیث کا مجموعہ ہے جو فضیلتِ اہلِ بیعت کے بارے میں ہیں، اُن میں سے اکثر احادیث مسند فردوس الدیلمی سے لی گئی ہیں، جسے محدثین معتبر نہیں سمجھتے۔

(۲) اربعین امیریہ: یہ چالیس احادیث کا مجموعہ ہے، جو انس بن مالکؓ سے مروی ہیں اور ہمدانی نے شیخ نجم الدین الاذکانی (م ۷۷۸ھ) سے روایت کی ہیں۔ (۱۰۲)

ان رسائل کے علاوہ ہمدانی نے اپنے ایک اور رسالہ ذخیرۃ الملوک میں جو سیاسیات سے متعلق ہیں، بکثرت احادیث درج کی ہیں، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کو علمِ حدیث پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ (۱۰۳)

سیّد جمال الدین:

سیّد علی ہمدانی کے ایک مرید سیّد جمال الدین تھے، وہ بھی محدث تھے اور سلطان قطب الدین نے کشمیر میں درس دینے کے لیے ان کو مقرر کیا تھا۔(۱۰۴)

قاضی حسین شیرازی:

قاضی حسین شیراز کے رہنے والے تھے اور اپنے مرشد میر محمد ہمدانی کے ساتھ کشمیر آئے تھے۔ میر محمد ہمدانی سیّد علی ہمدانی کے فرزند تھے۔ سلطان سکندر نے جو سلطان قطب الدین کا جانشین ہوا تھا، حسین شیرازی کو قاضی مقرر کیا تھا۔(۱۰۵) قاضی حسین نے احادیثِ رتیبہ جمع کیں۔(۱۰۶) یہ نقلی حدیثیں تھیں جو ساتویں صدی ہجری کے ایک وضاع بابا رتن الہندی نے وضع کی تھیں۔ یہ شخص اتنا گستاخ تھا کہ اس نے صحابیِ رسولؐ ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا۔(۱۰۷)

خانقاہِ معلّیٰ اور اشاعتِ حدیث:

یہ خانقاہ سیّد علی ہمدانی کے فرزند میر محمد ہمدانی (م ۸۰۹ھ) کے لیے سلطان قطب الدین کے جانشین سلطان سکندر نے ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء میں تعمیر کروائی تھی۔ میر محمد اپنے والد کی وفات کے بعد تین سو مریدوں کے ساتھ کشمیر آئے تھے۔ یہ خانقاہ ایک درس گاہ تھی۔ دسویں صدی ہجری کے محدث حاجی کشمیری نے اس کو بہت ترقی دی اور یہ اشاعتِ حدیث کا مرکز بن گئی۔

شیخ زکریا ملتانی اور ان کا مکتبِ محدثین

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (۵۷۸ تا ۶۶۶ھ/۱۱۸۰ تا ۱۲۶۷ء)

ملتان کے مشہور ولی شیخ بہاء الدین زکریا (م ۶۶۶ھ) نے ملتان میں علمِ حدیث کی اشاعت کا مرکز قائم کیا اور ان کے بعد ان کے بیٹوں اور پوتوں نے یہ کام جاری رکھا۔ جمال الدین محدث اُچھی اور مخدوم جہانیاں سیّد جلال الدین بخاری علمِ حدیث کی اسی مرکز کی پیداوار تھے۔

جمال الدین محدث:

جمال الدین، شیخ بہاء الدین زکریا کے فرزند اور جانشین شیخ صدر الدین کے مرید تھے۔ کئی

سال تک وہ اپنے وطن اُچھ میں مدرس رہے۔ اور مشارق الانوار اور مصابیح السنۃ کا درس دیا کرتے تھے۔ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اُنہیں اتنی محبت تھی کہ وہ ہمیشہ موٹا کھردرا لباس پہنا کرتے تھے۔ جمال الدین آٹھویں صدی ہجری کے اوّل نصف میں بقیدِ حیات تھے۔(۱۰۸)

مخدوم جہانیاں سیّد جلال الدین بخاری (۷۰۷ تا ۷۸۵ھ)

جلال الدین الحسین بن احمد الحسینی بخاری ۷۰۷ھ/۱۳۰۷ء میں اوچ میں پیدا ہوئے تھے۔ اُچھ میں قاضی بہاء الدین اُچھی اور جمال الدین محدث سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ملتان گئے اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے مکتبِ حدیث میں داخل ہو گئے۔(۱۰۹) اس وقت یہ درس گاہ شیخ بہاء الدین کے پوتے شیخ ابوالفتح رکن الدین بن صدرالدین (م ۷۳۵ھ) تعمیر کرا رہے تھے۔ یہاں جلال الدین نے مشارق الانوار اور مصابیح السنۃ پر مشتمل ایک سال کے نصاب کی تکمیل کی اور پھر شیخ رکن الدین کے مرید ہو گئے۔ بعدازاں جلال الدین نے تصوف کی تعلیم وتربیت دہلی میں شمس الدین اودھی اور نصیر الدین چراغِ دہلی سے اور مدینہ منورہ میں عفیف الدین عبداللہ المطری سے نیز عراق اور مصر کے بعض دوسرے مشائخ سے بھی حاصل کی۔ سلطان محمد بن تغلق نے ان کو سندھ کا شیخ الاسلام بنا دیا، اور اس کے جانشین فیروز تغلق نے ان کی مریدی اختیار کر لی۔ مشہور ومعروف عالم اور ولی ہونے کے علاوہ جلال الدین محدث بھی تھے۔ احادیث پر اُن کی نظر بہت گہری تھی اور شیخ نظام الدین اولیاء کی طرح اُنہوں نے قرأت خلف الامام اور صلوٰۃ الجنازۃ علی الغائب پر عمل کیا۔(۱۱۰) جلال الدین حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۷۷۵ھ/۱۳۷۵ء اور ۷۸۱ھ/۱۳۷۹ء(۱۱۱) میں دہلی میں مختصر قیام کے دوران میں بھی اُنہوں نے مشارق الانوار اور مصابیح السنۃ کا درس دیا تھا۔ جلال الدین نے ۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء میں اوچ میں وفات پائی۔(۱۱۲)

مختصر جائزہ

نویں صدی ہجری کے وسط تک جون پور کی عظیم الشان درس گاہ میں احادیث کے صرف چند مجموعے موجود تھے۔ یعنی مشارق، مصابیح، مشکوٰۃ المصابیح اور طحاوی کی شرح معانی الآثار۔ ہمیں یہ علم ایک رسالہ شرف السادات(۱۱۴) کے تفصیلی مطالعہ سے ہوا ہے۔ یہ رسالہ جون پور میں

۸۰۷ھ/۱۴۰۶ء اور ۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء کے درمیان کسی وقت لکھا گیا تھا۔ اس میں احادیث کے نہ صرف مذکورۂ بالا مجموعوں سے بلکہ الہدایہ، تفسیر الکشاف اور تفسیر بیضاوی، فتاویٰ قاضی خاں، فتاویٰ تاتارخانیہ، الدرالمنثور، شرح فرائض سراجیہ از التفتازانی، البحرالمحیط، تاریخ النسب از ابوالقاسم، اخبار الثمار، فرائض الحلالیہ وغیرہ سے بھی احادیث نقل کی گئی ہیں۔ ایسی کتابوں سے جو حدیث پر نہیں ہیں اور جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت جون پور میں جوامع، (۱۱۵) مسانید (۱۱۶) یا سنن (۱۱۷) جیسی حدیث کی کوئی جامع کتاب موجود نہ تھی۔ چونکہ ۸۰۱-۸۰۲ھ/۹۹-۱۳۹۸ء میں تیمور کے حملے کی وجہ سے دہلی کے علمی ادارے زیادہ تر جون پور منتقل کر دیے گئے تھے، (۱۱۸) اور یہ شہر دہلی کا ثانی بن گیا تھا، اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دہلی میں بھی حدیث کی کتابوں کے بارے میں صورتِ حال جون پور سے مختلف نہ ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں دہلی میں جو علمِ حدیث کا مرکز تھا، حدیث کی کتابوں میں سے مشارق الانوار، مشکوٰۃ المصابیح اور شرح معانی لآ ثار کے سوا اور کوئی کتاب نہ تھی، اور مشکوٰۃ المصابیح کے متعلق بھی کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ یہ اس وقت دہلی میں دستیاب تھی۔

ذیل میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ زیرِ بحث تبصرہ مدت کے دوران میں حدیث کی مستند کتابیں شمالی ہند میں کب آئیں۔

۱۔ سنن ابوداؤد:

سنن ابوداؤد سے احادیث کا احاطہ سب سے پہلے جزجانی کی طبقاتِ ناصری میں ملتا ہے (۱۱۹) جو سلطان نصیر الدین محمود (۶۴۴ھ تا ۶۶۴ھ) کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ چنانچہ سنن ابوداؤد دہلی میں ساتویں صدی کے وسط میں لائی گئی ہوگی۔ اور چوں کہ اس کے بعد اس کتاب کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یا تو یہ گم ہوگئی یا کسی اور جگہ منتقل کر دی گئی۔

۲۔ مشارق الانوار:

ہند میں حدیث کی جو کتاب سب سے پہلے دستیاب ہوئی، وہ الصغانی کی مشارق الانوار تھی، اور اسے الصغانی کے ایک شاگرد برہان الدین محمود (م ۶۷۶ھ) ساتویں صدی ہجری کے وسط میں دہلی لائے تھے۔ ۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء تک شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنا نسخہ مکمل کر لیا، جسے آگے چل

کرانہوں نے حفظ بھی کرلیا۔ اس کے بعد سے مشارق الانوار ہند کے صوفی علماء میں روز بروز مقبول تر ہونے لگی۔ سلطان محمد تغلق (۷۲۵ تا ۷۵۲ھ) کے زمانہ میں حدیث کی یہی ایک کتاب دہلی میں موجود تھی۔ اس خیال کی تصدیق اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ سلطان قرآن پاک اور مشارق الانوار پر ہی اپنے عہدہ داروں سے حلفِ وفاداری لیا کرتا تھا۔(۱۲۰) ۸۰۱-۲ھ میں تیمور کے حملے کی وجہ سے سیّد محمد گیسودراز (م ۸۲۵ھ) جو نظام الدین اولیاء کے قائم کردہ روحانی سلسلہ کے نمائندہ تھے، جب دہلی کو چھوڑ کر دکن کے لیے روانہ ہوئے تو حدیث کی جو کتاب اُنہیں دستیاب ہوئی اور وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے، وہ مشارق الانوار ہی تھی۔ اس کتاب کی اُنہوں نے آگے چل کر ایک شرح بھی لکھی۔ مشارق الانوار نہ صرف دہلی میں پائی جاتی تھی بلکہ ہند کے دوسرے علمی مراکز مثلاً ملتان، اُچھ اور منیر میں بھی موجود تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت حدیث کی معلومہ کتابوں میں مشارق الانوار سب سے زیادہ مقبول تھی۔

۳۔ مصابیح السنۃ:

البغوی کی مصابیح السنۃ آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں ہند میں روشناس کرائی گئی تھی۔ اس خیال کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ مخدوم جہانیاں جلال الدین بخاری (م ۷۸۵ھ) دہلی میں اور جمال الدین محدث اُچھی، اُچھ میں اس کا درس دیا کرتے تھے۔ اور شرف الدین یحییٰ المنیری (م۷۸۲ھ) کی تصانیف میں بھی اس کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

۴۔ صحیحین:

مخدوم الملک شرف الدین پہلے عالم ہیں جنہوں نے اپنی تصانیف میں جو ۷۴۱ھ اور ۷۸۶ھ/۱۳۴۰ء اور ۱۳۸۴ء کے درمیان لکھی گئی تھیں۔(۱۲۱) صحیحین کے حوالے دیئے ہیں۔ تمام مقامات میں سے منیر کی خانقاہ میں صحیحین کی موجودگی ایک ایسا راز ہے جو آسانی سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ مخدوم الملک نے، جب وہ سنار گاؤں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اپنے اُستاد اور سسر ابوتو ّمہ سے صحیحین حاصل کی ہو اور ابوتو ّمہ یہ کتابیں ہند آتے ہوئے لے آئے ہوں۔ علاوہ ازیں مخدوم الملک کے پاس صحیح مسلم کا ایک زائد نسخہ بھی تھا جو اُنھیں آٹھویں صدی کے ایک عالم زین

الدین نے دیا تھا۔ اس کے علاوہ شیخ الاسلام معز بہاری نے اپنے بیٹے نوشائے توحید کو بھی صحیح مسلم کا ایک نسخہ بطور انعام دیا تھا۔

۵۔ سنن اربع۔ سنن البیہقی اور المستدرک:

۷۸۲ھ/۱۳۸۱ء میں مخدوم شرف الدین کی وفات تک منیر کی خانقاہ میں صرف صحیحین، مصابیح السنۃ، مشارق الانوار اور مسند ابویعلی الموصلی موجود تھیں۔ اس کے بعد سنن اربع، (۱۲۲) سنن البیہقی اور حاکم نیشاپوری کی المستدرک نوشائے توحید خانقاہ کے لیے حجاز سے لے آئے تھے۔

۶۔ شرح معانی الآثار:

طحاوی (م ۳۲۰ھ) کی معانی الآثار سے آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں دہلی میں واقفیت ہوئی تھی۔ کیوں کہ شرف محمد عطاری کی فوائد فیروز شاہی میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے جو فقہ کی ایک کتاب ہے، اور سلطان فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ) کے نام معنون کی گئی ہے۔ (۱۲۳) یہ کتاب جون پور میں بھی موجود تھی۔

۷۔ مسند فردوس الدیلمی:

امیر کبیر سیّد علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ) یہ کتاب کشمیر لے آئے تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کے سوا کسی اور نے اس سے استفادہ نہیں کیا۔ ہمدانی نے السبعین مرتب کرتے وقت اس سے استفادہ کیا تھا۔

۸۔ مشکوٰۃ المصابیح:

تبریزی (م ۷۳۹ھ) کی مشکوٰۃ المصابیح غالباً نویں صدی ہجری کے اوائل میں ہند لائی گئی تھی۔ اور اس وقت یہ جون پور میں دستیاب ہوسکتی تھی۔

مختصر یہ کہ زیر تبصرہ دور میں حدیث کی مندرجہ ذیل کتابیں شمالی ہند کے مختلف علمی وتہذیبی مختلف علمی وتہذیبی مراکز میں موجود تھیں۔

۱۔ صحاح ستہ

۲۔ مصابيح السنة

۳۔ مشارق الانوار

۴۔ مشكوٰاة المصابيح

۵۔ شرح معاني الآثار

۶۔ سنن البيهقي

۷۔ المستدرك للحاكم

۸۔ مسند فردوس

۹۔ مسند ابويعلى الموصلي

حواشی:

(۱) فرشتہ، تاریخ، ج ۱، ص ۲۷۔

(۲) کیمبرج، ہسٹری آف انڈیا، مرتب ہیگ، ج ۳، ص ۲۶۔

(۳) لاہور، سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۲ھ/۱۰۴۱ء میں فتح کیا تھا۔ فرشتہ تاریخ، ج ۱، ص ۳۱۔

(۴) آرنلڈ، کتابِ مذکور، ص ۸۱-۲۸۰۔

(۵) غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۰۲ء، ج ۲، ص ۲۳۰، فقیر محمد، حدائق الحنفیہ، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۴ء، طبع ثانی، ص ۲۳، ۱۷۹۔ رحمان علی نے تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۷۹ میں لکھا ہے کہ اسماعیل ۳۹۵ میں مسعود غزنوی (۳۲-۴۲۱) بن محمود غزنوی کے عہد میں لاہور آئے تھے۔ انہوں نے غلطی سے محمود ۳۸۸-۴۲۱ کے بجائے مسعود لکھ دیا ہے۔

(۶) ورق، ۴۹۷۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۴۸۔

(۷) طبقاتِ ناصری کے مطابق ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء، ایلیٹ، ہسٹری، ج ۲، ص ۲۹۷۔

(۸) تجلی نور تذکرۂ مشاہیر جونپور، جادو پریس، جون پور، ص ۲۹۔ معارف، ج ۲۵، ش ۵، ص ۳۴۶۔

(۹) مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو، ابن العماد، شذرات، ج ۴، ص ۵۶-۱۵۵۔

(۱۰) سمعانی، انساب، و ۴۹۷۔ معارف، ج ۲۴، ش ۴، ص ۲۴۸۔

(۱۱) ایضاً۔

(۱۲) مارگولیوتھ Introduction to Kitab al-Ansab: Margoliouth

(۱۳) سمعانی حوالہ مذکور۔

(۱۴) صوفی، المنہاج، لاہور، ۱۹۴۱ء، ص ۱۳-۱۴۔

(۱۵) الندوہ، لکھنؤ، فروری ۱۹۰۹ء، مضمون، اسلامی انصابِ درس از عبدالحی ندوی۔ فروری ۱۹۴۱ء، مضمون، شیراز ہند پورب از سیّد سلیمان ندوی، ص ۱۰۔ سلیمان ندوی، ہندستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۲، ۳، ابوالحسنات ندوی۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، اعظم گڑھ، ۱۹۳۶ء، ص ۸۵-۸۶۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۵۴-۲۵۳۔

(۱۶) منہاج السراج، طبقاتِ ناصری، ص ۴۱-۲۳۹۔

(۱۷) سیّد سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، ص ۲ و مابعد۔

(۱۸) طبقاتِ ناصری، ص ۱۲۴۔ عبداللہ محمد بن عمر الغ خانی ظفر الوالہ بمظفر والہ، مرتبہ ڈینی سن راس (Denison Ross)، بعنوان An Arabic History of Gujrat، لندن، ۱۹۲۱ء، ج ۲، ص ۶۹۵۔

(۱۹) منہاج السراج، طبقاتِ ناصری، ص ۸۹-۱۸۸۔ الف خانی، کتاب مذکور، ص ۲۰۳۔ ابوالحسنات، کتابِ مذکور، ص ۱۷-۱۸۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ۲، ص ۳۴۴۔ نریندر ناتھ لاء Promotion of Learning in India During Mohummedan Rule، لندن، ۱۹۱۶ء، ص ۲۲

(۲۰) ابوالحسنات، کتابِ مذکور، ص ۳۳۔

(۲۱) ایضاً، ص ۹۰-۹۲۔ صوفی، المنہاج، ص ۱۶-۱۷، ۲۵۔

(۲۲) معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۵۴-۲۵۳۔

(۲۳) ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۲ء، ص ۵۴-۳۵۲۔

(۲۴) ایضاً، ص ۲۹، ۷، ۹۔ الغ خانی، کتابِ مذکور، ج ۲، ص ۳۲-۸۳۱، ۸۱۰، نیز ج ۳، XCVII۔

(۲۵) ذہبی، تجرید، ج ۲، ص ۱۲۶۔

(۲۶) امیر حسن، فوائد الفواد، اُردو ترجمہ از غلام احمد خاں، رہتک، ۱۳۱۳ء، ص ۵۳-۱۵۲۔ فرشتہ تاریخ، ج ۲، ص ۴۰۴ و مابعد۔ بہار غلطی سے مہیار چھپ گیا ہے۔ عبدالحق دہلوی، اخبار الاخیار، میرٹھ، ۱۲۷۷ء، ص ۲۶-۲۸۔ داراشکوہ، سفینۃ الاولیاء، دہلی، ۱۲۶۹ء، ص ۱۹۶۔ غلام سرور، حدیقۃ الاولیاء، لاہور، بہاء الدین زکریا کا تذکرہ، غلام سرور، خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۱۹-۲۶۔ رحمان علی، کتابِ مذکور، ص ۳۳۔ ندوی، کتابِ مذکور، ص ۲۳۹، ۳۵۵۔ معارف، ج ۲۲، ص ۵، ص ۲۹، ۲۸، ۳۔

(۲۷) غلام احمد، اُردو فوائد الفواد، ص ۲۰۰۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۴۷، جرجاتی غلطی سے جرجانی چھپ گیا ہے۔ منہاج السراج، طبقاتِ ناصری، ص ۱۷۲۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ۲، ص ۲۵۹ و مابعد۔ الغ خانی، کتابِ مذکور، ج ۳، Lx۔

(۲۸) ص ۲۶-۳۲۵۔

(۲۹) معارف، ج ۲۴، ش ۴، ص ۲۵۱۔

(۳۰) غلام احمد، اُردو فوائد الفواد، ص ۵۳-۲۵۲۔

(۳۱) ایضاً، ص ۵۸-۲۵۷۔ میر خورد، سیر الاولیاء، دہلی، ۱۸۸۵ء، ص ۱۰۵۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۶۸۔ فقیر محمد، حدائق الحنفیہ، ص ۲۶۴۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۳۳۔ عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر ج ۱، تذکرہ برہان الدین محمود۔

(۳۲) میر خرد، سیر الاولیاء، ص ۱۰۴-۱۰۶۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۴۵، غلام سرور، خزینتہ الاصفیاء، ج ۱، ص ۳۱۴۔ عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر، ج ۱، تذکرہ محمد بن احمد بن محمد المرکلی۔ رحمان علی۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۴۵۔ معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۲۹۔

(۳۳) غلام احمد، اُردو فوائد الفواد، ص ۳۹-۱۳۷۔ رضی الدین کو غلطی سے ان کا ہم نام رضی الدین الحسن بن محمد الصغانی (م ۶۵۰ھ) سمجھ لیا ہے۔

(۳۴) عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر، ج ۱، تذکرہ شرف الدین دہلوی، کلکتہ ریویو، اپریل-جون، ۱۹۳۹ء، ص ۹۷-۱۹۶۔

(۳۵) برنی، تاریخِ فیروز شاہی، ص ۴۶۵۔

(۳۶) ابنِ بطوطہ، تحفۃ النظار فی غرائب الامسار و عجائب الاسفار، مرتبہ ڈفریمری (Defremery)، مع فرانسیسی ترجمہ، پیرس، ۱۹۲۲ء، ج ۴، ص ۳۴۳۔ ڈاکٹر مہدی حسین نے رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق میں بیان کیا ہے کہ محمد بن تغلق نے ابنِ بطوطہ کے دہلی آنے سے قبل ہی معقولات کا مطالعہ ترک کر دیا تھا۔ اور ابنِ بطوطہ نے سلطان پر فلسفہ کا کوئی اثر نہیں پایا۔ لیکن یہ خود ابنِ بطوطہ کے بیان کے خلاف ہے۔ اس نے لکھا ہے:

فقد رایت ملك الهند يتذاكر بين يديه بعد صلوة الصبح في العلوم المعقولات خاصة۔ سفر نامہ مذکور، ج ۴، ص ۳۴۳۔

(۳۷) برنی، تاریخِ فیروز شاہی، ص ۴۶۶: از اثر قساوتِ علمِ معقولات واز فقدان علمِ منقولات بود۔

(۳۸) معقولات کے برعکس منقولات میں علمِ قرآن و حدیث اور ان پر مبنی دوسرے علوم شامل ہوتے ہیں۔

(۳۹) ہیگ، کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، ج ۳، ص ۳۷-۱۳۶۔

(۴۰) میر خورد، سیر الاولیاء، ص ۵۳۱، الغ خانی، کتاب مذکور، ج ۳، ص ۵۷-۸۵۵۔ فرشتہ تاریخ، ج ۲، ص ۹۸-۳۹۷۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۵۵-۲۵۴۔ اور ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۳۔

(۴۱) فریدالدین گنج شکر کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج ۴، ص ۶۳۵۔ تھارنٹن Thornton: India Gazetteer، ص ۷۵۷۔

(۴۲) غلام احمد، اُردو فوائد الفواد، ص ۴۸۔ غلام سرور، خزینۃ، ج ۱، ص ۲۲۹۔

(۴۳) غلام احمد اُردو فوائد الفواد، ص ۹۵-۹۶۔ امیر خورد، سیر الاولیاء، ص ۹۴ و مابعد۔ فرشتہ، تاریخ، ج ۲، ۳۹۰ و مابعد۔ جامی، نفحات الانس، ص ۵۳-۵۲۴، عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۵۲ و مابعد۔ ابوالفضل، آئینِ اکبری، نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۹۳ء، ج ۳، ص ۱۷۰۔ داراشکوہ، سفینۃ الاولیاء، ص ۹۲۔ عبدالرحمٰن چشتی، مراۃ الاسرار، مخطوطہ، بانکی پور، تذکرہ محمد بن احمد بن علی دہلوی۔ غلام سرور، خزینۃ، ج ۱، ص ۲۲۹ و مابعد۔ فقیر محمد، حدائق الحنفیہ، ص ۲۷۷ و مابعد۔ رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۴۰۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ص ۴۸-۱۲۲۔ بیل Oriental Biographical Dictionary:Beale، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۸۱ء، ص ۲۱، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۳، ص ۹۳۲۔

(۴۴) امیر خورد، سیر الاولیاء، ص ۱۰۴-۱۰۵۔

(۴۵) امیر حسن، فوائد الفواد، نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۹۴ء، ص ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۱۵، ۱۳۲۔

(۴۶) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۹۰، ۹۱۔ عبدالرحمٰن چشتی، مراۃ الاسرار، مخطوطہ، ۲۴۷ الف، برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۵۳۔ غلام سرور، خزینۃ، ج ۱، ص ۳۴۹۔ سبحۃ المرجان، ص ۱۹۔ فقیر محمد، حدائق الحنفیہ، ۸۵-۲۸۴۔ رحمان علی، تذکرۂ علمائے ہند، ص ۸۶-۸۷۔ عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر، ص ۱۴۷۔

(۴۷) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۹۰۔

(۴۸) سالت العلم من احیاک حقا : قال العلم شمسُ الدین یحییٰ

(۴۹) معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۳۱۔ نزہتہ الخواطر۔

(۵۰) اصول السماع کے اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو، عبدالحی حسنی، ۱۰۵-۱۰۶۔

(۵۱) اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں ہے۔ جس کا نمبر ۴۵۷، فارسی مخطوطات ہے۔ اور دوسرا نسخہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے پاس ہے۔ معارف، ج ۲۲، ش ۶، ص ۴۱۶۔

(۵۲) معارف حوالۂ مذکور۔

(۵۳) امیر خورد، سیر الاولیاء، ص ۷۵-۲۷۳۔ الغ خانی، کتاب مذکور، ج ۳، ص ۸۵۶، عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۸۵-۸۶۔ الاخیار، ص ۸۵-۸۶۔ محمد سرور، خزینہ، ج ۱، ۳۵۱۔ رحمان علی، تذکرۂ علمائے ہند، ص ۶۱-۱۶۰۔ عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر، ص ۰۶-۱۰۳۔

(۵۴) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۹۶-۹۷۔

(۵۵) عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر، ص ۶۴۔

(۵۶) برنی، تاریخ، فیروز شاہی، ص ۱۰۲، ۵۱۱۔

(۵۷) ایضاً، ص ۱۰۹۔

(۵۸) ایضاً، ص ۴۶۵۔

(۵۹) ایضاً، ص ۶۰۳۔ محمد سرور، خزینہ، ج ۱، ص ۳۴۶ میں ان کا سنِ وفات ۷۳۸ ہجری لکھا ہے جو درست نہیں۔ ان کے حالات محمد سرور، خزینہ، ج ۱، ص ۶۰۲۔ رحمان علی تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۷ اور بیل کی کتاب مذکور، ص ۲۸۸ میں بھی موجود ہے۔

(۶۰) امیر خورد، سیر الاولیاء، ص ۱۰۲

(۶۱) ج ۱، ص ۳۲۵۔

(۶۲) امیر خورد سیر الاولیاء، ص ۲۷۵ و مابعد، عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۹۱، ۹۲۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۲۷۶۔ رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۔ ۲۲۱۔ عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ص ۶۴۔ ۱۶۳۔

(۶۳) ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو فصیح الدین کی تصنیف Sharqi Monuments of Jaunpur، جون پور، ۱۹۲۲ء، ص ۹۷۔

(۶۴) تجلی نور، ص ۲۲۔ معارف، ج ۲۵، ش ۵، ص ۳۴۶۔ عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ص ۱۷۵۔

(۶۵) معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۳۱۔ خیر المجالس، ۵۶۔ ۷۵۵ میں ایک شاعر حمید نے لکھی تھی، جو حضرت نظام الدین اولیاء کا مرید تھا۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۸۰۔

(۶۶) امیر خورد، سیر الاولیاء، ص ۲۳۶ و مابعد۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۷۴۔ محمد سرور، خزینہ، ج ۱، ص ۳۵۴۔ رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۶۔

(۶۷) فرشتہ، تاریخ، ج ۱، ص ۳۱۶۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۱۲۳ و مابعد۔ محمد سرور، خزینہ۔ ص ۸۲۔ ۳۸۱۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۸۲۔ نزھۃ، عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ج ۳، (مخطوطہ) تذکرہ محمد بن یوسف بن علی الحسینی الدہلوی، بیل۔ کتاب مذکور، ص ۱۸۷۔ ریو Persian Manuscripts:Rieu، ج ۱، ص ۳۴۷ بی۔

(۶۸) عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، حوالۂ مذکور۔

(۶۹) ایضاً۔

(۷۰) ایضاً۔

(۷۱) ایضاً۔

(۷۲) ایضاً۔

(۷۳) حاجی خلیفہ، کتاب مذکور، ج ۶، ص ۱۱۔

(۷۴) ریو، فہرست مذکور، ج ۱، ص ۴۰۔ ۴۱۔

(۷۵) نمبر ۶۱۱ و ۳۴۴۔

(۷۶) عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ص ۷۱۔

(۷۷) ہنٹر Imperial Gazetteer: Hunter، آکسفورڈ، ۱۹۰۸ء، ج ۱۴، ص ۳۱۷۔

(۷۸) فرشتہ، تاریخ، ج ۴، ص ۳۰۶، عبدالحق، اخبار الاخیار، ۷۰-۱۶۹۔ آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان، ص ۲۹، مآثر الکرام، ص ۸۹-۱۸۸۔ نواب صدیق حسن، ابجد العلوم، بھوپال، ۱۲۹۵ء، ص ۸۹۳۔ تقصار المجود، بھوپال، ۱۲۹۸، ص ۱۶۴۔ محمد سرور، خزینہ، ج ا، ص ۹۲-۳۹۰۔ ثناء اللہ، تذکرۂ علمائے جونپور، کلکتہ، ۱۹۳۴ء، ص ۱۹، ۲۳۔ تجلی نور، ج ۲، ص ۳۳۔ فقیر محمد، حدائق۔ ص ۳۱۹، رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۸۸-۸۹، سلمان ندوی، حیاتِ شبلی، ص ۱۱، ۱۳، اسٹوری Persian Literature: Storey، لندن، ۱۹۲۷ء، ج ا، ص ۹-۱۰، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ا، ص ۹۳۲۔

(۷۹) بروکلمن Geschiechie لائیڈن، ۱۹۳۳ء، ج ا، ص ۱۰-۳۰۹۔

(۸۰) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص تذکرہ شمس الدین خواجگی۔

(۸۱) خواجگی کی قبر پر خود ان کا کہا ہوا یہ منظور کتبہ لگا ہوا تھا:

برائے خدا اے عزیزانِ من — نویسید برگورِ من ایں سخن

کہ چوں خواجگی در تہِ خاک شد — نکوشد زحکمِ جہاں پاک شد

(۸۲) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ۱۷۰۔

(۸۳) اس نام کو کئی طرح پڑھا گیا ہے: مَنیرَ، منرَ، مُنَیر وغیرہ۔ صحیح تلفظ کے لیے ملاحظہ ہو، عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، حیدرآباد، ۱۳۵۰ء، ص ۹۔

(۸۴) عبدالرحمٰن چشتی، مراۃ الاسرار، و ۴۶۲ الف۔ سعادت خدمت، سلطان المشائخ، نظام الدین اولیاء دریافت۔ سلطان المشائخ برگ تنبول دادو رخصت فرمود۔ اور عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ص ۶، معارف، ج ۲۳، ش ۴، ص ۲۹۷۔

(۸۵) یہ رکن الدین فردوسی (م ۷۲۴ء) کے مرید تھے۔ جنہوں نے ہند میں فردوسی سلسلہ کو رائج کیا۔ محمد سرور، خزینہ، ج ۲، ص ۲۸۶۔

(۸۶) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۱۰۹۔ عبدالرحمٰن چشتی۔ مراۃ الاسرار، و ۴۶۱ الف، ۴۶۱ ب۔ محمد سرور، خزینہ، ج ۲، ۲۹۰ و مابعد۔ رحمان علی۔ تذکرہ علماء، ص ۸۴۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ص ۸-۱۰۔ بیل کتاب مذکور، ص ۲۴۹، ۲۵۴۔ فہرست کتب بانکی پور، ۱۶-۲۵۔ ابوالفضل، آئینِ اکبری، ج ۲، ص ۲۱۹۔ ایس۔ کے۔ رحمٰن، کلکتہ ریویو، اپریل-جون ۱۹۳۹ء، ص ۱۹۵، ۲۱۴، مضمون شیخ شرف الدین احمد یحییٰ آف مَنیرَ، معارف، ج ۲۳، ش ۴، ص ۲۹۷۔

(۸۷) ان علوم کی تفسیر کے لیے ملاحظہ ہو، صدیق حسن ابجد العلوم، ص ۲۸۹، ۳۵۴۔ خوفی، مفتاح السنۃ، ص ۱۴۵، ۱۶۰۔

(۸۸) ان کی تصانیف کے لیے ملاحظہ ہو، کلکتہ ریویو، ص ۲۱۰، ۲۱۱۔

(۸۹) کلکتہ ریویو، ص ۱۹۷، ۲۱۱۔ معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۲-۳۳۱۔ شاہ نجم الدین، معارف، ج ۲۳، ش ۴، ص ۹۸-۲۹۵، مضمون: حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری اور علم حدیث۔

(۹۰) ملاحظہ ہو، خود ان کا رسالہ خوانِ پُرنعمت، احمد پریس، پٹنہ، ۱۳۲۱ء۔ مجلس سوم، ص ۸۔

(۹۱) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر۔

(۹۲) معارف، ج ۲۳، ش ۴، حوالہ مذکور۔

(۹۳) یہ آٹھویں صدی ہجری کے ایک عالم تھے۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ص ۴۶۔

(۹۴) ایضاً، معارف، ج ۲۳، ش ۴، ص ۲۹۶۔

(۹۵) معارف، ج ۲۳، س ۴، ص ۲۹۸۔

(۹۶) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۱۱۰، چشتی، مراۃ الاسرار، و ۵۲۰ الف۔ محمد سرور، خزینہ، ج ۲، ص ۲۹۹۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، (مخطوطہ) ج ۳، تذکرہ حسین بن معز البہاری۔ وحشی نگرامی، وفیات الاخیار، لکھنؤ، ۱۳۲۰ھ، ص ۹۹۔

(۹۷) محمد شعیب، مناقب الاصفیاء، ص ۱۵۰۔ حوالہ در معارف، ج ۲۴، ش ۴، ص ۲۵۱۔

(۹۸) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۱۱۴ و مابعد۔ عبدالحی حسنی۔ نزہۃ الخواطر (مخطوطہ) ج ۳، تذکرہ حسین بن معز بہاری۔ معارف، ج ۲۳، ش ۴، ص ۹۹-۲۹۸۔ ج ۲۴، ش ۴، ص ۲۵۱۔

(۹۹) معارف، ج ۲۳، ش ۴، ص ۲۹۹۔

(۱۰۰) آرنلڈ، کتابِ مذکور، ص ۲۹۲۔

(۱۰۱) جامی، نفحات، ص ۲۹۹، ۴۰۰۔ خواجہ اعظم شاہ، تاریخِ کشمیر، لاہور، ۱۳۰۳ھ، ص ۳۶-۳۷۔ چشتی، مراۃ الاسرار، و ۳۲۳ و مابعد۔ محمد سرور، خزینہ، ج ۲، ص ۲۹۳ و مابعد۔ فقیر محمد، حدائق، ۹۸-۲۹۷۔ رحمان علی۔ تذکرۂ علماء، ص ۱۴۸۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ص ۸۷ و مابعد۔ فرشتہ، تاریخ، ج ۲، ص ۳۲۹۔ بیل، کتابِ مذکور، ص ۲۳۸۔ نیول History of cashmere:Newel، جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج ۲۳، ص ۴۱۴، ج ۲۳، ص ۲۷۸۔ مزید حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو ریو، فہرست مذکور، ج ۲، ص ۴۴۷۔

(۱۰۲) بروکلمن، کتابِ مذکور، ج ۲، ص ۲۱۱۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ص ۸۹-۹۰۔

(۱۰۳) نسخۂ بانکی پور، نمبر ۹۴۳، ج ۹، ۱۹۴۔

(۱۰۴) اعظم شاہ، تاریخِ کشمیر، ص ۳۹۔ محمد سرور، خزینہ، ج ۲، ص ۲۹۷۔

(۱۰۵) اعظم شاہ، تاریخِ کشمیر، ص ۳۹۔

(۱۰۶) بروکلمن، کتاب مذکور، ص ۲، ص ۲۶-۶۲۵۔

(۱۰۷) عسقلانی، اصابہ، ج ا، ص ۱۰۸۷-۱۱۰۱۔

(۱۰۸) محمد سرور، خزینہ، ص ۱۱، ۳۷۔

(۱۰۹) عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر۔

(۱۱۰) ایضاً، ص ۲۹، محمد سرور، خزینہ، ج ۲، تذکرہ جلال الدین بخاری۔

(۱۱۱) عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ج ۳۔ تذکرہ علاء الدین بن علی بن السعد دہلوی۔

(۱۱۲) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۳۵-۱۳۳۔ عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ص ۲۸-۳۵، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ا، ص ۱۰۰۳۔

(۱۱۳) لاء، کتاب مذکور، ص ۱۰۲۔

(۱۱۴) مخطوطہ، بانکی پور، نمبر ۱۱۷۹ (فارسی مخطوطات)۔

(۱۱۵) صحیح البخاری اور جامع الترمذی۔

(۱۱۶) مسند احمد بن حنبل۔

(۱۱۷) سنن ابو داود، النسائی وغیرہ۔

(۱۱۸) الندوہ، مارچ ۱۹۴۱ء۔ سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، ص ۱۱-۱۳۔

(۱۱۹) ص ۲۶-۳۲۵۔ معارف، ج ۲۴، ش ۴، ص ۲۵۱۔

(۱۲۰) برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۹۵۔

(۱۲۱) کلکتہ ریویو، ج ۸۱، ص ۲۱۰۔

(۱۲۲) سنن ابوداود، النسائی، ابنِ ماجہ اور جامع الترمذی۔

(۱۲۳) فہرست بانکی پور، ج ۱۴، نمبر ۱۲۲۵۔

باب چہارم

ہند میں علمِ حدیث کا احیاء

(۸۲۰ تا ۹۹۲ھ / ۱۴۱۷ تا ۱۵۸۴ء)

فصل اوّل: حجاز سے نشرِ احادیث

آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں دکن میں بہمنی سلطنت اور نویں صدی ہجری کے اوائل میں گجرات میں مظفر شاہی سلطنت کے قیام سے ان علاقوں میں علمِ حدیث کی ترویج و ترقی کے ہزار سالہ دور کا آغاز ہوا۔ اور پھر یہاں سے علمِ حدیث ترقی کر کے شمالی ہند میں بھی پھیلنے لگا۔ ان ہمسایہ مسلم سلطنتوں کے اقتدار کے ۱۸۰ سال درحقیقت علمی اور ثقافتی ترقی کا شاندار دور ثابت ہوئے۔ ان دونوں سلطنتوں کے روشن خیال اور شائستہ فرماں رواؤں نے اپنے ملک میں علوم وفنون کو فروغ دینے کے لیے حیرت انگیز جوش و انہاک کا مظاہرہ کیا۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، اُنہوں نے دُور و نزدیک تمام ملکوں کے علماء کو اپنے دارالسلطنت آنے کی دعوت دی اور نہایت فیاضی سے ان کی سرپرستی کی۔ ہند میں مسلمانوں کے جو خاندان حکمراں ہوئے، ان میں فیروز شاہ بہمنی (۸۰۰ تا ۸۲۵ھ / ۱۳۹۷ تا ۱۴۲۲ء) اور مظفر شاہ ثانی فرمانروائے گجرات (۹۱۷ تا ۹۳۲ھ / ۱۵۱۱ تا ۱۵۲۵ء) جیسے اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے حکمران چند ہی ہوئے ہیں۔ فیروز شاہ بہمنی کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ اور وہ ہر سال گوآ اور چول کی بندرگاہ سے مختلف بحری جہاز بھیجتا تھا، خاص اس مقصد کے لیے کہ مشہور و ممتاز علماء کو دعوت دے کر اس کے دربار میں لایا جائے۔ (۱) مظفر شاہ ثانی نے علمی ترقی کے لیے بڑے جوش و انہاک کا ثبوت دیا۔ اور ایران، عرب اور ترکی سے عالم و ادیب اس روشن خیال حکمران کے عہد میں گجرات آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ (۲) نہ صرف سلاطین بلکہ متعدد وزیر بھی تعلیم کے ماہر اور علوم کے سرپرست کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ان میں دکن کے محمود گاوان اور گجرات کے آصف خاں خاص

طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں محدث اور عالم تھے، اور اپنے دشوار سرکاری فرائض سے گراں بار ہونے کے باوجود اُنھوں نے علمی کاموں میں بڑے جوش وخلوص کے ساتھ حصہ لیا۔ اور اپنی آمدنی کا کثیر حصہ اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں غریب اور مفلوک الحال اہلِ علم کی پرورش پر صرف کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بہمنیوں کے عہد میں دکن اور مظفر شاہیوں کے عہد میں گجرات سرپرستی کے خواہاں عالموں، ادیبوں، شاعروں اور صاحبِ کمال لوگوں کا مرجع بن گئے تھے۔ چنانچہ حجاز اور مصر کے محدثین ان دونوں سلطنتوں میں جمع ہونے لگے۔ کثیر تعداد میں محدثین کی آمد کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان حکمرانوں نے حدیث اور سنتِ رسولؐ سے گہری محبت وعقیدت کا اظہار کیا۔ اور دوسرا یہ کہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے اب تک جس طویل اور خطرناک برّی راستے سے سفر کیا جاتا تھا، اس کے بجائے حاجیوں کے لیے بحیرۂ عرب میں سفر کرنے کا ایک سہولت بخش راستہ کھول دیا گیا تھا۔ چنانچہ سلطان کے حکم سے حج کے موسم میں جنوبی ہند اور بالخصوص گجرات کی بندرگاہوں سے جنھیں بابِ مکہ کہا جانے لگا تھا، باقاعدہ طور پر جہاز چلانے کا انتظام کیا گیا تھا۔(۳) جنوبی ہند کی بندرگاہوں سے عربوں کی تجارت طویل مدت سے جاری تھی۔ اب اس میں مزید اضافہ ہو گیا، اور عرب کے ساتھ جو قریبی روابط قائم ہوئے اور مذکورہ بالا خاندانوں کے سلاطین نے محدثین کی جو فیاضانہ سرپرستی کی، اس سے ہند میں علمِ حدیث کی اشاعت میں بہت مدد ملی۔

ہندی محدثین کے آنے اور یہاں سکونت اختیار کرنے کی تفصیلات بیان کرنے سے قبل یہ معلوم کر لینا بے محل نہ ہوگا کہ اسلامی فتوحات سے قبل جنوبی ہند میں جو عرب تاجر اور مبلغ آئے تھے اور اپنی بستیاں قائم کر لی تھیں، ان کی کوششوں سے اس علاقہ میں دینی تعلیم کا نفاذ ہوا تھا یا نہیں؟(۴)

جنوبی ہند میں دینی تعلیم کے آغاز و اشاعت کی تاریخ پر لاعلمی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تاہم تیسری صدی ہجری میں مالابار کے ساحلی علاقے میں مسجدوں کی تعمیر(۵) سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا انتظام بھی ضرور کیا گیا ہوگا۔ کیوں کہ نومسلموں کو بہرحال اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصول وعبادات سے واقف کرانا ضروری تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب، نومسلموں کو اچھا مسلمان بنانے کے بھی ایسے ہی آرزومند تھے جیسے کہ غیر مسلموں کو

مسلمان کرنے کے، اور اپنے اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عربوں نے نومسلموں کی بستیوں میں مسجدیں تعمیر کی تھیں۔ مسجد سے عموماً دو مقاصد پورے ہوتے تھے۔ اولاً تو یہ کہ یہاں نماز ادا کی جاتی تھی، اور اس مقصد کے لیے مسلمان جمع ہوتے تھے۔، اور دوسرے یہ کہ مسجد میں دینی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ چنانچہ اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی اشاعت بھی ہوتی رہتی تھی۔ اور اس زمانے میں مسجد تعمیر کرنے کا لازمی نتیجہ ایک دینی ادارے کے قیام کی شکل میں نکلتا ہے۔(۶) اس لیے ہم بجا طور پر یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ جنوبی ہند میں دینی تعلیم کا آغاز تیسری صدی ہجری میں ساحلِ مالابار میں مساجد کی تعمیر کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ آگے چل کر اسلام کی اشاعت اور عربوں کی نوآبادیاں قائم ہو جانے کے باعث جب اس علاقے میں شاندار مسجدیں تعمیر کی گئیں تو اُنہوں نے اسلامی تعلیم کے مراکز کی شکل اختیار کر لی تھی۔(۷) مزید یہ کہ چوتھی صدی ہجری میں زمورین کی سلطنت میں قاضی کا عہدہ قائم ہو جانے سے(۸) بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس علاقے میں اسلامی شریعت پر روز بروز زیادہ عمل کیا جانے لگا تھا۔

ابنِ بطوطہ کے بیان سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ جنوبی ہند میں مسلمانوں کی نوآبادیوں میں اسلامی علوم کا آغاز تیسری صدی ہجری میں ہوا، اور اس کے بعد یہ برابر ترقی کرتے گئے۔ ابنِ بطوطہ کے عہد یعنی آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں اسلامی علوم کو اس قدر فروغ ہو گیا تھا، اور طلباء کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ مسلمانوں کی ایک نوآبادی ہنور میں (جو موجودہ صوبہ بمبئی کے ضلع کنارا میں واقع ہے) لڑکیوں کے لیے تیرہ اور لڑکوں کے لیے تئیس مدرسے قائم کرنے پڑے تھے۔ اس نوآبادی کی خواتین عام طور پر قرآن کی حافظ تھیں۔ اور دینی علوم کی مقبولیت کا یہ ایسا غیر معمولی ثبوت ہے جس کی نظر اس زمانے میں کہیں اور مشکل سے ملے گی۔(۹) منجرور میں جواب منگلور کہلاتا ہے اور جنوبی کنارہ میں واقع ہے، ابنِ بطوطہ کی ملاقات ایک شافعی قاضی بدرالدین معبری سے ہوئی تھی جو اپنے سرکاری فرائض انجام دینے کے علاوہ شہر کے مدرسہ میں درس بھی دیا کرتے تھے۔(۱۰) جامع ہیلی میں ایسے متعدد طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے، جن کے لیے قیام و طعام کا انتظام مفت کیا گیا تھا۔(۱۱) ابنِ بطوطہ نے کالی کٹ میں ایسی مسجدیں بھی دیکھیں جہاں دینی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی فتوحات سے کچھ پہلے جنوبی ہند کی مسلم نوآبادیوں میں مذہبی تعلیم کتنی زیادہ پھیلی ہوئی تھی۔ اور اب دیکھنا یہ ہے کہ دینی تعلیم کے فروغ میں علمِ قرآن کے ساتھ علمِ حدیث کی تعلیم بھی کہاں تک دی جاتی تھی۔

شمالی ہند کے مسلمانوں کے برعکس جو فقہ حنفی کے پیرو تھے، جنوبی ہند کے مسلمان شافعی تھے۔(۱۲) اوّل الذکر وسطی ایشیا کے اسلامی علوم یعنی فقہ کی تعلیم پر زور دیتے تھے اور مؤخر الذکر حجاز کے اسلامی علوم یعنی حدیث کی تعلیم پر۔ یہ ایسی صورتِ حال ہے جس سے ہمیں یہ معلوم کرنے میں کافی مدد ملے گی کہ اسلامی علوم کی تعلیم میں حدیث کا کیا مقام تھا کیونکہ حنفیوں کے برعکس جن کو علمِ فقہ سے زیادہ دلچسپی تھی، شافعیوں کو علمِ حدیث سے زیادہ لگاؤ تھا۔(۱۴)

ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں جنوبی ہند کے مسلمانوں کی دینی اور ثقافتی زندگی پر کافی روشنی ڈالی ہے، تاہم اس نے وہاں کسی محدث سے ملاقات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن اسے کئی شافعی علماء سے ملنے کا اتفاق ہوا۔(۱۵) ابنِ بطوطہ کی سیاحتِ دکن کے کوئی پچاس سال بعد یہاں کے بعض شہروں میں ایسے کئی محدث موجود تھے جن کے لیے سلطان محمود شاہ بہمنی اوّل (۷۸۰ تا ۷۹۹ھ/۱۳۷۸ تا ۱۳۹۷ء) نے املاک وقف کر دی تھیں۔(۱۶) یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ محدث کون تھے۔ ان محدثین کی موجودگی کا علم ہمیں تاریخِ فرشتہ سے ہوتا ہے۔ مگر اس میں کوئی اور تفصیل نہیں ملتی۔ تاہم یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ محدث غیر ملکی نہیں تھے۔ کیونکہ یہ محدث اگر غیر ملکی ہوتے تو ان میں سے کچھ لوگوں کے نام کم از کم آٹھویں اور نویں صدی کے ان علماء کے سوانح حیات میں محفوظ ہوتے جو بیرونی ملکوں سے آ کے دکن میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ نیز ان محدثین کا تعلق شمالی ہند سے بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ اس وقت تک شمالی ہند میں محدث کی اصطلاح کے صحیح مفہوم تک سے بھی لوگ واقف نہ تھے۔ چنانچہ غالب امکان یہی ہے کہ یہ محدث جنوبی ہند ہی کے باشندہ تھے۔ اس مفروضہ کو اس واقعہ سے تقویت ہوتی ہے کہ ابنِ بطوطہ نے جن شافعی فقہا کا ذکر کیا ہے، وہ وہی لوگ ہیں جنہیں آگے چل کر فرشتہ نے محدثین کا نام دیا۔ اور جو بہمنی سلاطین کی سرپرستی کی وجہ سے دکن میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اس مفروضہ سے ایک اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بہمنی اور مظفر شاہی سلطنتوں کے

قیام سے پہلے ہی شافعی علماء نے جنوبی ہند کو علمِ حدیث سے روشناس کرا دیا تھا، اور نویں صدی ہجری میں اس کی ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

مکاتبِ محدثین جن کے ذریعہ ہند میں علمِ حدیث کی اشاعت ہوئی

نویں صدی ہجری کے اوّل ربع میں جب کہ ہند میں علمِ حدیث کی اشاعت کا آغاز ہو رہا تھا، عالمِ اسلام کے ایک عظیم ترین محدث ابن حجر العسقلانی (۷۷۳-۸۵۲ھ) کی قیادت میں ایک نیا مکتبِ محدثین مصر میں قائم ہو گیا تھا۔(۱۷) اس مکتب نے من جملہ اور لوگوں کے اپنے زمانے کے دو نہایت ممتاز محدث عبدالرحمٰن السخاوی (۸۳۱-۹۰۳ھ) اور زین الدین زکریا الانصاری (۸۲۶-۹۲۵ھ) پیدا کیے۔ ان میں سے سخاوی نے حرمین کو اور انصاری نے قاہرہ کو اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ زکریا انصاری کے شاگردِ رشید ابنِ حجر الہیثمی (۹۰۹-۹۷۴ھ) نے علمِ حدیث کے ایک مرکز کی حیثیت سے مکہ معظمہ کی شہرت میں بہت اضافہ کیا۔ اس طرح نویں صدی ہجری کے اوّل ربع سے لے کر دسویں صدی ہجری کے تیسرے ربع تک مصر اور حرمین میں محدثین کے چار مکاتب یکے بعد دیگرے برسرِ عمل رہے، اور یہ ہند میں علمِ حدیث کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنے۔

مصر: علمِ حدیث کا گہوارہ —— عرب: اشاعتِ حدیث کا مرکز

ان مکاتبِ حدیث کے بانیوں کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب مصر سے تعلق رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں مصر علمِ حدیث کا مرکز اور بڑے بڑے محدثین کا گہوارہ تھا۔ اوپر جن ممتاز محدثین کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے علاوہ السیوطی (م ۹۱۱ھ) اور القسطلانی (م ۹۲۳ھ) کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ اور یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہند میں جن محدثین نے علمِ حدیث کی اشاعت کی اُن میں سے اکثر یا تو مصری تھے یا مصری محدثین کے شاگرد تھے۔ تاہم عرب علمِ حدیث کا ترسیلی مرکز بنا رہا، جہاں سے ہند میں اس کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عرب اور ہند کئی طریقوں سے باہم مربوط تھے اور عرب کے محدثین ہند کے محدثین سے بخوبی واقف ہو گئے۔ چنانچہ العسقلانی اور الانصاری کے مصری مکاتبِ حدیث ہند میں وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکے جو عسقلانی اور الہیثمی کے حجازی مکاتبِ حدیث کو حاصل ہوئی۔ ہند میں علمِ حدیث کی اشاعت میں عرب کا جو حصہ

ہے، اس کی اہمیت کم کیے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہند میں علمِ حدیث کو جو فروغ ہوا، وہ مصری محدثین کی کوششوں کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔

ہند میں محدثین کی آمد اور سکونت

مذکورۂ بالا چار مکاتبِ حدیث سے تعلق رکھنے والے محدثین کے ہند آنے اور یہاں سکونت اختیار کر لینے کے بیان سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر بدرالدمامینی اور نورالدین شیرازی کا بھی ذکر کر دیا جائے جو سب سے پہلے ترکِ وطن کر کے ہند آئے تھے۔

بدرالدین الدمامینی (۷۶۳ تا ۸۲۷ھ/ ۱۳۶۱ تا ۱۴۲۴ء):

بدرالدین محمد بن ابی بکر المخزومی الاسکندری المالکی الدمامینی ماہِ شعبان ۸۲۰ھ/ ستمبر ۱۴۱۷ء میں سلطان احمد بن مظفر شاہ (۸۱۴ تا ۸۴۳ھ/ ۱۴۱۱ تا ۱۴۴۳ء) کے عہدِ حکومت میں گجرات آئے تھے۔(۲۱) ہند آنے سے کچھ قبل وہ یمن کی جامع زبید میں اُستاد تھے۔(۲۲) یہاں اُنہوں نے مصابیح الجامع کے نام سے صحیح بخاری کی ایک شرح لکھی تھی۔(۲۳) زبید میں سکونت ترک کرنے سے قبل ہی اُنہوں نے یہ کتاب احمد شاہ کے نام معنون کی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الدمامینی سلطان کی علم دوستی و سرپرستی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔(۲۴) گجرات میں الدمامینی نے تعلیق الفرائض، تحفۃ الغریب شرح المغنی اللبیب اور عین الحیات فی خلاصۃ حیات الحیوان از دمیری، قلم بند کیں اور ان سب کا انتساب اپنے سرپرست احمد شاہ کے نام کیا۔ اس زمانے میں دکن میں فیروز شاہ بہمنی (۸۰۰ تا ۸۲۵ھ/ ۱۳۹۷ تا ۱۴۲۲ء) اور اس کا جانشین احمد شاہ بہمنی (۸۲۵ تا ۸۳۸ھ/ ۱۴۳۲ تا ۱۴۳۴ء) علم کے دو نامور سرپرست حکمران ہوئے تھے۔ احمد شاہ بہمنی علم و تقویٰ کا بڑا قدردان تھا اور اسی وجہ سے الدمامینی نے بہمنیوں کے دارالسلطنت گلبرگہ کا رُخ کیا، اور زندگی کے آخری ایام وہیں بسر کیے۔ شعبان ۸۲۷ھ/ جولائی ۱۴۲۴ء میں الدمامینی نے وفات پائی۔(۲۵)

الدمامینی نے عربی صرف و نحو پر اپنا ایک رسالہ المنہل الصفی فی شرح الوفی اپنے بہمنی سرپرست احمد شاہ کے نام معنون کیا تھا۔(۲۶)

بدرالدین الدمامینی ۷۶۳ھ/ ۱۳۶۱ء میں اسکندریہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے دادا البہاء

الدمامینی، اپنے نامور عزیز ابنِ خلدون (م ۸۰۸ھ) اور قاہرہ اور مکہ معظمہ کے چند اور اساتذہ سے تحصیلِ علم کے بعد جامع الازہر میں کئی سال تک مدرس رہے۔(۲۷) وہ عربی لغت اور صرف ونحو پر سند مانے جاتے تھے۔(۲۸) اور السیوطی نے اپنی تصنیف بغیۃ الوعاۃ(۲۹) میں اسی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے۔ اُنھوں نے علمِ حدیث پر بھی چند کتابیں لکھی تھیں۔ اُن کی مصابیح الجامع جس کا ایک قلمی نسخہ مصر کے کتب خانۂ خدیویہ(۳۰) میں موجود ہے۔ زیادہ تر صحیح البخاری کے متن میں صرف ونحو کی دقتوں کے بارے میں ہے۔(۳۱) اس موضوع پر ان کی دو اور کتابیں ہیں۔ الفتح الربانی(۳۲) اور تعلیق المصابیح(۳۳)۔ ان میں سے اوّل الذکر کتب خانۂ خدیویہ میں محفوظ ہے(۳۴) اور دوسری کتاب عرب میں صاحب بن محمد (م ۱۲۱۸ھ) کے زمانے تک موجود تھی۔ یہ مدینہ کے ایک محدث تھے اور فلانی کے نام سے معروف ہیں۔(۳۵)

ابوالفتوح نورالدین احمد بن عبداللہ شیرازی الطاووسی:

ابوالفتوح نورالدین فارس میں بمقام ابرقوہ(۳۶) پیدا ہوئے تھے۔ اور وہاں کی درگاہِ طاؤس الحرمین سے نسبت کی بناء پر طاووسی کہے جاتے تھے۔(۳۷) وہ غالباً احمد شاہ (۸۱۴ تا ۸۴۴ھ/۱۴۱۱ تا ۱۴۴۳ء) کے عہدِ حکومت میں گجرات آئے تھے۔(۳۸) نورالدین، مجدالدین فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) شمسُ الدین الجزری (م ۸۲۲ھ) اور بابا یوسف الہروی کے شاگرد تھے۔(۳۹) مؤخر الذکر سے اُنھوں نے صحیح بخاری کا درس لیا تھا اور اُن سے سندِ عالی حاصل کی تھی۔ اسے سندِ عالی اس لیے کہا جاتا تھا کہ ہروی اور بخاری کے درمیان راویوں کی تعداد ہروی کے کسی اور ہم عصر اور امام بخاری کے درمیان راویوں کی تعداد سے کم تھی۔(۴۰) ابوالفتوح نورالدین نے مشکوٰۃ المصابیح کا درس شرف الدین عبدالرحیم سے اور اُنھوں نے امام الدین سے لیا تھا جو مشہور مصنف الخطیب التبریزی (م ۷۹۳ھ) کے شاگرد تھے۔(۴۱)

ابنِ حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) کے مکتبِ حدیث سے تعلق رکھنے والے محدثین

ا۔ یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن ابی الخیر الہاشمی الشافعی (۷۸۹ تا ۸۴۳ھ/۱۳۸۸ تا ۱۴۳۹ء):

ان کا تعلق محدثینِ مکہ کے ایک خاندان سے تھا، جو اپنی قبیلوی نسبت سے ابن فہد کہے

جاتے تھے۔ یحییٰ ابن عبدالرحمٰن ۸۳۰ھ/۲۷-۱۴۲۶ء میں کھمبایت آئے تھے (۴۲) اور وہاں قیام کرنے کے بعد گلبرگہ چلے گئے تاکہ احمد شاہ بہمنی اوّل کی سرپرستی سے فیض یاب ہوں۔ اُنہوں نے جمادی الثانی یا رجب ۸۴۳ھ/ نومبر یا دسمبر ۱۴۳۹ء میں جنوبی برار میں بمقام مہر وفات پائی۔

ابنِ فہد نے علمِ حدیث ابن حجر العسقلانی اور مصر، مکہ اور مدینہ کے دوسرے ہم عصر شیوخ سے حاصل کیا۔ زین العابدین العراقی (م ۸۰۶ھ) اور نورالدین الہیثمی (م ۸۰۷ھ) نے ان کو حدیث کا درس دینے کا اجازت نامہ دیا تھا۔

۲۔ محمود گاوان (۸۱۳ تا ۸۸۶ھ/ ۱۴۱۰ تا ۱۴۸۱ء):

خواجہ عماد الدین محمود بن احمد الگیلانی جو تاریخِ ہند میں محمود گاوان کے نام سے مشہور ہیں بہمنی سلاطین کے نامور وزیر تھے۔ وہ علاء الدین شاہ بہمنی ثانی (۸۳۸ تا ۸۶۲ھ/ ۱۴۳۴ تا ۱۴۵۸ء) کے عہد میں دکن آئے تھے۔ (۴۳)

محمود گاوان (۸۱۳ھ/۱۴۱۰ء) میں بحیرۂ خضر کے ساحلی علاقے گیلان کے ایک شاہی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ (۴۴) اُنہوں نے اپنے بھائی احمد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی جو ابنِ حجر العسقلانی کے شاگرد تھے۔ (۴۵) علمِ حدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے محمود ۸۴۳ھ/۱۴۳۹ء میں قاہرہ گئے۔ اور ابنِ حجر سے صحیح بخاری اور زین الدین زرکشی (م ۸۴۵ھ) سے صحیح مسلم کا درس لیا۔ محمود نے شام کے کئی ائمہ سے بھی حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ محمود گاوان نے علمِ حدیث پر عبور حاصل کر لیا تھا اور اس کا ثبوت اس "مناولہ" سے ملتا ہے جو ابنِ حجر نے ان کو عطا کیا تھا۔ (۴۶) محمود گاوان نے ریاض الانشاء میں (۴۷) جو ہند اور بیرونِ ہند کی مختلف شخصیتوں کے نام ان کے خطوط کا مجموعہ ہے، بہت سے احادیث کا حوالہ دیا ہے۔ (۴۸) اور ان حوالوں کے سوا ہمارے پاس کوئی اور ایسی شہادت نہیں ہے جو علمِ حدیث میں محمود گاوان کی قابلیت کے ثبوت میں پیش کی جا سکے۔

محمود گاوان نے غیر معمولی قابلیت سے پینتیس برس تک بہمنی سلطنت کی خدمات انجام دیں۔ (۴۹) وہ اپنی انتظامی اصلاحات کی وجہ سے جتنے مشہور تھے، اتنے ہی علم کی وسیع سرپرستی و

قدردانی کی وجہ سے بھی مشہور ہوئے۔ وہ انسانیت کے ایک محسن اور ذاتی جوہر اور فضیلت رکھنے والے غریب اہلِ علم کے سرپرست و پشت پناہ تھے۔(۵۰) چنانچہ محمد شاہ بہمنی ثانی (۸٦۷ تا ۸۸۷ھ/ ۱۴٦۳ تا ۱۴۸۲ء) نے ۵ر صفر ۸۸٦ھ (اپریل ۱۴۸۱ء) کو جب ناحق ان کو قتل کروادیا گیا تو مکہ معظمہ کے اہلِ علم یہ خبر سن کر بہت رنجیدہ ہوئے۔(۵۱)

محمود گاوان نے اپنی وفات سے دو سال پہلے بیدر میں ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا تھا جس کے لیے محمود نے اپنے ذاتی کتب خانہ کی تین ہزار (۵۲) اور بعض روایات کے مطابق پینتیس ہزار (۵۳) کتابیں بھی مہیا کی تھیں۔ اس مدرسہ کے آثار اب تک موجود ہیں۔ محمود گاوان شافعی مسلک کے پیرو محدث تھے۔(۵۴) اس لیے قدرتی طور پر اُنہوں نے اپنے مدرسہ میں حدیث کی تعلیم کو بہت اہمیت دی۔ اور ان کے عظیم الشان کتب خانہ میں علمِ حدیث کی کتابیں یقیناً موجود ہوں گی۔

۲۔ عبدالرحمٰن السخاوی (م ۹۰۲ھ) کے مکتبِ حدیث سے تعلق رکھنے والے محدثین:

۱۔ ابوالفتح رضی المکی (م ۸۸٦ھ/ ۱۴۸۱ء):

ابوالفتح ربیع الاوّل ۸۵۴ھ/ اپریل ۱۴۵۰ء میں مکہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ۸۷۰ھ/ ۱۴٦۵ء میں حجاز میں اپنے مختصر قیام کے دوران میں وہ السخاوی سے ملے تھے اور ان سے احادیث سماعت کی تھیں۔ اس کے کچھ دن بعد ہی وہ سلطنتِ مالوہ کے دارالحکومت مانڈو کے لیے روانہ ہو گئے اور اس شہر میں تیرہ سال کے قریب مقیم رہے۔ اس کے بعد مکہ واپس چلے گئے اور وہیں ۸۸٦ھ/ ۱۴۸۱ء میں وفات پائی۔(۵۵)

۲۔ احمد بن صالح:

السخاوی کے ایک شاگرد جنہوں نے مانڈو میں سکونت اختیار کی تھی، احمد بن صالح تھے۔ ان کے والد مکہ کے رہنے والے تھے اور ترکِ وطن کر کے ہند آ گئے تھے۔ احمد بن صالح یہیں پیدا ہوئے تھے۔ مگر ان کی پرورش اور تعلیم مکہ میں ہوئی۔ وہ حافظ تھے اور حدیث کی تعلیم السخاوی سے حاصل کی۔

تلاشِ معاش میں سلطان غیاث الدین فرمانروائے مالوہ (۸۷۴ تا ۹۰۶ھ/۱۴۹۶ تا ۱۵۰۰ء) کے عہد میں مانڈو آئے تھے۔ ان کی تاریخِ وفات کا علم نہیں ہے۔(۵۶)

۳۔عمر بن محمد دمشقی نزیل الکنبایت (۸۲۹ تا ۹۰۰ھ/۱۴۲۵ تا ۱۴۹۴ء):

عمر بن محمد دمشق میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ السخاوی کے ہم مکتب بھی تھے اور شاگرد بھی۔ شوال ۸۵۳ھ/نومبر ۱۹۴۹ء میں اُنہوں نے قاہرہ میں ایک خاتون محدث سارہ بنت جماعہ (م ۸۵۵ھ) سے طبرانی کی معجم الکبیر کا درس لیا۔ ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں تاجر کی حیثیت سے کھمبایت آئے۔ اور کچھ عرصہ بعد وہاں کی حکومت نے ان کو شافعیوں کا قاضی مقرر کر دیا۔ صوبہ دار کھمبایت کے نمائندہ کی حیثیت سے قاہرہ جاتے ہوئے، اُنہوں نے ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء کے موسمِ سرما میں اپنا سفر منقطع کر دیا، اور مکہ معظمہ میں قیام کر کے ایک سال تک السخاوی سے علمِ حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد قاہرہ گئے اور وہ کام انجام دیا جس کے لیے اُنہیں بھیجا گیا تھا۔ ہند واپس جانے سے قبل اُنہوں نے پھر احادیث سماعت کیں اور السخاوی سے جو ان دنوں اتفاقاً وہاں موجود تھے، اجازہ حاصل کیا۔ عمر بن محمد نے کھمبایت میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اور اسی وجہ سے نزیل کنبایت (۵۷) کہے جانے لگے۔ ان کی تاریخِ وفات کا علم نہیں ہے۔

۴۔عبدالعزیز بن محمود طوسی شافعی (۸۳۶ تا ۹۱۰ھ/۱۴۳۲ تا ۱۵۰۴ء):

عبدالعزیز خراسان کے شہر طوس میں رمضان ۸۳۶ھ/مارچ ۱۴۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے محمد بن عبدالعزیز ابہری سے، جو ابنِ حجر العسقلانی اور میر اصیل الدین بن جمال الدین شیرازی (م ۸۸۳ھ) کے شاگرد تھے، حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ ۸۷۰ھ/۱۴۶۳ء میں وہ مکہ معظمہ ہجرت کر گئے جہاں اُنہوں نے السخاوی سے مسلسل احادیث سماعت کیں۔ مگر وہ السخاوی کی صحبت میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکے کیونکہ تلاشِ معاش میں ان کو مکہ بھی چھوڑنا پڑا۔ محمود گاوان کے آخر زمانے میں وہ دکن آ گئے تھے اور محمود نے ان کو اپنے داماد (۵۸) کو شافعی فقہ کی کتاب المحرر (۵۹) پڑھانے پر مامور کر دیا تھا۔

۵۔ وجیہہ الدین محمد المالکی (۸۵۶ تا ۹۱۹ھ/ ۱۴۵۲ تا ۱۵۱۳ء):

وجیہہ الدین کا تعلق مصر کے مالکی فقہا کے ایک خاندان سے تھا۔ وہ ۶ر شعبان ۸۵۶ھ (اگست ۱۴۵۲ء) کو پیدا ہوئے، اور اپنے والد محمد سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ محمد فقیہہ تھے اور اُنہیں ابنِ حجر کے ساتھ مطالعۂ حدیث کرنے کا شرف حاصل تھا۔(۶۰) ۸۸۶ھ/ ۱۴۸۱ء میں وہ مکہ معظمہ میں السخاوی کے مکتب میں شریک ہوئے اور علمِ حدیث کے مطالعہ میں کافی عرصہ تک مصروف رہے۔ پھر وہ یمن میں مدرسۂ زبلع میں حدیث کا درس دینے لگے اس کے بعد یمن سے احمد آباد جانے کے لیے کھمبایت کے سفر پر روانہ ہوئے۔ گجرات سے اُنہوں نے اپنے دوستوں کے نام جو خطوط لکھے، اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۸۹۸ھ/ ۱۴۹۲ء سے قبل گجرات پہنچ گئے تھے۔

صوبہ دار کھمبایت کے ایماء پر وجیہہ الدین نے حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ منجملہ دوسری کتابوں کے وہ قاضی عیاض کی شفا بھی پڑھاتے تھے۔(۶۱) بہت جلد ان کا نام دور و نزدیک مشہور ہو گیا۔ اور ان کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے سلطان محمود اوّل (۸۶۳ تا ۹۱۷ھ/ ۱۴۵۸ تا ۱۵۱۱ء) نے ان کو ملک المحدثین کا خطاب عطا کیا۔(۶۲) اس کے علاوہ سلطان نے ان کو محاصلِ سلطنت کا افسرِ اعلیٰ مقرر کر دیا، اور بڑی فیاضی سے ان پر انعام و اکرام کی بارش کی۔(۶۳)

اپنے سرکاری فرائض میں بہت مصروف رہنے کے باوجود وجیہہ الدین علمِ حدیث کی تعلیم دینے کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ اس موضوع پر کتابیں مرتب کرنے کے لیے اُنہوں نے معقول معاوضہ دے کر ماہرین کا تقرر کیا تھا۔ چنانچہ مکہ کے ایک محدث جار اللہ بن فہد(۶۴) نے وجیہہ الدین کے لیے فتح المبین کے نام سے ایک اربعین مرتب کی تھی جس کی ہم عصر علماء نے بہت تعریف کی۔(۶۵) ان کو علمِ حدیث سے اتنی زیادہ دلچسپی تھی کہ وہ ہمیشہ اس موضوع پر نئی کتابوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ چنانچہ ابنِ حجر کی فتح الباری، جو صحیح بخاری کی ایک مشہور شرح ہے، جوں ہی اشاعت کے لیے تیار ہوئی وجیہہ الدین نے اس کا ایک نسخہ اپنے لیے حاصل کر لیا، اور پھر اسے اپنے دوست مخاطب علی خاں کو جو گجرات کا ایک امیر تھا، پیش کر دیا۔ مخاطب علی نے یہ نسخہ سلطان مظفر شاہ (۹۱۷ تا ۹۳۲ھ/ ۱۵۱۱ تا ۱۵۲۵ء) کے کتب خانہ کے لیے بھیج دیا۔ اس تحفہ سے سلطان اس قدر خوش ہوا کہ اس

نے مخاطب علی کو بروچ بطور جاگیر عطا کر دیا۔(٦٦) وجیہہ الدین نے ۹۱۰ھ/۱۵۱۳ء کو احمد آباد میں وفات پائی۔(٦٧)

٦۔ حسین بن عبداللہ بن اولیاء کرمانی (م ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء):

حسین کا جدی نام اصیل الدین تھا۔ مکہ کے رہنے والے تھے۔ السخاوی سے صحیح بخاری، مسند شافعی اور مشارق الانوار کا درس لیا۔ علمِ حدیث کے شوقین طالب تھے اور السخاوی سے اجازہ حاصل کیا۔ ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء میں حسین دبل آئے جو بیجاپور میں واقع ہے۔ یہاں چار سال قیام کیا اور ۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء(٦٨) میں مکہ واپس گئے۔ اگرچہ یہاں قیام کے زمانے میں حسین کی علمی سرگرمیوں کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا، تاہم یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ چونکہ محدث تھے، اس لیے اُنہوں نے علمِ حدیث کی اشاعت کا کام کیا۔

۷۔ جمال الدین محمد بن عمر حزرمی (۸٦۹ تا ۹۳۰ھ/۱۴٦۴ تا ۱۵۲۴ء):

جمال الدین جو بحرق کے نام سے معروف تھے، ۹۲۸ھ/۱۸۲۲ء میں گجرات آئے۔(٦۹) وہ محدث بھی تھے اور شافعی فقیہہ بھی۔(۷۰) جمال الدین گجرات کے حکمران سلطان مظفر ثانی کے استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے جس نے ان سے حدیث کا درس لیا تھا۔(۷۱) مظفر شاہ کے دربار میں ان کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے امراء ان سے حسد کرنے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۰ رشعبان ۹۳۰ھ (جون ۱۵۲۴ء) کی شب کو انہیں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔(۷۲)

جمال الدین ۸٦۹ھ/۱۴٦۴ء میں حضرموت میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک جید عالم تھے۔ ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء کے موسمِ حج میں ان کی ملاقات السخاوی سے ہوئی جن سے اُنہوں نے علمِ حدیث کی تکمیل کی جس کا درس وہ زبید میں محمد الصائغ اور محمد بن عبداللطیف المشرجی سے کر چکے تھے۔(۷۳) جمال الدین نے المنزری کی الترغیب والترھیب (۷۴) کا خلاصہ التقریب والتھذیب کے نام سے لکھا تھا، جس کا ایک مخطوطہ رام پور کے سرکاری کتب خانہ میں موجود ہے۔(۷۵)

۸۔ رفیع الدین صفوی (م ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء):

رفیع الدین صفوی، السخاوی کے شاگرد تھے اور اُنہوں نے آگرہ میں علمِ حدیث کی

اشاعت کے لیے راہ ہموار کر دی۔(۷۶) وہ ایران میں صفوی سلسلہ کے مشہور بانی صفی الدین کی اولاد میں تھے۔اس سلسلہ نے شاہ اسماعیل (۹۰۵ تا ۹۳۰ھ/۱۴۹۹ تا ۱۵۲۳ء) کی سرکردگی میں ایک جنگ جُو شیعی تنظیم کی شکل اختیار کر لی تھی۔(۷۷) رفیع الدین نویں صدی ہجری کے تیسرے ربع میں شیراز میں پیدا ہوئے تھے۔جلال الدین دوانی (م ۹۲۸ھ) کی شاگردی کے زمانہ ہی میں اُنہوں نے صرف مراسلت کر کے السخاوی سے حدیث کی کئی کتابوں کا درس دینے کا اجازہ حاصل کر لیا تھا۔(۷۸) اس صدی کے آخر میں قزلباشوں (۷۹) کے ہاتھوں ایران میں سنیوں کے مذہب اور زندگی کے لیے روز افزوں خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ اس لیے رفیع الدین کے والد ہجرت کر کے حرمین چلے گئے۔(۸۰) اس طرح نوجوان طالبِ علم رفیع الدین کو السخاوی سے قریب ہونے اور ان کی رہنمائی میں علمِ حدیث پر عبور حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء میں السخاوی کی وفات کے بعد رفیع الدین گجرات روانہ ہوئے جہاں وہ سلطان محمود اوّل (۸۶۳ تا ۹۱۷ھ/۱۴۵۸ تا ۱۵۱۱ء) کے آخر عہدِ حکومت میں پہنچے۔(۸۱) پھر وہاں سے آگرہ گئے جو سلطان سکندر لودھی (۸۹۴ تا ۹۲۳ھ/۱۴۸۸ تا ۱۵۰۰ء) کی فیاضی و سرپرستی کی بدولت ایک اہم علمی مرکز بن گیا تھا۔سلطان سکندر کو علمِ حدیث سے گہری دلچسپی تھی اور اس کے حکم سے صحیح مسلم کا ایک حصہ نقل کیا گیا تھا جو بانکی پور کے کتب خانۂ علومِ شرقیہ میں محفوظ ہے۔(۸۲) سلطان سکندر لودھی نے رفیع الدین کے لیے شہر کے ایک محلّہ میں مکان بنوایا اور اس محلّہ کا نام اس کے نام پر رکھا گیا۔(۸۳) یہاں رفیع الدین چونتیس برس تک حدیث کا درس دیتے رہے۔ بہت اعزاز و اکرام حاصل کیا اور ۹۵۴ھ/۱۵۴۱ء میں وفات پائی۔(۸۴)

رفیع الدین کے شیر شاہ سوری (۹۴۶ تا ۹۵۲ھ/۱۵۳۹ تا ۱۵۴۵ء) سے بھی گہرے مراسم تھے۔شیر شاہ کی بے وقت موت سے اس کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا کہ رفیع الدین کو سلطانِ ترکی کے دربار میں اس مقصد سے متعین کیا جائے کہ ایران میں فرقہ واری خطرہ کا سدِ باب کیا جائے، اور حاجیوں کے لیے ایک شاہراہ کے ذریعہ ہند کو حجاز سے مربوط کر دیا جائے۔(۸۵)

۳۔ زکریا الانصاری (م ۹۲۵ھ) کے مکتبِ حدیث سے تعلق رکھنے والے محدثین:

ا۔ عبدالمعطی الحضرمی (م ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء):

عبدالمعطی رجب ۹۰۵ھ/فروری ۱۵۰۰ء میں مکّہ میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے والد الحسن کے ساتھ قاہرہ میں شیخ الاسلام زکریا الانصاری کے مکتبِ حدیث میں شریک ہوئے۔ اور دونوں نے زکریا سے صحیح بخاری کا درس لیا۔ باپ قاری کا فرض انجام دیتے تھے اور بیٹا سامع کا۔ ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء سے قبل عبدالمعطی ہجرت کر کے احمد آباد آ گئے۔ (۸۶) ایک روشن خیال خاندان عیدروسی سے جو احمد آباد میں گیا تھا، ان کے گہرے تعلقات تھے۔ گجرات میں ان کا خاص شغل علمِ حدیث اور بالخصوص صحیح بخاری کا درس دینا تھا۔ اُنہوں نے ایک کتاب اسماء الرجال البخاری لکھی تھی، جس کا ذکر کرتے ہوئے، عبدالقادر نے اپنی کتاب النور السافر میں لکھا ہے کہ یہ کتاب اگرچہ نامکمل تھی، لیکن بہت ضخیم تھی۔ عبدالمعطی نے ذی الحجہ ۹۸۹ھ/جنوری ۱۵۸۱ء میں احمد آباد میں وفات پائی۔ (۸۷)

۲۔ شہاب الدین عباسی (م ۹۹۲ھ/ ۱۵۸۴ء):

زکریا انصاری کے ایک شاگرد جن کو گجرات میں علمِ حدیث کی اشاعت سے گہرا دلی تعلق تھا، شہاب الدین عباسی تھے۔ وہ ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء میں مصر میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے المقدسی کی عمدہ فی الحدیث اور نووی کی اربعین حفظ کر لی تھیں۔ شہاب الدین زندگی کے روزمرہ مشاغل میں بھی سنت کی پیروی سختی سے کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں محمد بن عبدالرحمٰن بھی شامل تھے۔ صفر ۹۹۲ھ/۱۸۸۴ء میں شہاب الدین نے وفات پائی۔ (۸۸)

۴۔ ابنِ حجر الہیثمی (م ۹۷۴ھ) کے مکتبِ حدیث سے تعلق رکھنے والے محدثین:

۱۔ شیخ عبداللہ العیدروسی (م ۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء):

شیخ عبداللہ النور السافر کے مصنف شیخ عبدالقادر العیدروسی کے والد تھے۔(۸۹) وہ حضر موت میں بمقام تریم ۹۱۹ھ/ ۱۵۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مکہ معظمہ میں ابنِ حجر الہیثمی کے مکتبِ حدیث میں شریک ہوئے اور ان سے اجازہ حاصل کیا۔ اُنہوں نے عبدالرحمٰن الدیبع سے بھی حدیث کا درس لیا تھا جو السخاوی کے شاگرد تھے اور مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح لکھی تھی۔(۹۰) ۹۵۸ھ/ ۱۵۵۱ء میں عبداللہ ہجرت کر کے احمد آباد آ گئے تھے۔ ان کا خاندان علم و فضل کے لیے مشہور تھا۔ ان کا مسکن تصوف اور علمِ حدیث کا ایک مرکز بن گیا تھا جہاں تمام مدارج کے علماء آتے تھے۔ عالم کی حیثیت سے شیخ عبداللہ اس قدر ہردلعزیز تھے اور ان کا اتنا احترام کیا جاتا تھا کہ اُنہوں نے ۹۸۱ھ/ ۱۵۷۵ء میں غزالی کی احیاء العلوم اور ۹۸۵ھ/ ۱۵۷۷ء میں صحیح بخاری کا درس ختم کیا تو عبدالمعطی جیسے بلند پایہ عالم نے ان کی مدح میں قصیدے پڑھے۔(۹۱) شیخ عبداللہ نے رمضان ۹۹۰ھ/ ستمبر ۱۵۸۲ء میں احمد آباد میں وفات پائی۔(۹۲)

۲۔ ابوالسعادت محمد الفاکہی الحنبلی (م ۹۹۲ھ/ ۱۵۸۴ء):

ابوالسعادت اگرچہ الہیثمی کے شاگرد تھے لیکن اُنہوں نے مکہ، حضر موت اور زبید کے نوے اساتذہ سے بھی حدیث کا درس لیا تھا، جس میں ابوالحسن البکری (۹۵۲ھ) بھی شامل ہیں۔ ۹۵۷ھ/ ۱۵۵۰ء سے قبل وہ ہجرت کر کے احمد آباد آ گئے تھے۔(۹۳) ۹۶۳ھ/ ۱۵۵۵ء میں سوات منتقل ہو گئے۔(۹۴) جہاں جمادی الاوّل ۹۹۲ھ/ مئی ۱۵۸۴ء میں وفات پائی۔(۹۵)

۳۔ میر مرتضٰی شریف شیرازی (م ۹۷۴ھ/ ۱۵۶۶ء):

میر مرتضٰی، سیّد شریف جرجانی (م ۸۱۶ھ) کے پوتے تھے۔ اُنہوں نے مکہ معظمہ میں ابنِ حجر سے حدیث کا درس لیا اور ان سے اجازہ بھی حاصل کیا۔ مکہ معظمہ سے مرتضٰے دکن آئے اور پھر

۹۷۲ھ/۱۵۶۴ء میں اکبرآباد (آگرہ) آ گئے۔ جہاں اکبر کے دربار میں وہ اعلیٰ منصب پر پہنچے۔ اور ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء میں اکبرآباد میں اپنی وفات تک علوم وفنون کی تعلیم دینے میں مصروف رہے۔ عقائد کے اعتبار سے وہ شیعی میلانات رکھتے تھے۔

۴۔ میر کلاں محدث اکبرآبادی (م ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء):

محمد سعید بن مولانا خواجہ جو میر کلاں محدث کے نام سے معروف ہیں۔ ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء میں اکبرآباد آئے تھے۔ اور اکبر نے ان کو شہزادہ سلیم (ولادت ربیع الاوّل ۹۷۷ھ/اگست ۱۵۶۹ء) کا جو آگے چل کر شہنشاہ جہانگیر ہوا، استاد مقرر کیا۔(۹۶) میر کلاں خراسان کے ایک مشہور ولی خواجہ کوہی کے پوتے تھے۔ اُنہوں نے شیراز میں نسیم الدین میرک شاہ بن جمال الدین محدث سے علمِ حدیث حاصل کیا۔(۹۷) ہند آنے سے قبل میر کلاں مکہ معظمہ میں حدیث کا درس دیتے تھے اور اسی بناء پر وہ شیخ الحرم المکی کہلاتے تھے۔(۹۸) مکہ میں منجملہ اور لوگوں کے ملا علی قاری (۹۹) (م ۱۰۱۴ھ) اور غضنفر بن جعفر نہر والی (م ۱۰۰۰ھ) نے بھی اُن سے مشکوٰۃ المصابیح کا درس لیا تھا۔(۱۰۰) محرم ۹۸۳ھ/اپریل ۱۵۷۵ء میں میر کلاں نے اکبرآباد میں وفات پائی۔(۱۰۱)

فصلِ دوم: ہند میں مراکزِ حدیث کا ارتقاء اور فروغ

ہند میں اشاعتِ حدیث کا آغاز اگرچہ ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء میں ہو گیا تھا، لیکن اس نے زیادہ ترقی نہیں کی اور نویں صدی ہجری میں محدثین کی بہت قلیل تعداد ترکِ وطن کر کے ہند آئی تھی۔ یہ کیفیت ۸۸۶ھ/۱۴۱۸ء میں حرمین میں السخاوی کے مکتبِ حدیث کے قیام تک جاری رہی۔(۱۰۲) اس کے بعد محدثین کی متواتر آمد کا دور شروع ہوا، اور یہ سلسلہ دسویں صدی ہجری کے آخر تک رہا۔ اشاعتِ علمِ حدیث کا یہ زمانہ جس کو ہند میں مراکزِ حدیث کے ارتقاء اور فروغ میں بہت اہمیت حاصل ہے، تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی سخاوی سے قبل کا دور (۸۲۰ تا ۸۸۶ھ/۱۴۱۷ تا ۱۴۸۱ء) سخاوی کا دور (۸۸۶ تا ۹۵۴ھ/۱۴۸۱ تا ۱۵۴۷ء) اور سخاوی کے بعد کا دور (۹۵۴ تا ۹۹۲ھ/۱۵۴۷ تا ۱۵۸۴ء)

ا۔ دکن

سخاوی سے قبل کے دور میں کئی محدثین دکن آئے تھے۔ لیکن یہاں کے حالات چونکہ آنے والوں کے لیے ناسازگار ہو گئے تھے، اس لیے سخاوی کے دور میں اور محدث یہاں نہیں آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ سخاوی کا دور دکن میں بہمنی سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا۔ یہ زوال ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں محمود گاوان کے قتل کیے جانے کا نتیجہ تھا۔ محمود نہایت قابل وزیر تھا، اور اس نے تمام مخالف عناصر کو اپنے قابو میں رکھا تھا۔ (۱۰۳) لیکن اس کے بعد فتنہ وانتشار پھیل گیا۔ بہمنی سلطنت پانچ ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ بیجاپور میں عادل شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی، گول کنڈہ میں قطب شاہی، برار میں عماد شاہی اور بیدر میں برید شاہی خاندانوں کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ (۱۰۴) ان میں سے پہلی تین سلطنتیں زیادہ طاقت ور تھیں، اور ان کے حکمرانوں نے شیعت کو سرکاری مذہب قرار دے دیا۔ بیدار اور برار کی چھوٹی چھوٹی سنی ریاستوں میں سے بیدر پر ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء میں بیجاپور نے اور برار پر ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں احمد نگر نے قبضہ کر لیا۔ (۱۰۵) اس طرح بہمنی سلطنت کے خاتمے سے دکن میں سنیوں کے عہدِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا جس پر اس ملک میں علمِ حدیث کی اشاعت وترقی کا انحصار تھا۔ کیوں کہ سنت بہرحال افضل طور پر سنیوں کی میراث تھی۔

دکن میں جو شیعہ حکومتیں قائم ہوئی تھیں، ان کا طرزِ عمل اس ملک کی سنی اکثریت کے مذہب اور ثقافت کے لیے سازگار نہ تھا۔ ایران کے حکمران اسماعیل صفوی (۹۰۵ تا ۹۳۰ھ/۱۴۹۹ تا ۱۵۲۳ء) شیعوں کا زبردست حامی تھا۔ اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے حوصلہ پا کر دکن کے شیعہ حکمرانوں نے شیعت کو اس طرح فروغ دینا شروع کیا جو سنیوں اور ان کی ان تمام چیزوں کے لیے جو انہیں محبوب تھیں، نہایت نقصان رساں تھا۔ (۱۰۶) سنیوں کے خلاف شیعوں کی تحریک کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اذان سنیوں کے طریقے کے بجائے شیعوں کے طریقے پر دی جانے لگی۔ (۱۰۷) اور صرف یہی نہیں ہوا بلکہ خطبۂ جمعہ میں تبرہ بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ (۱۰۸) شیعہ حکمرانوں نے سنی علماء پر ظلم کیا اور ان کی املاک اور بہمنی سلاطین کے عطا کردہ اوقاف ضبط کر لیے۔ تاریخِ فرشتہ کے حوالے سے یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ احمد نگر کے حکمران برہان

نظام شاہ نے سنی علماء کے تمام وظائف بند کر کے شیعہ علماء کو دے دیئے۔(۱۰۹) اسی مؤرخ کا یہ بیان ہے کہ عادل شاہی خاندان کے برسرِ اقتدار آتے ہی سیّد محمد گیسو دراز کی اولاد کو احمد شاہ بہمنی کی عطا کردہ زمینات سے محروم کر دیا گیا۔(۱۱۰) سنیوں کو جن حالات کا سامنا تھا، اس میں ان کے علماء بے روک ٹوک اپنی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ اور سنیوں کے خلاف اس جذبے کا اثر دکن میں علمِ حدیث کی اشاعت پر بھی دیکھنا پڑا۔ چنانچہ سخاوی کے دور میں اور سخاوی کے بعد کے دور میں بیرونِ ہند سے جو محدث آئے، وہ سنی علماء سے شیعہ حکمرانوں کی عداوت کے باعث اکثر و بیشتر دکن کے بجائے گجرات اور شمالی ہند میں سکونت پذیر ہوئے۔ اس طرح سندھ میں علمِ حدیث کی تاریخ دکن میں بھی دہرائی گئی، اس فرق کے ساتھ کہ سندھ میں سنیوں کا عہدِ حکومت ڈھائی سو برس سے زیادہ مدت تک رہا اور یہاں محدثین کی جماعت تیار کرنا ممکن ہو سکا۔ لیکن دکن میں سنیوں کی حکومت کا زمانہ صرف ڈیڑھ سو برس کے قریب رہا اور یہاں علمِ حدیث کی اشاعت و ترقی کے لیے اتنا کام نہ کیا جا سکا جتنا کہ سندھ میں ہوا تھا۔

دکن میں علمِ حدیث کی کیفیت پر اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علمِ حدیث کی ترقی و اشاعت کے لیے بہمنی سلاطین نے جو خدمات انجام دیں، ان پر ایک نظر ڈالیں۔

سلطان محمود شاہ اوّل (۷۸۰ تا ۷۹۹ھ/۱۳۷۸ تا ۱۳۹۷ء) پہلا ہندی حکمران تھا، جس نے محدثین کی سرپرستی کی۔ اس نے محدثین کے لیے علمِ حدیث پر کام کرنے کی سہولتیں فراہم کیں۔ چنانچہ گلبرگہ، بیدر، دولت آباد، ایلچ پور، جیول اور دابل جیسے بڑے شہر محدثین کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔(۱۱۱) سلطان محمود کے جانشین فیروز شاہ (۸۰۷ تا ۸۲۵ھ/۱۳۹۷ تا ۱۴۲۲ء) کے عہد میں گلبرگہ میں چند علماء نے صحیحین اور مشکوٰۃ المصابیح کی ورق گردانی اس مقصد سے کی تھی کہ متعہ کے مسئلہ پر فتوے جاری کریں۔(۱۱۲) اور اس واقعہ سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ دکن میں احادیث کی مستند کتابیں نہ صرف موجود تھیں بلکہ ان کی بہت مانگ بھی تھی۔ حالانکہ اس زمانہ میں شمالی ہند میں یہ صورتِ حال نہ تھی۔ سلطان احمد شاہ بہمنی اوّل (۸۲۵ تا ۸۳۸ھ/۱۴۲۲ تا ۱۴۳۶ء) سیّد محمد گیسو دراز کا

بہت عقیدت مند مرید تھا اور سنتِ رسول ﷺ کی سختی سے پابندی کرنے کی وجہ سے لوگ اسے ولی بہمنی کہتے تھے۔ احمد شاہ کو فقہ اور علم الکلام کے علاوہ علمِ حدیث پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔(۱۱۳)
۸۸۷ھ/۱۴۷۳ء میں ایک عالم تاجر ابوسعید حسین نے بیدر میں مشکوٰۃ المصابیح کی ایک نقل تیار کی تھی، جو سلطان محمود بہمنی دوم (۸۸۷ تا ۹۲۴ھ/۱۴۸۲ تا ۱۵۱۸ء) کو غالباً اس کی تخت نشینی کے موقع پر پیش کی تھی۔(۱۱۴)

سخاوی سے قبل کے دور میں جو سات محدثین ہند آئے تھے، ان میں سے چار نے دکن میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور یقینی طور پر اس کی وجہ یہ تھی کہ بہمنی سلاطین نے ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی۔ دمامینی اور ابنِ فہد گجرات کو چھوڑ کر دکن چلے گئے تھے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بہمنی سلاطین، مظفر شاہی سلاطین سے بھی زیادہ محدثین کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ اگر بہمنی خاندان کچھ اور مدت تک حکمران رہتا تو دکن میں علمِ حدیث کی تاریخ اور زیادہ شاندار ہوتی۔

دکن میں علمِ حدیث کی تاریخ کا یہ جائزہ نامکمل رہ جائے گا اگر اس میں یہ نہ بتلایا جائے کہ اس ضمن میں بیجاپور نے خاص طور پر کیا حصہ لیا ہے۔

عادل شاہی خاندان کے آٹھ حکمرانوں میں سے ابراہیم عادل شاہ اوّل (۹۴۱ تا ۹۶۵ھ/۱۵۳۴ تا ۱۵۵۷ء) اور ابراہیم عادل شاہ دوم (۹۸۸ تا ۱۰۳۷ھ/۱۵۸۰ تا ۱۶۲۷ء) سنی (۱۱۵) تھے اور باقی شیعہ۔ ابراہیم عادل شاہ دوم نے جسے عام طور پر نورس کہا جاتا تھا۔(۱۱۶) اپنی سنی اور شیعہ رعایا میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے خطبہ میں چاروں خلفائے راشدین کے ساتھ اماموں کے نام بھی شامل کر لیے تھے۔(۱۱۷) سلطان ابراہیم سنت کا بہت پابند تھا اور اس کو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے جو گہری عقیدت تھی، اس کا اندازہ بیجاپور کی عظیم الشان مسجد کے آرائشی کتبوں سے کیا جا سکتا ہے، جن میں صحیح بخاری اور مشکوٰۃ المصابیح کی احادیث شامل ہیں اور ان میں وہ حدیثیں بھی ہیں، جن سے عشرۃ المبشرہ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔(۱۱۸) آنحضرت ﷺ کے آثارِ مبارک (۱۱۹) کو محفوظ رکھنے کے لیے سلطان ابراہیم نے ایک مشہور عمارت کی تعمیر کی تھی، جو آثار

شریف یا آثارِ محل کہلاتی ہے اور اس عمارت میں اسلامی علوم کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ کے لڑکے اور جانشین محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ تا ۱۰۶۸ھ/۱۶۲۷ تا ۱۶۵۷ء) نے اس ادارے کو ترقی دے کر وہ مدرسے قائم کر دیئے جن میں حدیث، فقہ اور دوسرے علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ (۱۲۰) ابراہیم عادل شاہ دوم کتابوں کا بہت شوقین تھا اور بیجاپور کا شاہی کتب خانہ اسی نے قائم کیا تھا۔ یہ کتب خانہ اسلامی علوم سے متعلق کتابوں کا خزانہ اور عادل شاہی خاندان کے شایانِ شان یادگار تھا۔ (۱۲۱) ابراہیم دوم اور اس کے جانشینوں کی جمع کردہ کتابوں کے علاوہ اس کتب خانہ میں اسیر گڑھ اور بیدر کے ذخائر کتب بھی شامل کر دیئے گئے جو ابراہیم دوم نے ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء میں اسیر گڑھ اور بیدر فتح کر کے حاصل کیے تھے۔ (۱۲۲) انڈیا آفس (۱۲۳) اور حبیب گنج (۱۲۴) کے کتب خانوں میں جو مخطوطات تھے، ان پر لکھی ہوئی تحریروں سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۸ء میں جب ابراہیم عادل شاہ دوم نے محمد آباد بیدر کو فتح کر لیا تھا تو یہ مخطوطات وہاں سے بیجاپور لائے گئے تھے۔ بیدر ۹۳۴ھ/۱۵۲۷ء تک بہمنی حکمرانوں کا دارالسلطنت رہا تھا اور یہاں جو کتابیں تھیں، ان میں ایسی کتابیں بھی شامل تھیں جو بیدر کے برید شاہی خاندان کو بہمنی سلطنت سے ورثہ میں ملی تھیں۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ بیجاپور کے کتب خانے میں بیدر سے لائی ہوئی جو کتابیں داخل کی گئیں، ان میں کچھ ایسی کتابیں بھی شامل تھیں جو محمود گاوان کی ملکیت تھیں کیونکہ ان پر ملک التجار (۱۲۵) یا محمود خواجہ جہاں کی مہر لگی ہوئی ہے۔ (۱۲۶) ہمارے اس قیاس کو اس بات سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ برید شاہی سلاطین نے بیدر میں کوئی کتب خانہ قائم کیا تھا۔

بیجاپور کے عادل شاہی کتب خانے میں علمِ حدیث پر جو کتابیں تھیں، ان میں سے مندرجۂ ذیل کتب ہم تک پہنچی ہیں اور ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ دوم اور اس کے لڑکے محمد عادل شاہ کو بیجاپور میں علمِ حدیث کو فروغ دینے سے کتنی زیادہ دلچسپی تھی۔

(۱) صحیح بخاری کا ایک مرصع نسخہ جس پر ایک اندراج سے پتا چلتا ہے کہ یہ نسخہ ابراہیم دوم کے کتب خانہ میں ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۸ء میں داخل کیا گیا تھا اور یہ محمد آباد، بیدر کی فتح میں بطورِ

مالِ غنیمت ملا تھا۔(۱۲۷)

(۲) ابنِ حجر کی فتح الباری کی تیسری جلد۔ اس کا آغاز استسقاء سے متعلق باب سے اور اختتام الدعاء عندالجمر تین پر ہوتا ہے۔ اس پر نورس ابراہیم (ابراہیم دوم) کے نام کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔(۱۲۸)

(۳) النوری کی حلیۃ الابرار، جس پر ۱۰۳۳ھ درج ہے۔ یعنی یہ کتاب ابراہیم دوم کی ملکیت تھی۔(۱۲۹)

(۴) صحیح بخاری کا ایک نسخہ جس پر محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ تا ۱۰۶۸ھ) کی مہر لگی ہے اور ۱۰۵۹ھ تاریخ درج ہے۔(۱۳۰)

(۵) النووی کی ریاض الصالحین جس پر محمد عادل شاہ کی مہر لگی ہے اور ۱۰۵۹ھ تاریخ درج ہے۔(۱۳۱)

(۶) کتاب الایضاح بتکملۃ ابن الصلاح از ابن حجر العسقلانی، جس پر محمد عادل شاہ کی مہر لگی ہے اور ۱۰۴۶ھ تاریخ درج ہے۔(۱۳۲)

(۷) البغوی کی مصابیح السنۃ کا ایک نسخہ جس پر محمد عادل شاہ کے دستخط ہیں۔(۱۳۳)

(۸) مشکوٰۃ المصابیح کی مکمل نقل، اس پر ۱۰۸۵ھ تاریخ درج ہے۔ جلد دوم پر ایک اندراج سے پتا چلتا ہے کہ یہ نسخہ جلال الدین بن علی نے نقل کیا تھا جو مقبرۂ ابراہیم عادل شاہ دوم کے مدرسہ میں طالب علم تھا۔(۱۳۴)

مذکورۂ بالا کتابوں کے علاوہ جن پر اندراجات موجود ہیں، بیجاپور کے کتب خانہ میں ایسی بہت سی کتابیں تھیں جن پر کوئی مہر یا تاریخ درج نہیں ہے، اور یہ کتابیں لندن میں انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔(۱۳۵)

۲۔ گجرات

اس میں شک نہیں کہ ۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء میں علمِ حدیث کے سرپرستوں کی حیثیت سے مظفر شاہی خاندان کے حکمرانوں کی شہرت ہند کی حدود سے نکل کر دور تک پھیل گئی تھی۔ چنانچہ زبید

میں دمامینی نے اپنی شرح صحیح بخاری کو احمد شاہ اوّل ۸۱۴ تا ۸۴۳ھ/۱۴۱۱ تا ۱۴۴۳ء کے نام معنون کیا تھا، تاہم سخاوی سے قبل کے دور میں گجرات میں حدیث کی تعلیم کو کچھ زیادہ ترقی نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں علماء ساری توجہ عربی اَدبیات پر کرتے تھے اور یہی سبب ہے کہ دمامینی نے بھی عربی صرف و نحو پر کئی مستند کتابوں کی شرحیں لکھیں۔

السخاوی کے دور کی ابتداء میں جب دکن میں سنیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو سلطان محمود بیگڑھ (۸۶۳ تا ۹۱۷ھ/۱۴۵۸ تا ۱۵۱۱ء) کی فیاضی و قدردانی کی بدولت گجرات نہ صرف بیرونی ملکوں سے آنے والے محدثین بلکہ ہمسایہ شیعہ سلطنتوں میں رہنے والے محدثین کے لیے بھی مرجع بن گیا۔ وجیہہ الدین مالکی کو ملک المحدثین کا خطاب دے کر سلطان محمود نے علانیہ طور پر یہ تسلیم کرلیا کہ محدثین بھی اس کی سلطنت کا ایک معزز طبقہ ہیں۔ اس کے بعد احمد آباد، کھمبایت، مہائم، سورت اور نہر والا جیسے مختلف مراکز میں حدیث کی تعلیم کو ترقی ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ حدیث کی مستند کتابیں گجرات میں منگوالی گئیں۔ اس زمانے میں بیرونی ممالک سے کتابیں کس قدر عجلت سے منگوالی جاتی تھیں، اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ فتح الباری جو یمن میں ۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء میں پہنچی تھی، کچھ عرصہ بعد گجرات میں پہنچ گئی۔ کتابیں منگوانے کے علاوہ احادیث کے مقبولِ عام مجموعوں کو نقل کرنے اور فارسی میں ان کا ترجمہ کرنے کا کام بھی ہونے لگا تھا۔ رام پور کے سرکاری کتب خانے میں صحیح مسلم کا ایک مخطوطہ ہے جس پر سلطان محمود اوّل کی مہر لگی ہوئی ہے۔ (۱۳۶) اور حصن حصین کا ایک فارسی ترجمہ جس کا انتساب اسی بادشاہ کے نام کیا گیا ہے، انڈیا آفس کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

سلطان محمود کا جانشین مظفر شاہ دوم (۹۱۷ تا ۹۳۲ھ/۱۵۱۱ تا ۱۵۲۵ء) خود بھی محدث تھا اور اس نے فتح الباری کا ایک نسخہ پیش کرنے کے صلے میں مخاطب علی خاں کو بروچ کی جاگیر عطا کر دی تھی، جس سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان کے دل میں احادیثِ رسولؐ کی کتنی زیادہ قدر و منزلت تھی۔

گجرات میں علمِ حدیث کی اشاعت میں رکاوٹیں بھی ہوتی رہیں۔ سلطان بہادر شاہ (۹۳۲ تا ۹۴۳ھ/۱۵۲۶ تا ۱۵۳۷ء) کے عہدِ حکومت میں مغل شہنشاہ ہمایوں نے ۴۲-۹۴۱ھ

(۳۵-۱۵۳۴ء) میں گجرات پر فوج کشی کی جو تیرہ ماہ تک جاری رہی (۱۳۷) اور اسی حملے کی وجہ سے علی متقی برہان پوری (م ۹۷۵ھ) اور عبداللہ سندھی (م ۹۹۳ھ) جیسے کئی ممتاز محدث ہجرت کر کے حجاز چلے گئے۔(۱۳۸) تاہم عبدالاوّل حسینی (م ۹۶۸ھ) نے گجرات کو نہیں چھوڑا، اور احمد آباد میں علم حدیث پر اپنا تحقیقی کام جاری رکھا۔ سلطان محمود سوم (۹۴۴ تا ۹۶۱ھ/۱۵۳۷ تا ۱۵۵۳ء) کی فیاضی اور سرپرستی کی وجہ سے حجاز سے آنے والے کئی محدثین گجرات میں آباد ہو گئے۔ سلطان محمود کی دعوت پر ہی علی متقی نے دو مرتبہ احمد آباد میں مختصر قیام کر کے حدیث کا درس دیا۔ اس کے علاوہ سلطان محمود نے حرمین کے علماء کو وظائف دے کر ان کی مدد کی، اور مکہ معظمہ میں حدیث کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ بھی تعمیر کروایا۔(۱۳۹) ۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء میں اس فیاض بادشاہ اور اس کے دانشمند وزیر آصف خاں کے قتل کے بعد مظفر شاہی سلطنت بتدریج زوال پذیر ہوتی گئی اور آخر کار ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں شہنشاہ اکبر نے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ جہاں تک کے علمِ حدیث کی ترقی کا تعلق ہے، مظفر شاہی خاندان کے خاتمے سے اس کو شدید نقصان پہنچا اور گجرات میں اشاعتِ حدیث کے لیے محدثین کی سرگرمیاں اتنی سرد پڑ گئیں کہ دسویں صدی ہجری کے بعد گجرات میں ممتاز محدثین کے نام بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔

۳۔ مالوہ

مالوہ کا دارالسلطنت شادی آباد (۱۴۰) مانڈو محمود خلجی (۸۳۹ تا ۸۷۴ھ/۱۴۳۵ تا ۱۴۶۹ء) کے عہدِ حکومت میں، جو علوم و فنون کا سرپرست تھا، (۱۴۱) علمِ حدیث کا ایک مرکز بن گیا۔ السخاوی کے دو شاگرد، جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے، یہاں بغرضِ سکونت آئے تھے اور یہاں جو محدث ہوئے، ان میں شیخ المحدثین سعد اللہ مانڈوی (۱۴۲) (م ۹۰۲ھ) اور مولانا علیم الدین مانڈوی (۱۴۳) کے نام نمایاں ہیں۔ محمود خلجی کو علمِ حدیث سے جو محبت تھی، اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ اس نے مکہ معظمہ میں بابِ ام ھانی میں ایک مدرسہ قائم کر کے حدیث کا درس دینے کے لیے شمس الدین محدث بخاری کو مقرر کیا۔(۱۴۴)

۴۔ خاندیش

برہان پور خاندیش کے فاروقی حکمرانوں کا دارالسلطنت تھا۔ اس کا بانی نصیر خان فاروقی تھا، جس نے اس ریاست کو علمی دنیا میں ایک اونچے درجے پر پہنچا دیا۔ برہان پور (۱۴۵) میں اس کا قائم کردہ مدرسہ دو سو برس تک بہت کامیابی سے جاری رہا اور علمِ حدیث کی اشاعت میں بھی اس نے لازمی طور پر حصہ لیا ہوگا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔

۵۔ سندھ

پانچ سو برس کے طویل وقفے کے بعد دسویں صدی ہجری کے اوّل نصف میں مخدوم عبدالعزیز ابہری (۱۴۶) نے سندھ میں حدیث کی تعلیم کا احیاء کیا۔ عبدالعزیز ایک ممتاز محدث تھے جو ایران میں صفوی حکمرانوں کے تشدد سے تنگ آ کر ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں ہرات سے ہجرت کر کے ایک قصبے کاہان میں آباد ہو گئے تھے جو اس وقت سندھ میں شامل تھا۔ (۱۴۷) مگر اب بلوچستان میں ہے۔ ہند آنے سے قبل عبدالعزیز ہرات میں مدرسہ مرزا عرفی، مدرسہ سلطانیہ اور خانقاہِ اخلاصیہ میں استاذ تھے۔ (۱۴۸) بحیثیت محدث انہوں نے شہزادہ نظام الدین علی شیر (۱۴۹) (م ۹۰۶ھ) کے ایماء پر، جو ہرات میں علم و ادب کا سب سے بڑا سرپرست تھا، مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح منہاج المشکوٰۃ کے نام سے لکھی تھی۔ اس کتاب کا ذکر حاجی خلیفہ نے کیا ہے۔ (۱۵۰) اور اس کا ایک حصہ تاریخ سندھ کے مصنف میر معصوم بھکری (م ۱۰۱۹ھ) کے کتب خانہ میں محفوظ تھا۔ (۱۵۱)

عبدالعزیز ابہری کوئی دس سال تک کاہان میں حدیث اور دوسرے اسلامی علوم کی تعلیم دیتے رہے۔ ۹۲۸ھ/۱۵۲۳ء میں یہیں وفات پائی۔ ان کے دو بیٹے اثیر الدین اور محمد بھی صاحبِ کمال تھے۔

۶۔ لاہور

مولانا مفتی محمد (۹۰۰ تا ۱۰۰۰ھ) کی سرگرمیوں کے باعث لاہور علمِ حدیث کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ مفتی محمد شہر کے ایک ممتاز ترین عالم تھے جو اپنے بکثرت شاگردوں کو جن میں اس دور کے چند نہایت قابل علماء بھی شامل تھے، کئی سال تک صحیح بخاری اور مشکوٰۃ المصابیح کا درس دیتے رہے۔ ان

کتابوں کے ہر درس کے اختتام پر مفتی محمد حاضرین کی تواضع بغرا خان (۱۵۲) (ممکن ہے اسی کو باقر خانی کہا جانے لگا ہو) اور شیرینی سے کرتے تھے۔(۱۵۳)

۷۔ جھانسی اور کالپی

بغداد کے ایک محدث سیّد محمد ابراہیم دسویں صدی ہجری کے وسط میں ہند آئے تھے اور اُنہوں نے پہلے جھانسی میں اور پھر کالپی میں، جو دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے، علمِ حدیث کی تعلیم کا آغاز کیا۔ ایک محدث کی حیثیت سے ان کی شہرت یقیناً دور دور تک پھیل گئی ہو گی۔ کیونکہ مخدوم نظام الدین بھکاری (م ۹۸۱ھ) کاکوری سے جو لکھنؤ سے پندرہ میل کے فاصلے پر شمالی سمت واقع ہے، ان سے اکتسابِ علم کے لیے جھانسی آئے تھے۔ محمد ابراہیم، معالم التنزیل، صحیح بخاری، سنن ابوداود اور جامع الاصول کا درس دیا کرتے تھے۔(۱۵۴)

۸۔ آگرہ

دسویں صدی ہجری میں آگرہ میں حدیث کی اشاعت و تعلیم کے تین ایسے مرکز تھے، جن پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتا تھا۔ (۱) مدرسۂ رفیع الدین صفوی (م ۹۵۴ھ)۔ (۲) مدرسۂ حاجی ابراہیم محدث اکبرآبادی (م ۱۰۱۰ھ) اور (۳) مدرسۂ سیّد شاہ میر (م ۱۰۰۰ھ)۔

(۱) مدرسۂ رفیع الدین صفوی: شہر آگرہ کے قلب میں رفیع الدین صفوی کا مکان واقعہ تھا جو علمِ حدیث کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ اسی مدرسہ میں رفیع الدین کی وفات کے بعد اُن کے شاگرد ابوالفتح خراسانی، تھانیسری (م ۱۰۰۴ھ) کوئی پچاس برس تک حدیث کا درس دیتے رہے۔ منتخب التواریخ کے مشہور مصنف عبدالقادر بدایونی (م ۱۰۰۴ھ) اور کمال الدین حسین شیرازی جیسے کئی قابل علماء اس نامور استاد کے شاگرد تھے۔(۱۵۵)

(۲) مدرسۂ حاجی ابراہیم: حاجی ابراہیم محدث اکبرآبادی نے حدیث کی تعلیم عرب میں حاصل کی تھی۔ اور آگرہ میں دینی علوم بالخصوص حدیث کا درس دینے میں مصروف رہے۔ جلال الدین اکبر کے حکم سے جب وہ عبادت خانہ کی مجلس میں شریک ہوئے تھے تو ایک محدث ہونے کی بناء پر اُنہوں

نے درباری رسوم وآداب پر عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔(۱۵۶)

(۳) مدرسۂ شاہ میر: یہ مدرسہ شیخ بہاء الدین مفتی کے محلّہ میں (۱۵۷) دریائے جمنا کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ سیّد شاہ میر صفوی کے برادر زادہ تھے۔(۱۵۸) اور وہ مشارق الانوار کا درس دیا کرتے تھے۔(۱۵۹)

۹۔ لکھنؤ

دسویں صدی ہجری کے آخر نصف میں مدینہ منورہ کے ایک محدث شیخ ضیاء الدین کی آمد سے لکھنؤ علمِ حدیث کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ شیخ ضیاء الدین اپنے شاگردوں کو جو کثیر تعداد میں تھے، چار برس تک علمِ حدیث کا درس دیتے رہے۔ ان شاگردوں میں مخدوم بھکاری بھی شامل تھے، جنہوں نے ان سے صحیح بخاری اور جامع الاصول کا درس لیا تھا۔ شیخ ضیاء الدین نے غالباً دسویں صدی ہجری کے آخر میں لکھنؤ کے قریب کاکوری میں وفات پائی۔(۱۶۰)

۱۰۔ جون پور

شرقی سلاطین کا دارالسلطنت جون پور ایک مشہور ومعروف علمی شہر بن گیا تھا، اور اس زمانہ میں اس کی شہرت دہلی سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔(۱۶۱) جہاں تک کہ مختلف علوم کی تعلیم کا تعلق ہے جونپور کی کیفیت گجرات میں سخاوی سے قبل کے دور (۸۳۰تا ۸۸۶ھ/ ۱۴۱۷ تا ۱۴۸۱ء) کی حالت سے ملتی جلتی تھی اور یہاں بھی نصابِ تعلیم میں علمِ حدیث کو بہت ہی معمولی جگہ دی گئی تھی۔ اس کے ثبوت میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی (۸۴۹ھ) کی تصانیف پیش کی جا سکتی ہیں، جو اکثر و بیشتر علمِ فقہ اور عربی ادب سے متعلق ہیں۔(۱۶۲) اور علمِ حدیث سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ گجرات کو اپنے محلِ وقوع کی بناء پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ یہاں دوسرے ممالک کے محدثین نے علمِ حدیث کا آغاز کیا تھا اور یہ فضیلت جون پور کو حاصل نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دسویں صدی ہجری تک یہاں کوئی قابلِ قدر سرگرمی ظاہر نہیں ہوتی اور پھر اس صدی میں یہاں علمِ حدیث کا آغاز ہوا جس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ جون پور میں بعض علماء کو زبدۃ المحدثین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔(۱۶۳) ممکن ہے کہ مشرقی سلطنت میں علمِ حدیث کی اشاعت و تعلیم کا آغاز جنوبی ہند کے بعض

مراکز سے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، ہوا ہو۔ یا براہِ راست عرب سے کیا گیا ہو۔ اتفاقاً ہمیں جون پور کے ایک عالم مہذب الدین جونپوری الہندی کا نام ان لوگوں میں نظر آتا ہے، جنہوں نے مکہ معظّمہ میں السخاوی (م ۹۰۲ھ) سے احادیث سماعت کی تھیں۔(۱۶۴) مگر یہ اشارہ اس قدر مجمل ہے کہ اس سے کوئی قطعی نتیجہ اخذ کرنے میں مدد نہیں ملتی۔

۱۱۔ بہار

نویں صدی ہجری کے اختتام تک منیر کے صوفیاء بہار میں علمِ حدیث کے مشعل بردار تھے۔ اس کے بعد پھلواری شریف علمِ حدیث کا مرکز بن گیا۔ اگرچہ شرف الدین منیری کے ایک مرید سیّد منہاج الدین راستی (۱۶۵) نے آٹھویں صدی ہجری میں خانقاہ پھلواری شریف میں حدیث کی تعلیم کا آغاز کر دیا تھا۔ لیکن اسے یہاں دسویں صدی ہجری میں سیّد یاسین کی آمد تک کوئی قابلِ لحاظ ترقی نہیں ہوئی تھی۔ سیّد یاسین رفیع الدین صفوی کے بھتیجے تھے(۱۶۶) اور گجرات میں وجیہہ الدین علوی (م ۹۰۰ھ) اور حجاز کے چند ممتاز محدثین سے علمِ حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔(۱۶۷) سیّد یاسین کی محنت سے یہ خانقاہ حدیث کی تعلیم و اشاعت کا ایک مرکز بن گئی جس کا اظہار اس سند سے ہوتا ہے جو سیّد یاسین نے شیخ عتیق بن عبدالسمیع کو دی تھی، جس میں مسلسل تین واسطے محدثین پھلواری یعنی عبدالمقتدر، ان کے والد عبدالنبی اور عبدالرزاق کے نام درج ہیں۔ ان میں سے عبدالنبی اور عبدالرزاق کو علمِ حدیث پر زبردست عبور حاصل ہونے کی بناء پر شیخ الوقت اور حافظ الوقت کا لقب دیا گیا تھا۔ اور شیخ عتیق خود بھی نور الحق بن عبدالحق دہلوی (م ۱۰۷۰ھ) کے شاگرد تھے۔(۱۶۸)

۱۲۔ بنگال

بنگال کا بادشاہ علاء الدین حسین شاہ بن سیّد اشرف المکی (۹۰۰ تا ۹۲۴ھ/ ۱۴۹۳ تا ۱۵۱۸ء)(۱۶۹) بنگالی زبان اور ادب کا اوّلین سرپرست قرار دیا گیا ہے۔(۱۷۰) اور اسی بادشاہ کی وجہ سے اس سلطنت میں علمِ قرآن و علمِ حدیث کو بھی ترقی حاصل ہوئی۔ ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء میں بنگال کا بادشاہ ہونے کے بعد حسین شاہ نے دور و نزدیک کے علماء کو بنگال آنے اور یہاں سکونت پذیر ہونے کی دعوت دی، اور ان کی سرپرستی کرنے لگا۔ یکم رمضان ۹۰۷ھ (مارچ ۱۵۰۲ء) کو اس نے غور میں

جواب ضلع مالوہ میں شامل ہے، بمقام غرہ شہید ایک عظیم الشان مدرسہ دینی علوم کی تعلیم دینے کی غرض سے قائم کیا۔(۱۷۱) اس نے پانڈوہ (ضلع مالوہ) میں بھی ایک مشہور ولی نور قطب عالم کی یادگار کے طور پر ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور اس کے مصارف کے لیئے زمین وقف کر دی تھی۔(۱۷۲) اُن مدرسوں میں علمِ حدیث نصابِ تعلیم کا لازمی حصہ تھا۔ جس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ دارالسلطنت اکدالا میں حدیث کے عالم موجود تھے اور صحیح بخاری جیسی کتب احادیث نقل کی گئی تھیں۔ علمِ حدیث کی حوصلہ افزائی کرنے میں حسین شاہ اپنے ہم عصر سلاطینِ گجرات کا ہم پایہ تھا۔ اس کے ایماء پر محمد بن یزدان بخش نے جو خواجگی شروانی کے نام سے معروف ہیں،(۱۷۳) اکدالا کے شاہی خزانہ کے لیے ۹۱۱ھ/۱۵۰۳ء میں صحیح بخاری کو تین جلدوں میں نقل کیا تھا جو کتب خانہ بانکی پور میں موجود ہیں۔(۱۷۴)

سنارگاؤں۔ حنبلی فقیہہ ابوتوامہ (م ۷۰۰ھ) کی وجہ سے سنارگاؤں سادات کے عہدِ حکومت (۹۰۰ تا ۹۴۵ھ/۱۴۹۳ تا ۱۵۳۸ء) میں ایک علمی مرکز کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ مشرقی بنگال کا مستقر ہونے کے باعث سنارگاؤں ایک خوش حال شہر تھا، جہاں اسلامی مدارس اور علماء موجود تھے۔ مسجدوں اور مقبروں کے کتبوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں اس زمانے میں نہ صرف علماء بلکہ محدثین بھی موجود تھے۔ چنانچہ ایک مسجد قدوۃ الفقہاء والمحدثین تقی الدین بن عین الدین نے جو مشہور محدث اور فقیہہ تھے، ۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء میں نصرت بن حسین شاہ (۹۲۴ تا ۹۳۹ھ/۱۵۱۸ تا ۱۵۳۳ء) کے عہدِ حکومت میں تعمیر کروائی تھی۔(۱۷۵) اس لیے ہم محتاط طور پر یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ سادات کے عہدِ حکومت میں سنارگاؤں میں علمِ حدیث کی تعلیم مقبول و مروج تھی۔

حواشی:

(۱) لاء، کتابِ مذکور، ص ۸۳-۸۵۔

(۲) ایضاً، ص ۱۰۶۔

(۳) ہیگ، کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، ج ۳، ص ۳۱۲۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۵۶۔

(۴) مسلمانوں کی بستیاں ساحلِ مالابار، معبر اور گجرات میں قائم کی گئی تھیں۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، ندوی، عرب و ہند کے تعلقات، ص ۲۶۵، ۳۰۳۔

(۵) ضیاء الدین، تحفۃ المجاہدین، حیدر آباد، ص ۱۴، ۲۱۔ تارا چند، کتابِ مذکور، ص ۲۵، آرنلڈ، کتاب مذکور، ص ۲۶۵۔ ڈھاکا یونیورسٹی جرنل، ج ۱۶، ۱۹۴۲ء، ص ۸۲، مضمون: Early Expansion of Islam in South India

(۶) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۳، ص ۳۵۰-۳۵۳۔

(۷) مسعودی، مروج الذھب، مرتبہ ینارڈ، پیرس، ج ۱، ص ۳۸۲، ندوی، کتابِ مذکور، ص ۲۶۹، ۲۸۰، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۳۔

(۸) ندوی، کتابِ مذکور، ص ۲۷۹، حوالۂ عجائب الہند، از بزرگ بن شہریار، لائیڈن، ۱۸۳۶ء، ص ۱۴۴۔

(۹) ابنِ بطوطہ، کتابِ مذکور، ج ۴، ص ۶۵-۶۷۔

(۱۰) ایضاً، ص ۷۹-۸۰۔

(۱۱) ایضاً، ص ۸۱-۸۲۔ ہیلی وہی ہے جسے اب ماؤنٹ ڈلی کہتے ہیں۔ یہ بھارت کے صوبہ مدراس میں کنانور کے شمال میں ۱۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ گب Ibn Battutah, Travels in Asia and Africa، لندن، ۱۹۲۹ء، ج ۲، ص ۲۱۶، ندوی، کتاب مذکور، ص ۲۹۲۔

(۱۲) ابن بطوطہ، سفرنامہ، ص ۶۶، ۶۸، ۸۰، ۸۸۔ ندوی، کتابِ مذکور، ص ۲۹۵۔

(۱۳) معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۵۴-۲۵۳۔

(۱۴) شاہ ولی اللہ دہلوی، الانصاف، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۹۰۹ء، ص ۷۷، ۷۷، ۸۰۔

(۱۵) ابنِ بطوطہ، سفرنامہ، ص ۶۶، ۶۸، ۷۸، ۸۰، ۸۸، ۹۰۔

(۱۶) فرشتہ، تاریخ، ج ۱، ص ۳۰۲۔

(۱۷) ابن العماد، شذرات، ج ۷، ص ۲۷۰-۲۷۳۔

(۱۸) ایضاً، ج ۸، ص ۱۵-۱۷۔ عبدالقادر العید روسی، النور السافر عن اخبار القرن العاشر، بغداد، ۱۹۳۴ء، ص ۱۷-۲۰۔

(۱۹) ایضاً، ص ۱۲۲، ۱۲۳۔ ابن العماد، شذرات، ج ۸، ص ۱۳۴، ۱۳۶۔

(۲۰) عیدروسی، النور السافر، ص ۲۸۷-۲۹۳۔ ابن العماد، شذرات، ج ۳، ص ۲۷۰، ۲۷۱۔

(۲۱) عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ج ۳ (مخطوطہ تذکرۂ بدرالدمامینی۔ لوتھر، Catalogue of Arabic Manuscripts in the India Office Liberary، لندن، ۱۸۷۷ء، ص ۲۶۷، نمبر ۹۶۴۔

(۲۲) السخاوی، الضوء اللامع، قاہرہ، ۱۳۵۲ھ، ج ۷، ص ۱۸۵، ۱۸۶۔

(۲۳) حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ج ۲، ص ۵۲۹، صدیق حسن خان۔ اتحاف النبلاء، بھوپال، ص ۵۳۔ الحطہ، کانپور، ۱۲۸۳ھ، ص ۹۳، مصابیح الجامع کے ایک پرانے مخطوطے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کو

زبید میں ماہِ ربیع الاوّل ۸۱۸ھ میں مکمل کیا تھا۔ اتحاف النبلاء اور الحطہ میں یہ سال ۸۲۸ھ لکھا ہے جو درست نہیں، اور ۸۱۸ کے بجائے غلطی سے لکھ دیا گیا ہے۔ ۸۲۷ میں تو دمامینی کا انتقال ہو گیا تھا۔

(۲۴) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، حوالۂ مذکور، یادِ ایام، ص ۳۶۔

(۲۵) دمامینی، المنہل الصفی فی شرح الغرفی، المقدمہ، مخطوطہ کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد، دکن، ج ۲، ۱۶۵۸ء، نمبر ۵۰۔ اقتباسات احمد شاہ بہمنی، از مولوی ظہیر الدین، مطبوعہ حیدرآباد، ۱۹۳۶ء، ص ۳۵-۱۳۲ میں درج کیے گئے ہیں۔

(۲۶) سخاوی، الضوء اللامع، ج ۷، ص ۸۶-۱۸۵۔ ابنِ العماد، شذرات، ج ۷، ص ۸۲-۱۸۱۔ شوکانی، البدر الطالع، قاہرہ، ۱۳۴۸ھ، ج ۲، ص ۱۵۰ و مابعد۔

(۲۷) دمامینی، المنہل الصفی، حوالۂ مذکور۔

(۲۸) سخاوی، الضوء اللامع، حوالۂ مذکور۔

(۲۹) ان کی تصانیف کے لیے ملاحظہ ہو بروکلمن، ص ا، ص ۲۶، ۲۷۔

(۳۰) سیوطی، بغیۃ الوعاۃ، مصر، ص ۲۷۔

(۳۱) فہرس الخدیویہ، ج ا، ص ۴۲۲۔

(۳۲) سخاوی، الضوء، اللامع، حوالۂ مذکور، شاہ عبدالعزیز دہلوی، بستان المحدثین، دہلی، ۱۸۹۸ء، ص ۱۸-۱۱۷۔

(۳۳) قاموس التراجم، ج ۳، ص ۸۷۲۔

(۳۴) کتاب کا پورا نام تعلیق المصابیح علی ابواب جامع الصحیح، صدیق حسن، اتحاف النبلاء، ص ۴۱۔

(۳۵) ابنِ ندیم، الفہرست، ج ا، ص ۳۷۶۔

(۳۶) فلانی، قطف الثمر، ضمیمہ، رسائل، الاسانید، ج ۱-۴، حیدرآباد، ۱۳۲۸ھ، ص ۳۴۔

(۳۷) ایضاً، ص ۱۵۔

(۳۸) لے اسٹرینج، کتابِ مذکور، ص ۲۸۴۔

(۳۹) عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۳۴۔

(۴۰) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۳، تذکرہ احمد بن عبداللہ شیرازی۔

(۴۱) ابراہیم کردی، الامم، رسائل اسانید، ص ۵، قطف الثمر، ۱۳-۱۵۔ محسن الترہی الیانع الجامع، دہلی ۱۲۸۷ھ، ص ۲۶-۳۲۔

(۴۲) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۳، حوالۂ مذکور۔

(۴۳) اب بھارت کے صوبہ گجرات میں شامل ہے۔

(۴۴) ابنِ فہد، معجم، مخطوطہ بانکی پور، نمبر ۲۴۲۹، و ۲۹۸ ب، ۱۲۹۹ الف، سخاوی، کتابِ مذکور، ج ۱۰، ص ۲۳۳۔

(۴۵) ملاحظہ ہو، محمود گاوان کی ریاض الانشاء، مخطوطہ، حبیب گنج، خط نمبر ۲۱۔ Proceedings of Indian Historical Records Commission، شملہ، ۱۹۴۱ء، مضمون: Riyad-al-Insha as a Source Book of Decan History، ہارون خاں شروانی، ص ۱۷۱، فرشتہ، تاریخ، ج ۱، ص ۳۵۸۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۳، ص ۱۳۵ و مابعد۔

(۴۶) لے اسٹرینج، کتاب مذکور، ص ۱۷۲، سخاوی، کتاب مذکور، ج ۲، ص ۹۴-۹۶۔

(۴۷) ایضاً، ج ۱۰، ص ۱۴۴، ۱۴۵۔ عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ج ۳، تذکرہ عماد الدین محمود کیلانی۔

(۴۸) لاء، کتاب مذکور، ص ۸۷، غلطی سے روضۃ الانشاء کو ریاض الانشاء سمجھ لیا۔

(۴۹) انڈین، ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن، حوالۂ مذکور۔

(۵۰) ہیگ، کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، ج ۳، ص ۴۲۰۔

(۵۱) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، حوالۂ مذکور، لاء، کتاب مذکور، ص ۸۷، فرشتہ، تاریخ، ج ۱، ص ۳۵۹۔

(۵۲) سخاوی، الضوء اللامع، ج ۱۰، ص ۱۴۵۔

(۵۳) فرشتہ، تاریخ، ج ۲، ص ۳۶۰۔

(۵۴) مرتضٰی حسین، حدائق الاقالیم، مخطوطہ، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

(۵۵) سخاوی، کتاب مذکور، ج ۱۰، ص ۱۴۴ اور ج ۲، ص ۹۴۔

(۵۶) سخاوی، کتاب مذکور، ج ۱۱، ص ۱۲۵۔

(۵۷) ایضاً، ج ۱، ص ۳۱۶۔

(۵۸) ایضاً، ج ۶، ص ۴۳۔

(۵۹) فہرست بانکی پور، ج ۵ (۲)، ص ۷۱۔

(۶۰) سخاوی، کتاب مذکور، ج ۴، ص ۲۳۴۔

(۶۱) ایضاً، ج ۷، ص ۲۷۸، ۲۸۸۔

(۶۲) ایضاً، ج ۴، ص ۹۰-۹۱۔

(۶۳) عیدروسی، النور السافر، ص ۲۰۲، ۲۰۳۔

(۶۴) الغ خانی، ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۱۱۸۔

(۶۵) یہ سخاوی کے شاگرد تھے۔ ابن العماد، شذرات، ج ۸، ص ۳۰۱۔

(۶۶) الغ خانی، کتاب مذکور، ص ۱۱۷۔

(۶۷) ایضاً، ص ۱۱۸۔

(۶۸) عیدروسی، نور السافر، ص ۱۰۲، ابن العماد، شذرات، ج ۸، ص ۹۴۔

(۶۹) سخاوی، الضوء اللامع، ج ۳، ص ۱۴۷-۱۴۸۔

(۷۰) عیدروسی، نور السافر، ص ۱۴۷۔

(۷۱) شافعی فقہ پر اُن کی تصانیف کے لیے ملاحظہ ہو، بروکلن، ضمیمہ ا، ص ۵۵-۵۵۴۔

(۷۲) الغ خانی، ظفر الوالہ، ص ۱۱۹۔ عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۱۳، ۳۴۔

(۷۳) عیدروسی، نور السافر، ص ۱۴۳، ۱۵۱۔

(۷۴) ایضاً، ص ۱۴۶۔ ابن العماد، شذرات، ج ۸، ص ۷۷-۱۷۶۔ الغ خانی، ظفر الوالہ، ص ۱۱۹۔

(۷۵) عیدروسی، نور السافر، ص ۱۴۷۔

(۷۶) فہرست کتب، ج ۱، نمبر ۵۹۔

(۷۷) معارف، ج ۲۴، ش ۴، ص ۲۵۸۔

(۷۸) براؤن۔ A Literary History of Persia: Browne، لندن، ۱۹۳۱ء، ج ۴، ص ۱۸-۲۰، ۲۲۔

(۷۹) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۲۳۶-۲۳۵۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۳۷۶۔

(۸۰) ترکی میں قزلباش، فارسی میں سرخ سر، صفوی سلسلہ کے پیرو تھے۔ براؤن، کتابِ مذکور، ج ۴، ص ۴۸۔

(۸۱) بدایونی، منتخب التواریخ، ببلیو انڈیکا، ۱۸۶۹ء، ج ۳، ص ۱۳۶۔ ترجمہ ہیگ، کلکتہ، ۱۹۲۵ء، ج ۳، ص ۱۸۴۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۲۵۶۔ براؤن، کتابِ مذکور، ص ۱۹۔

(۸۲) یا سلطان سکندر لودھی (۸۹۴ھ-۹۲۳ھ) کے عہد میں، مطابق، اخبار الاخیار۔

(۸۳) فہرست بانکی پور، ج ۵ (۲)، ص ۲۱۹۔

(۸۴) لاء، کتابِ مذکور، ص ۷۳ و مابعد۔

(۸۵) بدایونی، منتخب التواریخ، ص ۱۲۹۔ ہیگ، ص ۱۸۳۔

(۸۶) معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۵۸۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۲۳۶۔

(۸۷) عیدروسی، نور السافر، ص ۲۵۶۔

(۸۸) ایضاً، ص ۳۶۴ و مابعد۔ ابنِ العماد، شذرات، ج ۳، ص ۱۸-۴۱۷۔ عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۳۴۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۶۰۔

(۸۹) الغ خانی، ظفر الوالہ، ج ۲، ص ۶۴۰۔ عیدروسی، نور السافر، ۴۰۴-۴۰۵۔ شذرات، ج ۸، ص ۲۷-۴۲۶۔

(۹۰) ابنِ العماد، شذرات، ص ۴۲۳۔

(۹۱) ایضاً، ص ۵۸-۲۵۶۔ یہ کتاب ابھی طبع نہیں ہوئی۔ تاہم مخطوطہ نسخے بمبئی اور سورت میں موجود ہیں۔

(۹۲) عیدروسی، نور السافر، ص ۳۵۰-۳۵۸۔

(۹۳) ایضاً، ص ۷۹-۳۷۲۔ ابن العماد، شذرات، ج ۸، ص ۲۴-۳۵۸۔

(۹۴) عیدروسی، نور السافر، ص ۴۰۹۔

(۹۵) ایضاً، ص ۲۵۶۔

(۹۶) ایضاً، ص ۴۰۹-۴۰۷۔ ابن العماد، شذرات، ص ۴۲۷-۴۲۸۔

(۹۷) بدایونی، منتخب التواریخ، ص ۲۲۰-۲۲۱۔ بیگ، ص ۴۴۲-۴۴۴۔ ابوالفضل، آئینِ اکبری، ج ۱، ص ۵۴۰۔ ابوالفضل، اکبرنامہ، ج ۳، ص ۲۷۸۔ رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۳-۲۲۴۔

(۹۸) بدایونی، منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۱۷۰۔ آزاد بلگرامی، مآثر الکرام، چوں در ہندگشت اکبر بادشاہ برائے تعلیم شاہزادہ، گردید، ص ۲۰۸۔

(۹۹) جمال الدین، روضۃ الاحباب کے مشہور مصنف، اپنے چچا اصیل الدین شیرازی (م ۸۸۳ھ) کے مرید تھے۔ ابراہیم کردی، الامم، ص ۶۹۔

(۱۰۰) ایضاً، عبداللہ بن سالم بصری، کتاب الامداد (رسائل الاسانید، ج ۳) ص ۵۵۔ قطف الثمر، ص ۲۸۔

(۱۰۱) مرقاۃ فی شرح مشکوٰۃ کے مقدمہ میں ملا علی قاری کے بیان کی بناء پر آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان، ص ۶۷ اور مآثر الکرام، ص ۲۰۷ میں یہ لکھا ہے کہ بعض دوسرے ہندی علماء کی طرح ملا علی القاری نے بھی مشکوٰۃ المصابیح کا درس ہند میں میر کلاں سے لیا تھا۔ لیکن راقم کو اس بیان سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ مرقاۃ کے مقدمہ میں علی القاری نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ ہند آئے تھے اور یہاں حدیث کا درس لیا تھا۔ اس مقدمہ کے پڑھنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ علی القاری نے شیخ عطیہ السلمی، علی متقی (م ۹۷۵ھ) اور میر کلاں سے جو استاد کی حیثیت سے مکہ معظمہ میں طویل قیام کی بناء پر شیخ الحرم المکی کہے جاتے تھے، مشکوٰۃ کا درس لیا تھا۔ یہ سب مکہ کے علماء تھے اور قریب قریب ہم عصر بھی تھے۔ (مرقاۃ مطبوعہ قاہرہ) اس واقعہ سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ علی القاری نے میر کلاں سے مشکوٰۃ کا درس مکہ میں لیا تھا نہ کہ ہند میں، مذکورۂ بالا حقائق کی روشنی میں ہم علامہ سید سلیمان ندوی کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ ملا علی القاری اپنے وطن ہرات سے ہند آئے تھے اور اکبر آباد میں میر کلاں سے مشکوٰۃ کا درس لیا تھا۔ کیونکہ ان کی یہ رائے آزاد بلگرامی کے بیان پر مبنی ہے۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۶۶-۲۶۷۔

(۱۰۲) ابراہیم کردی، الامم، حوالۂ مذکور۔

(۱۰۳) آزاد، سبحہ، ص ۶۷، مآثر، ص ۲۰۷۔ صدیق حسن، ابجد، ص ۹۰۴۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۳۸۵۔ رحمان علی، تذکرہ علماء، ص ۲۳۰-۲۳۱۔ لیکن بدایونی کے بیان کے مطابق ۹۸۱ھ۔ منتخب، ص ۱۵۱۔ بیگ، ص ۲۱۱۔ بلگرامی، کتابِ مذکور، ص ۲۶۶-۲۶۷۔ ملاحظہ ہو: معارف، ج ۲۲، ش ۴۔

(۱۰۴) ابن العماد، شذرات، ج ۸، ص ۱۵، ۱۶۔

(۱۰۵) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۳، ص ۱۳۰۔

(۱۰۶) ہیگ، کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، ج ۳، ص ۴۲۳، ۲۶-۴۲۵۔

(۱۰۷) ایضاً، ص ۴۳۳۔

(۱۰۸) فرشتہ، تاریخ، ج ۲، ص ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۳۲، ۶۱، ۶۲، ۱۴۸، ۱۵۰۔

(۱۰۹) ایضاً۔

(۱۱۰) ایضاً، ۲۲۰۔ سب الشیخین۔

(۱۱۱) ایضاً، ص ۱۵۱۔

(۱۱۲) ایضاً، ج ۱، ص ۲۰-۳۱۹۔

(۱۱۳) ایضاً، ج ۱، ص ۳۰۲۔

(۱۱۴) ایضاً، ص ۳۰۷۔

(۱۱۵) ایضاً، ص ۳۳۳۔ ظہیر الدین، ص ۱۲۲، ۱۲۴۔

(۱۱۶) یہ مخطوطہ حبیب گنج کے کتب خانہ میں تھا۔ معارف، ج ۱۱، ش ۲، ص ۹۹۔

(۱۱۷) فرشتہ، تاریخ، ج ۲، ص ۵۶۔ بشیر احمد، واقعاتِ مملکتِ بیجاپور، آگرہ، ۱۹۱۵ء، ج ۱، ص ۹۹، ۲۲۲۔

(۱۱۸) بشیر احمد، کتابِ مذکور، ص ۳۰۹۔ ابراہیم زبیری، بساطین السلاطین، حوالہ در فہرست بانکی پور، ج ۵ (۱)، ص ۵۴۔

(۱۱۹) فرشتہ، تاریخ، ج ۲، ص ۷۶۔

(۱۲۰) بشیر احمد، کتابِ مذکور، ج ۲، ص ۲۵، ۲۸-۳۱۔

(۱۲۱) موئے مبارک، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، بشیر احمد، کتابِ مذکور، ج ۱، ص ۳۰۷۔ ج ۲، ص ۳۴ و مابعد۔

(۱۲۲) ایضاً، ج ۱، ص ۲۷۴۔ ج ۲، ص ۳۴۔ انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کی روداد، ج ۱۲، ۱۴، ۱۹۴۰ء، ص ۱۲۵۔

(۱۲۳) اس کتب خانہ کی باقیات انڈیا آفس لائبریری میں منتقل کر دی گئی ہیں۔ لوتھر، فہرست مذکور، دیباچہ، ۷۔

(۱۲۴) اسیر گڈھ کے لیے فرشتہ، تاریخ، ج ۲، ص ۲۷۷ اور بیدر کے لیے ہیگ، کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، ج ۳، ص ۴۳۳ ملاحظہ ہو۔

(۱۲۵) لوتھر، فہرست، نمبر ۲۱، ۲۹۹، ۴۲۶، ۹۹۴، ۹۹۵۔

(۱۲۶) معارف، ج ۴۰، ش ۲، ص ۹۸-۹۹۔

(۱۲۷) یہ محمود گاوان کا لقب تھا۔ ہیگ، کیمبرج، ہسٹری، ج ۳، ص ۳۹۶۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۲، ص ۱۳۵۔

(۱۲۸) لوتھر، فہرست نمبر ۲۱۱، ۴۲۶، ۹۶۷، ۹۹۴۔

(۱۲۹) کتب خانہ حبیب گنج، معارف، ج ۱۱، ش ۲، ص ۹۸-۹۹۔

(۱۳۰) اورینٹل لائبریری، بانکی پور، فہرست، ج ۵، ح ۱، نمبر ۱۶۵۔

(۱۳۱) لوتھر، فہرست انڈیا آفس لائبریری، نمبر ۳۴۰۔

(۱۳۲) ایضاً، نمبر ۳۰۔

(۱۳۳) ایضاً، نمبر ۱۶۸۔

(۱۳۴) ایضاً، نمبر ۱۹۸۔

(۱۳۵) ایضاً، نمبر ۱۴۹۔

(۱۳۶) ایضاً، نمبر ۱۵۲-۱۵۳۔

(۱۳۷) لوتھر، فہرست مذکور، دیباچہ، ۵-۶۔ نمبر ۲۳۔ ۱۲۰، ۱۲۶، ۱۲۵، ۳۶-۱۳۵۔ ۱۵۱، ۱۵۸، ۱۶۴، ۱۸۸، ۱۹۶ اور ۲۰۰۔

(۱۳۸) معارف، ج ۲۶، ش ۲، ص ۱۲۶ و مابعد۔

(۱۳۹) الغ خانی، ظفر الوالہ، ج ۱، ص ۲۶۰ اور اشاریہ۔

(۱۴۰) ایضاً۔

(۱۴۱) ایضاً، ج ۱، ص ۲۱۳۔

(۱۴۲) یہ وسطی ہند میں واقع ہے، ۱۲،۲۱ درجہ شمال اور ۲۶، ۷۵ درجہ مشرق، گزیٹر آف انڈیا، ج ۱۷، ص ۱۷۱۔

(۱۴۳) فرشتہ، تاریخ، ج ۱، ص ۲۴۳، لاء، کتاب مذکور، ص ۹۶-۹۷۔

(۱۴۴) فرشتہ، تاریخ، ص ۲۵۷۔

(۱۴۵) عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر، ج ۴۔

(۱۴۶) سخاوی، الضوء اللامع، ج ۱۰، ص ۱۴۸۔

(۱۴۷) لاء، کتاب مذکور، ص ۹۹، ۲۵۹۔

(۱۴۸) ابہار صوبۂ جبال میں تھا۔ لے اسٹرینج، کتاب مذکور، ص ۲۲-۲۲۱۔

(۱۴۹) میر معصوم، تاریخ سندھ، مرتبہ داؤد پوتہ، پونا، ۱۹۳۸ء، ص ۷۶۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۲۳۵۔

(۱۵۰) عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر، ج ۴، تذکرہ عبدالعزیز ابہری۔

(۱۵۱) علی شیر کے لیے ملاحظہ ہو، ریو Persian Catalogue:Rieu، ج ۱، ۳۶۶ الف۔

(۱۵۲) حاجی خلیفہ، کشف الظنون، فلوگل، ۵، ۳۰۵۔

(۱۵۳) ص ۷۷۔

(۱۵۴) میر معصوم، تاریخ سندھ، ص ۷۶۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۲۳۵ میں اصیل الدین لکھا ہے۔

(۱۵۵) ایک پکوان جو بغرا خان شاہ خراسان کی ایجاد ہے۔ ہیگ، کیمبرج ہسٹری، ص ۲۱۵، این ۴۔

(۱۵۶) بدایونی، منتخب التواریخ، ص ۱۵۴، ہیگ، ص ۲۱۵۔

(۱۵۷) علی حیدر، تذکرۂ مشاہیر کاکوروی، ص ۴۴۷۔ عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ج ۴، تذکرۂ محمد ابراہیم بغدادی۔

(۱۵۸) بدایونی، منتخب ص ۱۲۶، ۱۲۹۔ بیگ، ص ۱۸۷، ۱۸۸۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۶، معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۵۹-۲۵۱۔

(۱۵۹) بدایونی، منتخب، ص ۱۳۹۔ بیگ، ص ۱۹۶۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۷، معارف، ۶۶-۲۶۵۔

(۱۶۰) بیگ، ہسٹری، ص ۷۸، این ۲۔

(۱۶۱) بدایونی، منتخب، ص ۱۰۹۔ بیگ، ص ۱۶۲۔

(۱۶۲) ایضاً، ص ۱۹-۱۲۰۔ بیگ، ۷۷-۱۷۴۔

(۱۶۳) علی حیدر، تذکرۂ مشاہیر کاکوری، عبدالحیٔ حسنی، نزھۃ الخواطر، ج ۴، تذکرہ ضیاء الدین۔

(۱۶۴) لاء، کتابِ مذکور، ص ۹۹، ۱۰۰، ۲۵۹۔

(۱۶۵) بروکلمن، ضمیمہ ا، ص ۳۰۹۔

(۱۶۶) معارف، ج ۲۵، ش ۵، ص ۳۴۷۔

(۱۶۷) سخاوی، کتابِ مذکور، ج ۳، ص ۸۷۔

(۱۶۸) معارف، ج ۲۳، ش ۵، ص ۳۶۱۔

(۱۶۹) یاسین شاہ میر کے بنی عم تھے۔ بدایونی، منتخب التواریخ، ص ۱۲۰؛ جو صفوی کے بھتیجے تھے۔ ایضاً، ۱۰۹۔ بیگ، ص ۱۶۲۔

(۱۷۰) ایضاً، ص ۱۲۰، ۱۲۱۔ بیگ، ص ۱۶۶، ۱۶۷۔

(۱۷۱) معارف، ج ۳، ش ۵، ص ۳۳۳۔

(۱۷۲) بیگ، کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، ج ۳، ص ۷۲-۲۷۰۔

(۱۷۳) دینش چندر سین، History of Bengali Literature، کلکتہ، ۱۹۱۱ء، ص ۱۲-۱۴، ۲۲۲۔

(۱۷۴) لاء، کتابِ مذکور، ص ۱۱۰، این ۳، ریون شاہ (Ravenshaw): Gour، لندن، ۱۸۷۸ء، ص ۸۰۔
ابوالحسنات، کتابِ مذکور، ص ۵۴، ۵۵۔

(۱۷۵) لاء، کتابِ مذکور، ص ۱۰۹۔ اسٹیورٹ (Stewart): History of Bengal، لندن، ۱۸۱۳ء، ص ۱۱۳۔

(۱۷۶) یہ آذربائیجان کے مقام شروان کے باشندہ تھے۔ لے اسٹرینج، کتابِ مذکور، ص ۱۵۹۔

(۱۷۷) ج ۵، ح ۱، ش ۱۳۰-۱۳۲۔

(۱۷۸) معارف، ج ۳۳، ش ۲، ص ۱۱۸-۱۲۴، مضمون بنگال میں علمِ حدیث از حکیم حبیب الرحمٰن، ڈھاکا۔

باب پنجم

ہندی محدثین

۸۲۰ سے ۹۹۲ھ تک (۱۴۱۷ تا ۱۵۸۴ء) پھیلے ہوئے دور میں ہند میں محدثین کی آمد سے اس ملک میں علمِ حدیث کی ترقی و ترویج کی کوششوں کو بہت تقویت حاصل ہوئی۔ اور اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ شوقین اور مستعد طالبانِ علم نے تحصیلِ علمِ حدیث کے لیے دور و نزدیک مقامات کا سفر اختیار کیا جس سے الرحلہ فی طلب العلم کی یاد تازہ ہوگئی جو قدیم ایام میں طالبِ علم کی ایک عام خصوصیت تھی۔ شروع میں تو یہ سفر ہند کے مختلف مقامات تک محدود رہے پھر علمِ حدیث حاصل کرنے کا شوق جب بڑھنے لگا تو حرمین میں ممتاز محدثین سے حدیث کا درس لینے کا جذبہ بھی ترقی کرنے لگا۔ ان دنوں بادبانی جہازوں میں سفر کیا جاتا تھا، اس لیے بحری سفر میں نہ صرف مشکلات پیش آتی تھیں، بلکہ یہ خطرناک بھی تھا۔ لیکن علمِ حدیث کے متلاشیوں کے عزم کو کوئی شے بھی کمزور نہ کرسکتی تھی۔ اور عبدالاوّل حسینی (م ۹۶۸ھ) سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۲ھ) تک ہمارے تمام ممتاز محدثین اپنے زمانہ طالب علمی میں اس شدید آزمائش سے گزرے۔

اس دور کے پہلے ہندی طالبِ علم جنہوں نے تحصیلِ علمِ حدیث کے لیے عرب کا سفر کیا، جمال اللہ گلبرگوی تھے۔ وہ ۸۴۵ھ/۱۴۴۱ء میں اپنے والد خواجہ شمس الدین کے ساتھ مکہ معظمہ گئے اور تقی الدین بن فہد، زین الدین الامیوتی ابوالفتح المراغی اور احمد الواسطی جیسے ممتاز محدثینِ مکہ سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ عبدالاوّل نے ۲۹ ربیع الاول ۹۰۷ھ (اکتوبر ۱۵۰۱ء) کو مکہ معظمہ میں وفات پائی۔

جمال اللہ کے بعد بہت سے دوسرے طالب علم بھی مکہ معظمہ گئے اور اس کی شہادت ان ہندی طلباء کی مندرجہ ذیل فہرست سے ملتی ہے۔ انہوں نے حرمین میں شمس الدین السخاوی (م ۹۰۲ھ) سے حدیث کا درس لیا۔

۱۔ احمد بن ابراہیم اودھی، ہندی، حنفی۔ جو صحیح بخاری کے ایک شوقین طالب علم تھے اور جن کو السخاوی نے اجازہ حافلہ عطا کیا تھا۔(۲)

۲۔ احمد بن علی ہندی۔(۳)

۳۔ احمد بن محمد ہندی۔(۴)

۴۔ حافظ بن مہذب جونپوری۔(۵)

۵۔ حافظ بن الیاس ہندی۔(۶)

۶۔ زاہد بن عارف بن جلال لکھنوی، ہندی۔ اُنہوں نے ماہِ رمضان ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں مکہ معظمہ میں السخاوی کو النووی کی اربعین سنائی تھی۔(۷)

۷۔ علی بن عبداللہ کھمبایتی۔(۸)

۸۔ عمر بن بہاء الدین کھمبایتی(۹)

۹۔ قاسم بن داؤد احمد آبادی۔ اُنہوں نے اپنے بھائی راجح کے ساتھ صحیح بخاری کا درس لیا تھا۔(۱۰)

۱۰۔ مقبل ہندی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُنہوں نے السخاوی کے ساتھ بکثرت مطالعۂ حدیث کیا تھا۔(۱۱)

۱۱۔ مسعود بن احمد کھمبایتی۔ اُنہوں نے مدینہ منورہ میں السخاوی سے درسِ حدیث لیا تھا۔(۱۲)

۱۲۔ نعم اللہ بن نعمت اللہ گلبرگوی نزیل مکہ(۱۳)

۱۳۔ عطاء اللہ بن احمد محمد آبادی۔ اُنہوں نے السخاوی سے مسلسل احادیث سماعت کیں۔(۱۴)

۱۴۔ ابوبکر بن علی بن فخر الدین دہلوی (م ۸۷۳ھ)(۱۵)

۱۵۔ راجح بن داؤد احمد آبادی۔ یہ ۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء میں احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ۸۹۹ھ/۱۴۹۳ء تک معقولات اور عربی ادب پر کامل عبور حاصل کر لیا۔ اپنے چچا سلیمان(۱۶) اور بھائی قاسم کے ساتھ اُنہوں نے ۸۹۹ھ میں مکہ معظمہ میں السخاوی سے ملاقات کی، اور ان کی صحیح بخاری کا بڑا حصہ، النووی کی اربعین، سنائی اور السخاوی کی

تصانیف(۱۷) مثلاً عمدہ اور شرح التقریب للنووی کے درس لیے۔ السخاوی نے ان کو اجازہ حافلہ عطا کیا تھا، جس میں اسلامی علوم میں ان کی قابلیت کی بہت تعریف کی تھی۔(۱۸)

ممکن ہے کہ مذکورۂ بالا طلباء میں سے کچھ لوگ حج کے لیے مکہ معظمہ گئے ہوں اور وہاں موقع سے فائدہ اُٹھا کر السخاوی کے درس میں شامل ہو گئے ہوں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ نویں صدی ہجری کے اختتام تک نہ صرف مغربی اور جنوبی ہند کے ساحلی مقامات میں بلکہ شمالی ہند کے مراکز میں بھی علمِ حدیث کی تعلیم و اشاعت کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا تھا۔(۱۹) اور بجا طور پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا طلباء میں سے کچھ لوگ تحصیلِ علمِ حدیث کی خاطر ہی حجاز گئے تھے۔

دسویں صدی ہجری میں ہندی مسلمانوں نے علمِ حدیث کی ترقی و اشاعت کے لیے جو خدمات انجام دیں، ان کی بنا پر یہ صدی ایک امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ اس متبرک کام کے لیے طلباء کی دو جماعتوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ ایک جماعت ان طلباء پر مشتمل تھی جو مستقل طور پر ہجرت کر کے عرب چلے گئے تھے تاکہ مقدس حدودِ حرمین میں علمِ حدیث کی تعلیم حاصل کریں، اور وہاں کے ممتاز محدثین اور مستند کتب احادیث سے واقفیت اور فائدہ حاصل کریں۔ دوسری جماعت مقامی طلباء یا اُن لوگوں پر مشتمل تھی جنہوں نے عرب میں حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی اور ہند میں حدیث کی تعلیم دینے اور اس موضوع پر کتابیں لکھنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ اس طرح ہندی محدثین نے علمِ حدیث کی مشعل کو ہند اور عرب میں بہ یک وقت روشن رکھا۔ اور ان کی خدمات کا یہ سلسلہ تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں دیوبند میں دارالعلوم اور سہارن پور میں مظاہر العلوم کے قیام تک جاری رہا۔ یہ دَور دو صدیوں سے زیادہ مدت پر مشتمل تھا۔ پہلی جماعت کے محدثین کا تذکرہ اس کتاب کے حصۂ دوم میں کیا جائے گا۔ دوسری جماعت سے تعلق رکھنے والے محدثین کا مختصر حال ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

فصل اوّل: ۸۷۵ تا ۱۰۳۰ھ/ ۱۴۷۰ تا ۱۶۲۱ء

نویں صدی ہجری کے وسط سے گیارہویں صدی ہجری تک کے محدثین جنہوں نے خود اپنا کوئی مسلّمہ دبستان قائم نہیں کیا

ا۔ ابوبکر بن محمد بھروچی (م ۹۱۵ھ/ ۱۵۰۹ء):

ابوبکر گجرات کے شہر بھروچ کے ایک محدث تھے۔ وہ سلطان محمود شاہ اوّل (۸۶۳ تا ۹۱۷ھ/ ۱۴۵۹ تا ۱۵۱۱ء) فرمانروائے گجرات کے عہد میں بقیدِ حیات تھے۔ ان کا انتقال غالباً دسویں صدی ہجری کے اوّل ربع میں ہوا۔ ان کے حالاتِ زندگی کا علم نہیں ہے۔ (۲۰)

(۱) ترجمہ حصن حصین (ایتھے، انڈیا آفس، نمبر ۲۶۴۱، بانکی پور، ۱۶، نمبر ۱۴۱۸):

یہ الجزری (م ۸۳۳ھ) کی حصن حصین کا فارسی ترجمہ تشریح کے ساتھ ہے۔ احادیث کے اس مجموعہ میں ان احادیث کا خاص طور پر حوالہ دیا گیا ہے، جو آنحضرت کی دُعاؤں سے متعلق ہیں۔ ابوبکر نے یہ کتاب سلطان محمود اوّل بادشاہ گجرات کے لیے مرتب کی تھی اور یہ ۲۴ رذی الحجہ ۹۱۰ھ (مئی ۱۵۰۵ء) کو مکمل ہوئی تھی۔

(۲) عین الوفا ترجمۂ شفاء (آصفیہ، ۱، ۶۸۲، نمبر ۴۸۷): یہ قاضی عیاض کی شفاء کا فارسی ترجمہ ہے۔

۲۔ میر سیّد عبدالاوّل حسینی زید پوری (م ۹۶۸ھ/ ۱۵۶۰ء):

عبدالاوّل دکن کے باشندہ تھے۔ ان کا آبائی وطن زید پور تھا جو جون پور کے قریب ایک موضع ہے۔ اور ان کے اجداد ترکِ وطن کر کے دکن چلے گئے تھے۔ اُنہوں نے حدیث کی تعلیم اپنے دادا علاء الدین حسینی سے حاصل کی جو حسین فتحی کے شاگرد تھے اور حسین کے استاد شمس الدین الجزری (م ۸۳۳ھ) تھے۔ (۲۱) دسویں صدی ہجری کے اوّل ربع میں عبدالاوّل گجرات سے منتقل ہو گئے، غالباً اس کا سبب فرقہ واری مناقشات تھے۔ اس کے بعد اُنہوں نے کئی سال حرمین میں گزارے، اور علمِ حدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رہے۔ ۹۴۱ھ/ ۱۵۳۴ء سے قبل وہ احمد آباد واپس

آئے۔(۲۲) اور علمِ حدیث اور دوسرے اسلامی علوم کی ترقی و اشاعت کے لیے بڑی محنت سے کام کیا۔ کبرسنی میں وہ تصوف کی طرف بہت مائل ہو گئے اور صوفیوں کی مستغرق زندگی بسر کرنے لگے۔ خانِ خاناں بیرم خاں کی دعوت پر عبدالاوّل ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء میں دہلی گئے تھے، اور دو سال کے بعد وہیں وفات پائی۔(۲۳)

تصانیف:

(۱) فیض الباری فی شرح البخاری:(۲۴)

صحیح بخاری کی یہ شرح اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلی کتاب ہے جو ہند میں لکھی گئی۔(۲۵) غالباً یہ اب مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔ شرح کے حصہ اوّل کے صرف چند اجزاء عثمان بن ابراہیم سندھی کی تصنیف غایته التوضیح للجامع الصحیح میں محفوظ ہیں۔

(۲) منتخب کتاب سفر السعادہ (۱۷ ایس۔ پی نمبر ۹۹۶ پر):(۲۶)

یہ کتاب ذاتِ نبوی سے متعلق احادیث کا مجموعہ ہے جو فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) کی کتاب سفر السعادہ سے منتخب کر کے فارسی میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ یہ کتاب دس ابواب میں منقسم ہے اور ۹۴۹ھ/۱۵۴۳ء میں احمد آباد میں دو مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی تھی۔ ایک تو ہمایوں کے حملے سے بچاؤ جو اس زمانے میں دہلی سے گجرات کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا،(۲۷) اور دوسرے طاعون سے حفاظت جو اس وقت شدت سے پھیلا ہوا تھا۔(۲۸)

۳۔ خواجہ مبارک بن مخدوم ارجانی، رہتکی، بنارسی، (م ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء):

خواجہ مبارک کے بکھرا میں پیدا ہوئے تھے، جہاں ان کے اجداد رہتک سے آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے آباو اجداد کا اصل وطن ارجان تھا جو فارس میں ہے(۲۹) اور اسی نسبت سے وہ ارجانی کہے جاتے تھے۔ مبارک نے اپنے والد مخدوم ارجانی سے جو ایک معروف صوفی عالم تھے، تعلیم حاصل کی۔ مخدوم نے اپنے بیٹے کو اسلامی علوم کی بہت اچھی تعلیم دی تھی۔ اور عالمِ دین ہونے کے علاوہ مبارک انتظامی قابلیت بھی رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ شیر شاہ سوری (۹۴۶ تا ۹۵۲ھ) کے عہد میں وزیر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مبارک نے ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء میں چونار کے قلعہ میں وفات

پائی۔(۳۰)

تصانیف:

مدارج الاخبار (بانکی پور، نمبر ۳۶۴، حدیث) البغوی کی مصابیح السنۃ کی ترتیب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، خواجہ مبارک نے الصغانی کی مشارق الانوار میں شامل احادیث کو موضوع وار مرتب کیا اور اس کا نام مدارج الاخبار رکھا۔(۳۲) اس کا مخطوطہ بانکی پور میں موجود ہے(۳۳) جو ایک نادر نسخہ ہے۔ یہ مخطوطہ پچیس کتابوں میں منقسم ہے۔ ہر کتاب کی ذیلی تقسیم ابواب میں کی گئی ہے اور بعض ابواب فصلوں میں بھی تقسیم کیے گئے ہیں۔(۳۴)

۴۔ شیخ بھکاری کاکوروی (۸۹۰ تا ۹۸۱ھ/۱۴۸۵ تا ۱۵۷۳ء):

نظام الدین بن امیر سیف الدین جو مخدوم بھکاری کے نام سے معروف ہیں ایک مشہور صوفی عالم تھے۔ وہ ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں لکھنؤ کے قریب کاکوروی میں پیدا ہوئے تھے، اُنہوں نے جھانسی میں ابراہیم بن محمد بغدادی سے اور لکھنؤ میں ضیاء الدین محدث مدنی سے صحیح بخاری، سنن ابوداؤد اور جامع الاصول کا درس لیا۔ مخدوم بھکاری نے المنہاج کے نام سے اصولِ حدیث پر ایک رسالہ قلمبند کیا۔(۳۶) جس کا مخطوطہ بمع ان کی سندِ حدیث کے غالباً کاکوروی کی خانقاہ میں موجود ہے، جہاں ان کے اخلاف ابھی تک رہتے ہیں۔ مخدوم بھکاری نے ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء میں وفات پائی۔(۳۷)

۵۔ شیخ عبدالمالک عباسی گجراتی (۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء):

عبدالمالک نے حدیث کی تعلیم اپنے بھائی قطب الدین سے حاصل کی تھی، جو سخاوی کے شاگرد تھے وہ حافظِ قرآن تھے اور اُنہوں نے صحیح بھی حفظ کر لیا تھا۔ عبدالمالک نے اپنی تمام زندگی خدمتِ حدیث کے لیے وقف کر دی تھی اور آخر عمر تک گجرات میں حدیث کا درس دیتے رہے۔ اُنہوں نے ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء میں وفات پائی۔(۳۸)

۶۔ طاہر پٹنی (۹۱۴ تا ۹۸۶ھ/۱۵۰۸ تا ۱۵۷۸ء):

جمال الدین محمد بن طاہر بن علی پٹنی، ہندی، حنفی مشہور و معروف ملک المحدثین تھے وہ

۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء میں شمالی گجرات میں بمقام نہروالا، پٹن پیدا ہوئے تھے۔ اپنی والدہ کی طرف سے وہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ (م ۱۳ھ) کی اولاد میں تھے۔ اُنہوں نے گجرات میں شیخ ناگوری استادِ زماں ملامہتہ اور دوسرے علماء سے تعلیم حاصل کی۔ ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء میں وہ مکہ معظّمہ میں علی متقی کے مدرسے میں شریک ہوئے اور چھ سال تک وہاں حدیث کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اپنے محبوب استاد علی متقی کے علاوہ جن کا ذکر طاہر نے اپنی تصانیف کے مقدمہ میں بہت احترام سے کیا ہے، (۳۹) اُنہوں نے دوسرے محدثینِ مکہ سے بھی درسِ حدیث لیا، جن میں ابنِ حجر الہیثمی ابوالحسن البکری اور مفتی قطب الدین نہروالی زیادہ ممتاز ہیں۔ ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء کے قریب گجرات واپس آنے کے بعد محمد طاہر نے اپنی تمام صلاحیتیں تین مقاصد کے حصول کے لیے مرتکز کر دیں۔ (۱) پٹن میں واقع اپنے مدرسے کے ذریعہ گجرات میں علمِ حدیث کی اشاعت (۲) علمِ حدیث پر کتابوں کی تدوین اور (۳) اپنے ہم فرقہ بوہروں کے عقائد کی اصلاح جو سیّد محمد مہدی جون پوری کے معتقد بن گئے تھے۔ محمد طاہر بہت اچھے مصلح تھے، اور ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر یہ پوری نہ ہوسکیں کیونکہ ۶ رشوال ۹۰۶ھ/۱۵۷۸ء کو اجین اور سارنگ پور کے درمیان ایک مقام پر مہدویوں نے ان کو قتل کر دیا۔ (۴۰)
علمِ حدیث پر طاہر پٹنی کی تصانیف نے جو درجِ ذیل ہیں، ان کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

تصانیف:

(۱) المغنی فی ضبط الرجال (۴۱) (مطبوعہ):

یہ طاہر پٹنی کی پہلی تصنیف ہے جو اُنہوں نے عرب سے واپس آنے کے فوراً بعد پٹن میں ذیلقعدہ ۹۵۲ھ/ جنوری ۱۵۴۶ء (۴۲) میں لکھی تھی۔ یہ مختصر لیکن بہت جامع تصنیف ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ راویانِ حدیث اور ان کے آباو اجداد کے نام، کنیت اور لقب، جن کے غلط پڑھے جانے کا احتمال ہے، صحیح طور پر پڑھے جائیں۔ ایسے تمام ناموں یا مشتبہات کو مصنف نے حروفِ تہجی کے لحاظ سے مرتب کیا ہے۔ ہر ایک حرف کے تحت مشتبہ ناموں پر بحث کے آخر میں تمام مشتبہ نسبتوں کا صحیح ضبط بھی درج کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ راویوں کے مختصر حالات اور ان کے متعلقہ طبقہ کے بارے میں مختصر نوٹ بھی قلم بند کیے ہیں۔ نیز پیغمبروں اور مناسب مقامات کے ایسے نام بھی جن میں شبہ پیدا

ہونے کا امکان ہے، واضح طور پر لکھے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری صفحات میں آنحضرت ﷺ، خلفائے راشدینؓ، مذاہب اربع کے اماموں اور صحاح کے مصنفوں کے مختصر حالات بھی درج کیے گئے ہیں۔

یہ کتاب دہلی میں دو مرتبہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء اور ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں ابنِ حجر کی تقریب التہذیب کے حاشیے پر طبع کی جا چکی ہے۔(۴۳)

(۲) تذکرۃ الموضوعات (مطبوعہ):

اس کتاب میں مصنف نے موضوع اور ضعیف احادیث جمع کر دی ہیں جو ان کے پیش رووں کی لکھی ہوئی موضوعات، مثلاً سیوطی کی کتاب اللالی، کتاب الذیل اور کتاب الوجیز، السخاوی کی مقاصد الحسنہ، فیروز آبادی کی مختصر کتاب المغنی فی العراقی، الصغانی کی الموضوعات وغیرہ سے اخذ کی گئی ہیں۔(۴۴) یہ احادیث موضوع کے اعتبار سے ۲۲۶ ابواب میں مرتب کی گئی ہیں۔ ان کا آغاز کتاب التوحید(۴۵) سے اور اختتام باب فی ساعت رحمۃ و شفاعت النبی ﷺ پر ہوتا ہے۔(۴۶) ہر ایک حدیث سے قبل اس کا ماخذ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے خود اپنی رائے ظاہر کی ہے مثلاً یہ کہ مذکورہ حدیث باطل، بے اصل یا موضوع ہے۔ یا یہ کہ ایک یا کئی راوی ضعیف، کذاب یا وضاع ہیں۔ یا یہ کہ دوسرے نقادوں مثلاً احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، بخاری (م ۲۵۶ھ)، نسائی (م ۳۰۳ھ) دار قطنی (م ۳۸۵ھ)، ابن حبان (م ۳۵۴ھ)، ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ)، صغانی (م ۶۵۰ھ)، ذ(م ۷۴۸ھ)، عراقی (م ۸۰۶ھ) اور ابنِ حجر الہیثمی (م ۹۵۲ھ) کی رائے کے ساتھ خود اپنے استاد متقی (م ۹۷۵ھ) کی رائے بھی درج کر دی ہے۔ یہ کتاب ماہِ ذیقعدہ ۹۵۸ھ/ نومبر ۱۵۵۱ء میں مکمل ہوئی تھی جس کا ثبوت ایک مخطوطہ سے ملتا ہے جو کتب خانۂ بانکی پور میں موجود ہے۔(۴۷) ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں مصر میں مصنف کی قانون الموضوعات کے ساتھ طبع کی گئی تھی۔

(۳) قانون الموضوعات والضعفاء:

یہ تذکرۃ الموضوعات کا ایک ضمیمہ ہے۔ اس میں مختصر طور پر تمام ضعیف اور کاذب راویوں کا احاطہ کیا گیا ہے، اور ان کے نام حروفِ تہجی کے لحاظ سے درج کیے گئے ہیں۔ مصنف نے اس ک

میں راویوں کے حالات لکھ کر ان کے بارے میں کوئی تفصیلی معلومات نہیں دی ہیں جیسا کہ میزان الاعتدال یا لسان المیز ان میں کیا گیا ہے بلکہ ان راویوں کے صرف نام اور ہر ایک کے بارے میں نقادوں کی رائے قلمبند کی ہے۔

(۴) اسماء الرجال (بانکی پور، ۱۲، نمبر ۷۳۰):

اس کتاب میں راویانِ حدیث کے حالاتِ زندگی قلمبند کیے گئے ہیں۔ یہ تین فصلوں میں منقسم ہے، پہلی فصل متعدد انواع پر مشتمل ہے اور اس کا بڑا حصہ نبی کریم ﷺ کے مختصر حالاتِ زندگی کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ دوسری فصل صرف دو ورقعوں پر مشتمل ہے، جس میں دوسرے پیغمبروں کا کچھ حال بیان کیا گیا ہے۔ تیسری فصل دو حصوں یا نوع میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا حصہ دس ممتاز ترین صحابہ یعنی عشرۃ المبشرۃ کے بارے میں ہے اور دوسرے حصے میں جو پوری کتاب کا بھی بڑا حصہ ہے، دوسرے صحابہ و صحابیات، تابعین اور دوسرے محدثین کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اور ان کی ترتیب حروفِ تہجی کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ (۴۸)

(۵) مجمع بحار الانوار (۴۹) (مطبوعہ):

یہ غرائب یعنی قرآن اور حدیث کے مشکل اور غیر معمولی الفاظ کی ضخیم لغت ہے جو بہت مقبول ہے۔ یہ تصنیف اصل کتاب، خاتمہ اور تکملہ پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ اس میں مصنف نے قرآن، صحاح ستہ اور مشکوٰۃ المصابیح کے تقریباً تمام غرائب درج کر دیئے ہیں (۵۰) اور جو کچھ باقی بچ گئے ہیں، وہ تکملہ میں درج کر دیے گئے۔ الفاظ حروفِ تہجی اور ان کے مصادر کے لحاظ سے مرتب کیے گئے ہیں۔ ہر ایک مصدر کے ذیل میں اس کے تمام مشتقات مع متعلقہ قرآنی آیات و احادیث اور ان کی تاویلات کے قلم بند کیئے گئے ہیں۔ اگرچہ اس لغت کا بنیادی ماخذ ابن کثیر کی النہایہ ہے تاہم طاہر پٹنی نے دوسری کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے، جن میں القسطلانی اور کرمانی کی شرح البخاری، النوی کی شرح مسلم، الطیبی کی شرح مشکوٰۃ، ابن اثیر کی شرح جامع الاصول، زرکشی کی حاشیۃ البخاری اور ناظر عین الغریبین، مفاتیح شرح المصابیح، مدارک التنزیل، تفسیر البیضاوی وغیرہ شامل ہیں۔ (۵۱) جہاں تک کہ خاتمہ (۵۲) کا تعلق ہے، طاہر پٹنی نے اسے علمِ حدیث پر بحث

کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس میں فنِ حدیث، وضاع اور موضوع احادیث کے بارے میں اپنی کتاب تذکرہ سے اور مشتبہ ناموں کی صحیح قرآت یعنی ضبط کے متعلق اپنی ایک اور کتاب المغنی سے اقتباسات درج کیے ہیں۔ رسولِ کریم ﷺ کی زندگی کے اہم واقعات اور آخر میں کئی مشہور راویانِ حدیث کے حالات بھی قلمبند کیے ہیں۔ مختصر یہ کہ مجمع بحار الانوار کو بجا طور پر قرآن مجید اور صحاح ستہ کی مختصر شرح اور علمِ حدیث کی کلید کہا جا سکتا ہے۔ یہ گراں قدر کتاب جسے طاہر پٹنی نے اپنے استاد علی متقی کی زندگی میں یعنی ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء سے قبل لکھنا شروع کیا تھا، تقریباً سات برس کی مدت میں مکمل ہوئی۔(۵۳) یہ نول کشور پریس، لکھنؤ میں دوسری بار ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء میں طبع کی گئی تھی۔ نواب صدیق حسن کی رائے ہے کہ طاہر پٹنی نے اس کتاب کو جسے ساری دنیا میں پسند کیا گیا اور علماء نے جسے قابلِ قدر قرار دیا، لکھ کر تمام اسلامی دنیا کو ممنونِ احسان کر دیا ہے۔(۵۴)

۷۔ شیخ طیب سندھی (۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء):

شیخ طیب سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم مولانا یوسف سندھی سے حاصل کی اور اس کے بعد احمد آباد میں عبدالاوّل حسینی (م ۹۶۸ھ) سے حدیث کا درس لیا۔ اُنہوں نے برار کے شہر ایلچ پور اور برہان پور میں پچاس برس تک علمِ حدیث کی تعلیم دی۔ اور دسویں صدی ہجری کے آخر میں وفات پائی۔(۵۵) جمال الدین محدث برہان پوری نے صحیح بخاری شروع سے آخر تک برہان پور میں شیخ طیب سے پڑھی تھی۔(۵۶)

تصنیف:

تعلیقات علیٰ مشکوٰۃ المصابیح۔(۸۷)

۸۔ شیخ عبداللہ انصاری سلطان پوری (م ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء):

شیخ عبداللہ عالم اور محدث تھے۔ ان کو شہنشاہ ہمایوں (۹۳۷ تا ۹۴۶ھ/۱۵۳۰ تا ۱۵۳۹ء) نے مخدوم الملک کا خطاب دیا تھا(۵۸) اور اسی نام سے وہ مشہور ہیں۔ دہلی کے افغان سلاطین کے عہد میں وہ علماء کے سردار رہے۔(۵۹) شہنشاہ اکبر (۹۶۳ تا ۱۰۱۴ھ/۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء) کے عہد میں وہ راسخ العقیدہ علماء کے قائد تھے اور اسی وجہ سے اُن کو اور ان کے ساتھی علماء کو بہت تکالیف برداشت

کرنا پڑیں۔(۶۰) جب وہ حج کے لیے مکہ معظمہ گئے تو ان کے علم وفضل کی وجہ سے ابنِ حجر الہیثمی جیسے نامور عالم نے ان کا بہت احترام کیا۔(۶۱) مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد(۶۲) مخدوم الملک نے ۹۹۰ھ/۱۵۸۳ء میں گجرات میں وفات پائی۔(۶۳) وہ ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں سلطان پور میں پیدا ہوئے تھے۔(۶۴)

تصانیف:

(۱) شرح علی شمائل النبی (۶۵): یہ ترمذی کی شمائل النبی کی شرح ہے۔

(۲) عصمت الانبیاء: (بانکی پور، جلد ۱۰، نمبر ۵۶۹) یہ کتاب مقدمہ اور تین فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ اسے مصنف نے شہزادہ معز الدین محمد کامران (۹۶۴ھ) کے نام معنون کیا تھا۔

۹۔ شیخ عبدالنّبی گنگوہی (م ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء):

شیخ عبدالنبی مخدوم الملک کے ہم عصر اور مشہور ولی شیخ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۵ھ) کے پوتے تھے، اور حدیث کی تعلیم ابن حجر الہیثمی سے حاصل کی تھی۔(۶۶) مطالعۂ حدیث کا ان پر اس قدر اثر ہوا کہ اُنہوں نے سماع کو ترک کر دیا جس کی خاندانی روایات کے مطابق انہیں تربیت دی گئی تھی، کیونکہ اس زمانے میں سماع کو صوفیاء کی زندگی کا ایک لازمہ تصور کیا جاتا تھا۔(۶۷) شیخ عبدالنبی؛ اکبر کے استاذ تھے۔(۶۸) اور اس نے اُنہیں صدر الصدور(۶۹) مقرر کیا تھا۔ وہ اس عہدۂ جلیلہ پر ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء تک فائز رہے۔ پھر فیضی (م ۱۰۰۴ھ) کی ایک سازش کی بدولت معتوب ہوگئے۔(۷۰) عبداللہ سلطان پوری کے ساتھ اُن کو بھی موت کی دھمکی دے کر اکبر کے مذہبی فرمان پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔(۷۱) عبدالنبی نے ۱۲/ربیع الاوّل ۹۹۰ھ/ مارچ ۱۵۸۲ء کو آگرہ میں وفات پائی۔(۷۲)

تصانیف:

(۱) سنن الھدا فی متابعۃ المصطفیٰ (بوحار نمبر ۱۳۱ اے۔ ایس۔ بی نمبر ۵۰۰، رام پور نمبر ۱۸۵)(۷۳): یہ احادیث کا مجموعہ ہے جو کتبِ احادیث صحیحہ سے منتخب کی گئی ہیں۔ اور دینی فرائض

اوران کی ادائیگی کے بارے میں ہیں۔ یہ کتاب ایک مقدمہ، تین ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ابواب کی ذیلی تقسیم فصلوں میں کی گئی ہے۔(۷۴)

(۲) وظائف الیوم واللیل النبویہ(۷۵): یہ دُعاؤں سے متعلق احادیث کا مجموعہ ہے۔

۱۰۔ شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی (۹۱۰ تا ۹۹۸ھ / ۱۵۰۴ تا ۱۵۸۰ء):

احمد آباد کے ایک نامور عالم شیخ وجیہہ الدین، عماد الدین تریمی (م ۹۴۱ء) اور شیخ غوث گوالیاری (م ۹۷۰ھ) کے شاگرد تھے۔(۷۶) وہ محرم جون ۱۵۰۴ء میں چمپانیر میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے احمد آباد میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جوان کی زندگی ہی میں ترقی کر کے ایک بڑا مرکز بن گیا تھا۔(۷۷) وجیہہ الدین نے شرح جامی سے لے کر تفسیر بیضاوی تک مختلف نوعیت کی تیس کتابوں کی شرحیں اور حواشی لکھے۔ اُنہوں نے ابنِ حجر کی نزھۃ النظر فی شرح نخبۃ الفکر کی شرح بھی شرح شرح نخبۃ الفکر کے عنوان سے لکھی تھی جو بانکی پور(۷۸)، رام پور(۷۹) اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔

شیخ وجیہہ الدین علوی نے محرم ۹۹۸ھ/ فروری ۱۵۸۰ء میں احمد آباد میں وفات پائی۔(۸۰)

۱۱۔ شیخ طاہر بن یوسف سندھی برہانپوری (م ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء):

شیخ طاہر گجرات میں کچھ کے قریب پتری میں پیدا ہوئے تھے اور ابتدائی تعلیم شیخ شہاب الدین سندھی سے حاصل کی تھی۔ ۹۵۰ھ/ ۱۵۴۳ء مین وہ گجرات گئے اور احمد آباد میں عبدالاوّل حسینی سے حدیث کا درس لینے گئے۔ یہ نصاب مکمل کرنے کے بعد وہ تصوف کی طرف مائل ہو گئے اور مشہور ولی حضرت غوث گوالیاری (م ۹۷۰ھ) نے ان کو حلقۂ صوفیاء میں شامل کر لیا۔ مولانا طیب سندھی(۸۱) کے ساتھ وہ برہان پور گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اور ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۵ء میں یہیں وفات پائی۔(۸۲)

تصانیف:

(۱) تلخیص شرح اسماء الرجال البخاری لکرمانی (۸۳): یہ کرمانی کی شرح اسماء الرجال البخاری کا خلاصہ ہے۔

(۲) ملتقت جمع الجوامع (۸۴): یہ السیوطی کی جمع الجوامع کا انتخاب ہے۔

(۳) شرح البخاری: یہ صحیح بخاری کی شرح ہے جو القسطلانی کی ارشاد الساری فی شرح البخاری پر مبنی ہے۔(۸۵)

(۴) ریاض الصالحین: یہ کتاب تین روضات پر مشتمل ہے۔ پہلا روضہ مستند احادیث کا انتخاب ہے۔ اور دوسرا تصوف پر مقالات اور تیسرا امتاز صوفیاء کے ملفوظات پر مشتمل (۸۶) ہے۔

۱۲۔ شیخ یعقوب بن حسن صرفی، کشمیری (۹۰۸ تا ۱۰۰۳ھ/۱۵۰۲ تا ۱۵۹۵ء):

شیخ یعقوب، حضرت مجدد الف ثانی سیّد احمد سرہندی (م ۱۰۳۴ھ) کے استاذ حدیث ہونے کی بنا پر مشہور ہوئے۔ ۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء میں شیخ یعقوب کشمیر میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے وطن میں تعلیم پائی۔ پھر معقولات اور فقہ کی تعلیم بخارا میں حاصل کی۔ اس کے بعد ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء میں ابنِ حجر الہیثمی سے تحصیلِ علم کے لیے مکہ معظّمہ گئے۔(۸۷) فارسی شاعری میں وہ شاہ آنی کے شاگرد تھے، جنہیں عبدالرحمٰن جامی (م ۸۰۸ھ) سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ شیخ یعقوب کا تخلص صرفی تھا۔ کچھ مدت کے بعد، جب وہ کشمیر میں درس دیا کرتے تھے، اُنہوں نے دوبارہ حجاز کا سفر کیا اور وہاں ایک سال مقیم رہے۔ یہاں اُنہوں نے تفسیر، حدیث اور فقہ پر کتابیں جمع کیں اور اپنے مدرسہ میں اُن کی تعلیم دینے لگے۔ ذوالقعدہ ۱۰۰۳ھ (جولائی ۱۵۹۵ء) کو شیخ یعقوب صرفی نے کشمیر میں وفات پائی۔(۸۸)

تصانیف:

(۱) شرح صحیح بخاری: یہ صحیح بخاری کی شرح تھی، جو غالباً زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہی۔

(۲) تفسیر القرآن: یہ قرآن مجید کی نامکمل تفسیر ہے، جو دارالمصنفین، اعظم گڑھ میں محفوظ

ہے۔(۸۹)

(۳) رسالہ اذکار:

(۴) مغازی النبوہ: یہ سیرتِ نبوی پر ایک منظوم رسالہ ہے۔(۹۰)

۱۳۔ حاجی محمد کشمیری (م ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۷ء):

ابن حجر الہیثمی (۹۱) کے ایک شاگرد حاجی محمد کشمیری تھے۔(۹۲) جو شیخ یعقوب صرفی کے ہم عصر تھے۔ ان کے اجداد امیر کبیر علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ) کے ساتھ اس ملک میں آئے تھے اور حاجی محمد نے امیر ہمدانی ہی کی خانقاہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ مکہ معظمہ میں ابنِ حجر کے مدرسہ میں شریک ہونے سے قبل حاجی محمد نے دہلی میں بھی تعلیم پائی۔ اُنہوں نے مدینہ منورہ کے ممتاز محدثین سے بھی حدیث کا درس لیا۔(۹۳) حاجی محمد کو مختلف علوم پر گہرا عبور حاصل تھا اور اُنہوں نے اٹھارہ کتابیں لکھیں جن میں فارسی میں قرآن پاک کی ایک تفسیر بھی شامل ہے۔(۹۴) علمِ حدیث پر اُنہوں نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھی ہیں:

(۱) شرح شمائل النبیؐ: (بانکی پور ۱۱۸۲، پر۔ بحار، نمبر ۱۵۹)۔ یہ ترمذی کی شمائل النبیؐ کی شرح ہے جو فارسی میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب خانقاہِ علی ہمدانی میں، جو کشمیر میں تھی، جمادی الاوّل ۹۸۸ھ / جون ۱۵۸۰ء میں مکمل ہوئی تھی۔(۹۵)

(۲) شرح مشارق الانوار: یہ کتاب فارسی میں ہے۔

(۳) کتاب خلاصۃ الجامع فی جمع الحدیث: یہ متفرق احادیث کا مختصر مجموعہ ہے۔

(۴) شرح حصن حصین: (بانکی پور، ۱۶، نمبر ۱۴۱۹۔ اے۔ ایس۔ بی نمبر ۹۹۳، فارسی)(۹۶) یہ الجزری کی حصن حصین کی مختصر شرح ہے۔ جو فارسی میں ہے اور یہ بھی خانقاہِ علی ہمدانی میں لکھی گئی تھی۔ جیسا کہ خود مصنف نے بیان کیا ہے یہ اُن کی آخری تصنیف ہے۔

۱۴۔ مولانا عثمان بن عیسیٰ بن ابراہیم صدیقی، حنفی، سندھی (م ۱۰۰۸ھ/ ۱۶۰۰ء):

شیخ عثمان سندھ کے ایک مقام بسکن کے باشندہ تھے۔ گجرات میں شیخ وجیہہ الدین علوی (م ۹۹۸ھ)، قاضی محمد موری اور شیخ حسین بغدادی سے تحصیلِ علم کیا۔ ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء میں شیخ عثمان برہان پور گئے تھے جہاں فاروقی خاندان کے حکمران محمد شاہ بن مبارک شاہ (۹۷۴ تا ۹۸۴ھ/ ۱۵۶۶ تا ۱۵۷۶ء) نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنے ملک کا مفتی بنا دیا۔ اس عہدہ پر وہ سترہ برس تک فائز رہے۔ آخر عمر میں وہ اپنے آبائی گاؤں بسکن میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ جہاں شعبان ۱۰۰۸ھ/ فروری ۱۶۰۰ء میں ڈاکوؤں نے ان کو مع سترہ افراد خاندان کے قتل کر دیا۔ معقولات اور منقولات کے عالم ہونے کے علاوہ مولانا عثمان علمِ طب پر بھی عبور رکھتے تھے۔ اور اسی لیے حکیم بھی کہے جاتے تھے۔ (۹۷)

تصانیف:

(۱) غایت التوضیح للجامع الصحیح: (۹۸) یہ صحیح بخاری کی شرح ہے۔ جو کتب خانۂ انڈیا آفس (۹۹) اور کتب خانۂ آصفیہ میں (جلد ۱، نمبر ۲۲۰) موجود ہے۔

کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ یہ کتاب کرمانی، عسقلانی اور قسطلانی کی شرحوں اور سیّد عبدالاوّل حسینی کی ایک شرح فیض الباری کے حصۂ اوّل سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ نو فصلوں پر مشتمل ہے، جن میں علمِ حدیث، امام بخاری اور محدثین وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ شرح متن کے حواشی پر مشتمل ہے۔ متن کے فقروں کا پہلا لفظ لکھ کر قولہ سے آغاز کیا گیا ہے۔ (۱۰۰)

(۲) العقائد السنّیۃ: یہ پچاس صفحے کا ایک رسالہ ہے جو دہلی کے فاروقی پریس نے ۱۳۰۹ھ میں شائع کیا تھا۔ اس میں اہلِ سنت کے عقائد پر بحث کی گئی ہے جو قرآن اور احادیث پر مبنی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قرونِ اولیٰ کے علمائے دین کی آراء بھی پیش کی گئی ہیں۔ اس رسالہ میں جن مآخذ کا حوالہ

دیا گیا ہے، ان میں کرمانی اور قسطلانی کی شروح صحیح بخاری اور علی متقی برہان پوری کی منہاج العمال زیادہ اہم ہیں۔ یہ رسالہ سات فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۵۔ شیخ منور بن عبدالمجید بن عبدالشکور لاہوری (م ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۲ء):

شیخ منور لاہور کے باشندہ اور یہاں کے دو مشہور اساتذہ سعد اللہ بنی اسرائیلی (۱۰۱) (م ۱۰۰۰ھ) اور اسحاق کاکو (۱۰۲) (م ۹۹۶ھ) کے شاگرد تھے۔ شیخ منور نے بیس سال کی عمر میں تعلیم مکمل کر لی تھی اور ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء میں شہنشاہ اکبر نے ان کو مالوہ کا صدر مقرر کیا۔ ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء میں شیخ یعقوب کو ان کے راسخ عقائد کی وجہ سے گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا گیا تھا، جہاں سے پانچ برس کے بعد وہ آگرہ میں منتقل کیے گئے اور ان کی املاک اور کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ شیخ منور کو شدید سزاؤں اور مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۲/ ذوالقعدہ ۱۰۱۰ھ (اپریل ۱۶۰۲ء) کو وہ اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے۔

گوالیار میں قید کے زمانہ میں شیخ منور نے الدر النظیم فی ترتیب الآیۃ والسور الکریم کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تفسیرِ قرآن، البحر المواج پر اعراب لگائے تھے۔ جہاں تک کہ علمِ حدیث کا تعلق ہے، اُنھوں نے الصغانی کی مشارق الانوار اور الجزری کی حصن حصین کی شرحیں بھی قلم بند کیں۔ (۱۰۳)

۱۶۔ شیخ عاشق بن عمر ہندی، حنفی (م ۱۰۳۲ھ):

شیخ عاشق نے علمِ حدیث عبداللہ سلطان پوری (م ۹۰۰ھ) سے حاصل کیا تھا اور محدث و فقیہہ کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ اُنھوں نے ترمذی کی شمائل النبیؐ کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ (۱۰۴)

۱۷۔ محی الدین عبدالقادر بن شیخ بن عبداللہ العیدروسی الحضرمی ہندی، احمد آبادی (۹۷۸ تا ۱۰۳۷ھ/۱۵۷۰ تا ۱۶۲۷ء):

محی الدین عبدالقادر النور السافر کے مشہور مصنف ہیں۔ ان کا تعلق عیدروسی خاندان سے تھا

جو دسویں صدی ہجری کے وسط میں حضر موت سے احمد آباد آیا تھا۔ ۱۰ ربیع الاوّل ۹۷۸ھ (اگست ۱۵۷۰ء) کو عبدالقادر احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ عالم، صوفی اور محدث تھے اور اپنے خاندانی مدرسہ میں جو احمد آباد میں تھا، اپنے والد کے بعد حدیث اور تصوف کا درس دینے لگے۔ عبدالقادر نے ۱۰ محرم ۱۰۳۷ھ (ستمبر ۱۶۲۷ء) کو احمد آباد میں وفات پائی۔ (۱۰۵)

تصانیف:

عبدالقادر نے اسلامی علوم کے مختلف شعبوں سے متعلق کتابیں لکھیں۔ (۱۰۶) علمِ حدیث پر اُن کی تصانیف درج ذیل ہیں:

(۱) المنح البخاری بختم صحیح البخاری: (۱۰۷)

(۲) عقد اللال فی فضائل الآل: (بحار، جلد ۲، نمبر ۲،۴۵۳) یہ ایک رسالہ ہے جس میں احادیثِ نبویؐ کی بنا پر آلِ رسولؐ کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

(۳) رسالہ فی مناقب البخاری: (بحار، نمبر ۳،۴۵۴) (۱۰۸)

(۴) القول الجامع فی بیان العلم النافع: (بحار، نمبر ۲،۴۵۷) اس رسالہ میں مصنف نے ایک حدیث ''طلب العلم فریضة علی کل مسلم'' کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علمِ باطن یا تصوف کا حصول سب پر فرض ہے۔

(۵) کتاب الانموذج اللطیف فی اھل بدر الشریف: اس کتاب میں اہلِ بدر یعنی اُن صحابہ کے جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے، فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ (۱۰۹)

۱۸۔ عبدالنبی شطاری (م ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء):

عماد الدین محمد عارف عثمانی، حنفی، شطاری (۱۱۰) جو عبدالنبی کے نام سے معروف ہیں، عبداللہ صوفی شطاری، اکبر آبادی (م ۱۰۱۰ھ) کے شاگرد تھے۔ (۱۱۱) اُنہوں نے فلسفہ، منطق، علومِ قرآنی اور حدیث کی بہت سی مستند کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ آگرہ میں ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء تک رہے۔ لیکن اُن کی تاریخِ وفات کا علم نہیں ہے۔

تصانیف:

رحمان علی نے تذکرۂ علمائے ہند(۱۱۲) میں علمِ حدیث پر عبدالنبی کی مندرجہ ذیل تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

(۱) ذریعۃ النجاۃ فی شرح المشکوٰۃ: یہ مشکوٰۃ المصابیح کی شرح ہے۔

(۲) شرح نخبۃ الفکر:

(۳) شرح حدیث ''الصلوٰۃ معراج المومنین'': اس رسالہ میں حدیث کے مفہوم کی تشریح کی گئی ہے۔

(۴) شرح حدیث ''خیر الاسماء عبداللہ وعبدالرحمٰن'':

(۵) لوامع الانوار فی مناقب السادات الاطہار: یہ کتاب اہلِ بیت کے فضائل سے متعلق ہے، جن کا ذکر احادیث میں کیا گیا ہے۔

فصلِ دوم: شیخ احمد سرہندی اور ان کا مکتبِ محدثین

(۱۰۰۰ تا ۱۲۹۶ھ/۱۵۹۲ تا ۱۸۷۸ء)

ا۔ شیخ احمد سرہندی (۹۷۱ تا ۱۰۳۴ھ / ۱۵۶۴ تا ۱۶۲۴ء):

شیخ احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی جو مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہیں، سلسلۂ مجددیہ کے نامور بانی تھے۔ وہ شوال ۹۷۱ھ / مئی ۱۵۶۴ء میں سرہند میں پیدا ہوئے تھے۔ سرہند مشرقی پنجاب میں ہے اور لوگ بطور احترام اسے سرہند شریف کہتے ہیں۔ شیخ احمد نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر وہ سیالکوٹ اور وہاں سے کشمیر گئے اور ملا کمال الدین کشمیری (۱۱۳) (م ۱۰۱۷ھ) سے معقولات اور شیخ یعقوب صرفی (م ۱۰۰۳ھ) سے منقولات کا درس لیا۔ شیخ یعقوب نے ان کو صحیح بخاری، تبریزی کی مشکوٰۃ اور سیوطی کی الجامع الصغیر کا درس دینے کا اجازہ دیا۔ اس کے علاوہ شیخ احمد نے قاضی بہلول بدخشی (۱۱۴) سے صحاح ستہ کے لیے اجازہ بھی حاصل کر لیا۔ بدخشی مکہ کے مشہور محدث عبدالرحمٰن بن فہد کے شاگرد تھے۔ (۱۱۵) ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء میں خواجہ عبدالباقی نقشبندی (م ۱۰۲۱ھ)

نے شیخ احمد کو سلسلۂ نقشبندیہ میں داخل کر لیا۔ ۲۰ صفر ۱۰۳۴ھ (نومبر ۱۶۲۴ء) کو شیخ احمد نے ۶۳ سال کی عمر میں سرہند میں وفات پائی۔ جہاں اُن کی درگاہ آج بھی ایک مشہور زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔

شیخ احمد سرہندی حدیث کے متبحر عالم تھے جس کا ثبوت اُن کے مکتوبات کے مطالعہ سے بھی ملتا ہے، لیکن تصانیف و تالیف کی حد تک اس موضوع پر اُنہوں نے صرف ایک رسالہ اربعین (۱۱۶) لکھا ہے۔ محدث و مصلح کی حیثیت سے حضرت مجدد نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ حدیث پر کتابیں لکھنا اور اس کا درس دینا نہیں ہے، اگر چہ وہ یہ بھی کیا کرتے تھے، (۱۱۷) بلکہ ان کا اصل کام یہ ہے کہ اس زمانے کی حکومت و ریاست میں جو زبردست افراتفری اور پراگندہ خیالی پھیلی ہوئی تھی، اس کے ہوتے ہوئے بھی اُنہوں نے قرآن اور حدیث کی تعلیم و اشاعت کے لیے سازگار حالات پیدا کر دیے۔ اکبر کی حکمتِ عملی سنیوں کے خلاف تھی۔ (۱۱۸) اور عباسی خلفا کے ایرانی وزیروں کی طرح دربارِ اکبری کے بعض امراء بھی جو بہت بااقتدار تھے، سنی عقائد کو تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے اور دوسری طرف صوفیا زہد و تقدس کا نام لے کر ہر قسم کی غیر اسلامی بدعتوں کی تعلیم دے رہے تھے اور اُن پر عمل بھی کر رہے تھے، جس کی وجہ سے اسلامی معاشرے میں تفرقہ و انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ (۱۱۹) حضرت مجدد نے ان تمام خرابیوں اور گمراہیوں کے خلاف علانیہ جہاد شروع کر دیا۔ (۱۲۰) اور وعظ و تلقین کر کے نیز رسائل و مکتوبات لکھ کر ہر طبقہ کے لوگوں کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے باخبر کرنے لگے۔ اس تبلیغی جہاد کی وجہ سے حکومت ناراض ہو گئی اور شہنشاہ جہانگیر نے حضرت مجدد کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا، جہاں سے اُنہیں دو سال کے بعد رہا کیا گیا۔ حضرت مجدد کی خدا پرستی، اسلام کی صداقت پر کامل ایمان اور پاکیزہ زندگی سے جہانگیر اس حد تک متاثر ہوا کہ اس نے اپنے لڑکے شہزادہ خرم کو ان کے روحانی فیضان سے مستفید ہونے کی ترغیب دی۔ اور آخر کار حضرت مجدد کے اس عظیم مقصد کو جس کے لیے اُنہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، شہنشاہ نے تسلیم کر لیا اور اپنے عہد کے مسلمانوں کی اصلاح کرنے کی کوششوں میں بھی وہ برابر کامیاب ہوتے گئے۔ چنانچہ ہند اور بیرونِ ہند کے لاکھوں مسلمانوں نے جو معاشرے کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے تھے، اُن کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنی اخلاقی اور روحانی زندگی درست کرنے کا راستہ اختیار کر لیا۔ حضرت مجدد نے اسلامی تعلیمات کی صحیح

تاویل کر کے اور اپنی زندگی کو ایک بہترین عملی نمونہ بنا کے اسلام کو نہ صرف تفریق و انتشار سے بچا لیا بلکہ شریعت اور طریقت میں وہ ربط و امتزاج بھی پیدا کر دیا جس کی بہت ضرورت تھی۔

حضرت مجدد کی کامیابی کا حقیقی راز یہ ہے کہ اُنہوں نے مسلمانوں میں قرآن اور حدیث کے مطالعہ کو فروغ دینے پر بہت زور دیا۔(۱۲۱) اور قرآن و حدیث کی تعلیمات پر مبنی اصلاح و ترقی کا جو کامیاب کام اُنہوں نے شروع کیا تھا، اسے ان کے اخلاف نے پشتہا پشت جاری رکھا۔

شیخ احمد سرہندی کے مکتب سے تعلق رکھنے والے محدثین کے مختصر حالات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ شیخ سعید بن شیخ احمد سرہندی (۱۰۰۳ تا ۱۰۷۰ھ / ۱۵۹۴ تا ۱۶۵۹ء):

شیخ سعید کا لقب خازنِ رحمت تھا۔ اُنہوں نے حدیث کی تعلیم اپنے والد اور عبدالرحمٰن رومی سے حاصل کی تھی۔ جب اُن کے والد ضعیف ہو گئے تو اُن کی خانقاہ میں شیخ سعید حدیث اور دوسرے علوم کا درس دینے لگے۔ اور اُنہوں نے یہ سلسلہ ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء میں حرمین جانے تک جاری رکھا۔ ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۸ء میں شیخ سعید سرہند واپس آئے۔ اور ۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۹ء میں وفات پائی۔

تصنیف:

شیخ سعید نے مشکوٰۃ المصابیح کے حواشی لکھے تھے۔(۱۲۲)

۲۔ فرخ شاہ بن شیخ سعید (۱۰۳۸ تا ۱۱۱۲ھ / ۱۶۲۹ تا ۱۷۰۳ء):

فرخ شاہ کئی علوم پر عبور رکھنے والے محدث تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے ستر ہزار احادیث مع اسانید حفظ کر لی تھیں اور اسی بنا پر وہ حافظ کے لقب سے مشہور ہوئے تھے۔(۱۲۳)

۳۔ سراج احمد مجددی (۱۱۷۶ تا ۱۲۳۰ھ / ۱۷۶۲ تا ۱۸۱۵ء):

سراج احمد بن مرشد بن ارشد بن فرخ شاہ ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء میں سرہند میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۱۷۷ھ / ۱۷۶۳ء میں سکھوں نے سرہند کو تیسری مرتبہ ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور سراج احمد کے والد شیخ مرشد (۱۱۱۷ تا ۱۲۰۱ھ)(۱۲۴) مع افرادِ خاندان وطن چھوڑ کر رام پور چلے گئے۔(۱۲۵) سراج

احمد نے حدیث کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جو ایک عالم اور محدث تھے۔ سراج احمد ایک مشہور محدث سلام اللہ (م ۱۲۲۹ھ) کے ہم عصر تھے جن کا تعلق نامور محدثینِ دہلی عبدالحق دہلوی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) کے خاندان سے تھا۔ سراج احمد نے ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ اُن کی لاش رام پور لائی گئی، جہاں وہ اپنے والد کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

تصانیف:

(۱) **ترجمۂ فارسی صحیح مسلم:** سراج احمد نے صحیح مسلم کے فارسی ترجمے میں تشریحی نوٹ بھی درج کیے ہیں۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور اس کا ایک نسخہ رام پور کے سرکاری کتب خانے میں موجود ہے۔

(۲) **شرح فارسی علیٰ جامع الترمذی:** یہ جامع الترمذی کی مختصر شرح ہے جو فارسی میں لکھی گئی ہے۔ نظامی پریس، دہلی نے اسے مجموعہ شروح اربع کے ساتھ شائع کیا تھا۔ سراج احمد نے ذوالحجہ ۱۲۲۰ھ/ فروری ۱۸۰۶ء میں یہ شرح لکھنی شروع کی اور ذوالحجہ ۱۲۲۲ھ/ جنوری ۱۸۰۸ء میں اسے مکمل کیا۔ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب لکھتے وقت جامع کی کوئی شرح یا ترجمہ اُن کے پیشِ نظر نہ تھا کہ وہ اس سے استفادہ کر سکتے۔ گویا کہ یہ تصنیف اُن کی ذاتی محنت اور علمِ حدیث میں تبحر کا نتیجہ ہے۔ اس شرح کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ سراج احمد ایسی بیشتر احادیث کی اسناد تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن کے متعلق ترمذی نے صرف اتنا حوالہ دیا تھا کہ وفی الباب عن فلان، وفیه عن فلان۔

مزید برآں اُنہوں نے غیر مانوس ناموں اور نسبتوں کا صحیح تلفظ یا ضبط بھی درج کیا ہے جو ترمذی کی جامع میں پائے جاتے ہیں۔

(۳) **رسالہ در ذکر طعام:** (رام پور، فارسی مخطوطات) یہ رسالہ فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اس میں کھانے، پینے کی اُن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو احادیث کے مطابق آنحضرت ﷺ نوش فرماتے تھے۔

۴۔ شیخ معصوم بن شیخ احمد سرہندی (م ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء):

شیخ معصوم حضرت مجدد الف ثانی کے دوسرے فرزند تھے۔ اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (م ۱۱۱۹ھ) کے عہد میں اُن کو روحانی پیشوا کا مرتبہ حاصل تھا۔ شیخ معصوم کو علمِ حدیث پر کافی عبور حاصل تھا اور جب وہ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے حرمین گئے تھے تو مکہ معظمہ کے محدثین سے سند حاصل کی تھی۔(۱۲۶)

۵۔ خواجہ سیف الدین سرہندی (م ۱۰۹۸ھ):

خواجہ سیف الدین شیخ معصوم کے فرزند تھے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی علمِ حدیث کی اشاعت و تعلیم کے لیے وقف کر دی تھی اور اپنی خدمات کے صلے میں محی السنۃ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ شیخ معصوم نے اورنگ زیب عالمگیر کی روحانی تربیت کا فرض بھی خواجہ سیف الدین کے ذمے کر دیا تھا۔(۱۲۷) اُنہوں نے ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء میں سرہند میں وفات پائی اور اپنے والد کے مزار کے قریب مدفون ہوئے۔(۱۲۸)

تصنیف:

(۱) فیض الباری شرح صحیح البخاری: یہ کتاب صحیح بخاری کی شرح ہے۔(۱۲۹)

۷۔ شاہ ابوسعید بن صفی القدر مجددی (۱۱۹۶تا۱۲۵۰ھ/۱۷۸۲تا۱۸۳۵ء):

شاہ ابوسعید خواجہ سیف الدین کے پڑپوتے اور شاہ عبدالغنی مجددی (۱۲۹۶ھ) کے والد تھے۔ وہ ذوالقعدہ ۱۱۹۶ھ/اکتوبر ۱۷۸۲ء میں رام پور میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے چچا سراج احمد اور شاہ رفیع الدین دہلوی (م ۱۲۴۹ھ) اور شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ اور مرزا مظہر جانِ جاناں (م ۱۱۹۵ھ) کے بنا کردہ سلسلۂ طریقت میں اپنے مرشد غلام علی کے جانشین ہوئے۔ شاہ ابوسعید نے شوال ۱۲۵۰ھ/فروری ۱۸۳۵ء میں حرمین سے واپسی کے بعد ٹونک میں وفات پائی اور دہلی میں جانِ جاناں کے مزار کے قریب دفن کیے گئے۔(۱۳۰)

۸۔ شاہ عبدالغنی بن ابی سعید مجددی دہلوی (۱۲۳۵ تا ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۱۹ تا ۱۸۷۸ء):

شاہ عبدالغنی علمِ حدیث میں دارالعلوم دیوبند کے مشہور بانی مولانا قاسم نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) کے استاد تھے۔ اُنہوں نے صحاح ستہ کا درس اپنے والد شاہ ابوسعید سے لیا تھا، جن کی اجازت سے وہ اپنے شاگردوں کو حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔(۱۳۱) عبدالغنی نے صحیح بخاری کا کچھ حصہ شاہ اسحٰق دہلوی سے بھی پڑھا تھا۔ ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء میں عبدالغنی اپنے والد کے ہمراہ حرمین گئے۔ اور وہاں شیخ عابد سندھی ثم مدنی سے صحاح ستہ کا درس دینے کی اجازت حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم کے دوران میں عبدالغنی ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔ اور وہاں آخر وقت تک طلباء کی کثیر تعداد کو حدیث کا درس دیتے رہے۔ شاہ عبدالغنی نے محرم ۱۲۹۶ھ/ دسمبر ۱۸۷۸ء میں وفات پائی۔(۱۳۲)

تصنیف:

(۱) انجاح الحاجہ فی شرح ابنِ ماجہ: یہ سنن ابنِ ماجہ کی شرح ہے۔ اسے علیمی پریس، دہلی نے سنن ابنِ ماجہ کے حاشیوں پر طبع کیا ہے۔

فصل سوم: شیخ عبدالحق دہلوی اور ان کا مکتبِ محدثین

(۱۰۰۰ تا ۱۲۲۹ھ/ ۱۵۹۲ تا ۱۸۱۴ء)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۹۵۸ تا ۱۰۵۲ھ/ ۱۵۵۱ تا ۱۶۴۲ء):

شیخ عبدالحق بن سیف الدین بن سعد اللہ ترکی، بخاری، دہلوی، حنفی آغا محمد ترک (م ۷۳۹ھ) کی اولاد میں تھے جو ترکِ وطن کر کے بخارا سے دہلی آ گئے تھے۔ اور علاؤ الدین خلجی (م ۶۹۵ تا ۷۱۵ھ) قطب الدین (۷۱۶ تا ۷۲۰ھ) اور تغلق شاہ (۷۲۰ تا ۷۲۵ھ) تین بادشاہوں کے عہد میں امرائے دربار میں شامل رہے۔ عبدالحق نے دادا شیخ سعد اللہ (م ۹۲۸ھ) نے درویشانہ زندگی اختیار کر لی تھی اور شیخ عبدالحق کے والد شیخ سیف الدین (۱۳۳) (م ۹۹۰ھ) بھی اسی طرزِ زندگی کو اپنائے رہے۔ سیف الدین نے تصوف پر کئی رسالے قلمبند کیے، (۱۳۴) اور ان کو علمِ حدیث سے بھی

گہرا شغف تھا۔ جس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے پاس ذہبی کی الکاشف فی رجال السنۃ کا ایک نسخہ موجود تھا۔(۱۳۵)

شیخ عبدالحق محرم ۹۵۸ھ/جنوری ۱۵۵۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ان کی زندگی کو تین غیر مساوی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔(۱) ۹۶۳ تا ۹۸۵ھ/۱۵۵۶ تا ۱۵۷۷ء۔ (۲) ۹۹۶ تا ۱۰۰۰ھ/۵۸۸ تا ۱۵۹۲ء اور (۳) ۱۰۰۰ تا ۱۰۵۲ھ/۱۵۹۲ تا ۱۶۴۲ء۔ پہلے دور کے اختتام پر اُنہوں نے دہلی میں فارسی، عربی، فقہ اور معقولات کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ اس دور میں اُن کے والد سیف الدین اور دوسرے ممتاز علماء جن میں وسطِ ایشیاء سے آ کر دہلی میں آباد ہونے والے فقہا بھی شامل تھے، اُن کو تعلیم دیتے رہے۔(۱۳۶) چونکہ عبدالحق کے والد محدث بھی تھے، اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے لڑکے کو حدیث کی تعلیم بھی ضرور دی ہوگی۔ مگر اس بات کا تحریری ثبوت نہیں ملتا کہ عبدالحق نے اس دور میں حدیث کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔

دوسرے دور میں (۹۹۶ تا ۱۰۰۰ھ) اُنہوں نے ساری توجہ علمِ حدیث کی تحصیل پر مرتکز کر دی اور مکہ معظمہ میں شیخ عبدالوہاب متقی (م ۱۰۱۰ھ) سے جو علی متقی برہان پوری (۱۳۷) (م ۹۷۵ھ) کے شاگردِ رشید اور جانشین تھے، حدیث کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اپنے شیخ سے صحاح ستہ کا اجازہ حاصل کرنے کے بعد عبدالحق نے حدیث کی تعلیم ختم کر لی۔ یہ زمانہ اُن کی زندگی میں ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اسی نے اُنہیں مستقبل کا ایک نامور محدث اور بلند پایہ مصنف بنانے کی راہ ہموار کر دی۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ تحصیلِ علم پر متوجہ ہونے سے قبل شیخ عبدالحق درباری زندگی کی طرف کسی قدر مائل تھے کیونکہ فتح پور میں کچھ عرصہ تک وہ فیضی اور مرزا نظام الدین احمد (۱۳۸) (م ۱۰۰۳ھ) کے ہم نشین رہے تھے۔ لیکن جب وہ حجاز سے واپس آئے تو اُن میں زبردست تبدیلی آ چکی تھی۔ اب وہ بالکل مختلف شخص تھے اور ایک عالم کی گوشہ نشیں اور سادہ زندگی کو تمام چیزوں پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے لاہور میں اپنے سابق دوست فیضی سے ملنے تک سے انکار کر دیا، حالانکہ فیضی ان سے ملاقات کے لیے بار بار اصرار کرتے رہے۔(۱۳۹)

تیسرا یا آخری دور تصنیف و تالیف اور دہلی کی خانقاہ قادریہ میں اسلامی علوم بالخصوص علمِ

حدیث کا درس دینے کا زمانہ ہے۔ شیخ عبدالحق نے ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا، جس میں منجملہ دوسرے علوم کے علمِ حدیث سے متعلق کتابیں بڑی تعداد میں موجود تھیں۔(۱۴۰) جو اُنہوں نے حرمین میں اپنی تعلیم کے زمانہ میں جمع کی تھیں اور حدیث کی کتابیں عرب کے علاوہ دوسرے ممالک سے بھی منگوائی تھیں۔ حدیث کی نادر و کم یاب کتابیں نقل کرنے کے لیے اُنہوں نے کاتب بھی رکھے تھے۔ طاہری پٹنی کی مجمع بحار الانوار کے ایک مخطوطہ پر یہ درج ہے کہ یہ نسخہ ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے لیے نقل کیا گیا تھا۔(۱۴۱) یہ مخطوطہ نول کشور پریس، لکھنؤ نے طبع کر دیا ہے۔ یہ دور شیخ عبدالحق کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اور وہ ایک محدث اور خدا رسیدہ بزرگ کی حیثیت سے اس قدر مشہور ہو گئے تھے کہ شہنشاہ شاہجہاں بھی اُن سے ملاقات کے لیے آیا اور اظہارِ عقیدت کیا اور ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء میں دہلی سے کشمیر روانہ ہونے سے قبل اُن کی دُعاؤں کا طلب گار ہوا۔(۱۴۲) شیخ عبدالحق نے ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں دہلی میں وفات پائی اور حوضِ شمسی کے قریب ایک مقبرے میں جو خود اُنہوں نے تعمیر کرایا تھا، دفن کیے گئے۔(۱۴۳)

تصانیف:

شیخ عبدالحق دہلوی بہت زیادہ لکھنے والے مصنف تھے اور اُنہوں نے حدیث، تصوف، تاریخ، اور سوانح پر ایک سو سے زیادہ کتابیں لکھیں ہیں۔(۱۴۴) جن میں سے تیرہ کتابوں کا ذکر بروکلمن نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ علمِ حدیث پر اُن کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) **الطریق القویم فی شرح الصراط المستقیم:** (مطبوعہ)(۱۴۵) یہ کتاب فیروز آبادی کی سفر السعادۃ یا صراط المستقیم کی فارسی شرح ہے۔ یہ ایسی مستند احادیث کا مجموعہ ہے، جو آنحضرت ﷺ کی زندگی، کردار، عادات اور اخلاقی تعلیمات سے متعلق ہیں۔ یہ شرح دہلی میں لکھی گئی تھی، اور ۲ر جمادی الاوّل ۱۰۱۶ھ (ستمبر ۱۶۰۷ء) کو مکمل ہوئی۔ یہ ۱۸۸۵ء میں لکھنؤ میں طبع کی گئی تھی۔ اس کتاب کا آغاز ایک مقدمہ سے ہوتا ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں علمِ حدیث اور مستند مجموعوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرا حصہ مذاہب اربع کے اماموں کے بارے میں ہے۔ شارح نے عربی متون کا ترجمہ جابجا ضروری تشریحات کے ساتھ کیا ہے۔ اس شرح کی قدر و قیمت کافی تعداد میں ایسی مستند

احادیث کے اضافے سے بڑھ گئی ہے جس کو فیروز آبادی نے یا تو چھوڑ دیا یا ضعیف قرار دے کر مسترد کر دیا کیونکہ ان کا تعلق ظاہریہ فرقہ سے تھا۔ شیخ عبدالحق نے جن مآخذ سے معلومات حاصل کی ہیں، وہ دیباچہ میں درج کر دیے ہیں۔(۱۴۶)

(۲) اشعۃ اللمعات فی المشکوٰۃ: یہ مشکوٰۃ المصابیح کی مختصر شرح ہے جو فارسی میں لکھی گئی ہے۔ نول کشور پریس، لکھنو نے ۱۵-۱۹۱۴ء میں یہ کتاب پانچ جلدوں میں شائع کی تھی۔(۱۴۷) شیخ عبدالحق نے ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء کے وسط میں یہ کتاب لکھنا شروع کی تھی(۱۴۸) اور ۱۰۲۹ھ/۱۶۲۰ء میں اسے دہلی میں مکمل کیا۔(۱۴۹) اس کتاب کے لکھنے میں اتنا زیادہ وقت کیوں صرف ہوا، اس کا سبب خود مصنف نے یہ بتلایا کہ اُنہوں نے مشکوٰۃ کی دو شرحیں بہ یک وقت لکھنا شروع کی تھیں۔ ایک فارسی میں دوسری عربی میں، جس کا نام اللمعات تھا۔ اس کا آغاز ۱۳ر ذوالحجہ ۱۰۱۹ھ (فروری ۱۶۱۱ء) کو کیا گیا تھا اور یہ ۲۴ر ربیع الاوّل ۱۰۲۵ھ (مارچ ۱۶۱۶ء) کو مکمل ہوئی۔(۱۵۰)

شرح سفر السعادۃ کی طرح اشعۃ اللمعات کا آغاز بھی ایک مقدمہ سے ہوتا ہے، جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں اصطلاحات الحدیث پر مختصر لیکن نہایت مفید بحث کی گئی ہے۔ اور دوسرا حصہ صحاح ستہ کے مصنفوں اور دوسرے ائمہ حدیث یعنی مالک، احمد بن حنبل، شافعی، دارقطنی، رزین العبدی، النووی، اور ابن الجوزی کے بارے میں ہے۔ اصل کتاب میں مصنف نے تھوڑا تھوڑا کر کے مشکوٰۃ کے پورے متن کا فارسی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ مذاہب اربع سے متعلق احادیث کی بخوبی تشریح کی ہے اور اُن کے بارے میں سوالات کا بھی بڑی وضاحت سے جواب دیا ہے۔

(۳) لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح: (بانکی پور، نمبر ۳۶۱، ۳۶۲۔ آصفیہ نمبر ۸۳، ۳۰۱، ۳۰۲، ۶۰۳) مشکوٰۃ کی اس عربی شرح میں دینی اور فقہی مسائل پر جو بحث کی گئی ہے، وہ اشعۃ کے مباحث سے زیادہ واضح اور مفصل ہے۔ حالانکہ لمعات ضخامت میں اشعۃ سے کم ہے۔ اوّل الذکر میں اسّی ہزار سطریں ہیں اور مؤخر الذکر میں ایک لاکھ تیس ہزار سطریں ہیں۔(۱۵۱) اس فرق کا سبب یہ ہے کہ اشعۃ میں اصل عربی متن کے فارسی ترجمے نے بہت جگہ لے لی ہے۔ لمعات کا مقدمہ اشعۃ کے مقدمہ جیسا ہی ہے اور ہند میں مشکوٰۃ المصابیح کے جو ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، اُن کے شروع میں یہ

مقدمہ شامل کرلیا گیا ہے، اس لیے علمِ حدیث کا ہر طالبِ علم اس اس سے بخوبی واقف ہے۔ (۱۵۲)

(۴) الاکمال فی اسماء الرجال: بانکی پور، نمبر ۳۲۷۔ دارالعلوم پشاور) (۱۵۳) یہ کتاب ان راویوں کے حالات کے بارے میں ہے، جن کا حوالہ مشکوٰۃ المصابیح میں ہے۔ یہ لمعات مکمل ہونے کے بعد لکھی گئی تھی۔

اس کتاب کے شروع میں چاروں خلفائے راشدین، ازواجِ مطہرات اور آلِ رسولؐ کے مختصر حالات درج کیے گئے ہیں۔ اصل کتاب حروفِ تہجی کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہے۔ چنانچہ اس ترتیب کے مطابق ابتداء ابواللحم سے ہوتی ہے اور اختتام یاسر اپر ہوا ہے۔ اس کتاب میں ایک ضمیمہ بھی شامل ہے، جو ممتاز محدثین کے مختصر حالات پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے امام مالک اور سب سے آخر میں الطحاوی کے حالات لکھے گئے ہیں۔ (۱۵۴)

(۵) جامع البرکات منتخب شرح المشکوٰۃ: اس کتاب میں مصنف نے مشکوٰۃ کے ہر ایک باب سے ایک یا دو حدیثیں منتخب کی ہیں اور جملہ احادیث کے مفہوم پر فارسی میں بہت عمدہ عالمانہ بحث کی ہے۔ اس میں ۳۳ ہزار سطریں ہیں۔

(۶) ماثبت بالسنہ فی ایام مراالسنہ: (مطبوعہ) یہ تمام اقسام یعنی صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع احادیث کا مجموعہ ہے۔ جن کا تعلق نماز، روزہ اور دوسری عبادات و رسوم سے ہے جو سال کے بارہ مہینوں میں سے ہر مہینے کے مختلف دنوں اور راتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ عبدالحق نے اس کتاب میں ہر ایسی مذہبی رسم کو جس کی حلت معتبر احادیث سے ثابت ہوئی ہے، جائز قرار دیا ہے اور جو رسمیں اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں ناجائز قرار دے کر مسترد کر دیا ہے۔ کتاب کا جو حصہ ماہِ ربیع الاوّل سے متعلق ہے، اس کا بیشتر حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور ماہِ محرم سے متعلق حصہ میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بیان کو زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب شیخ عبدالحق کی فارسی تصانیف کا ضمیمہ کہا جا سکتا ہے، جن میں محدثین اور صوفیاء کے درمیان ان اختلافات پر بحث کی گئی ہے جو سال کے ہر ایک مہینے میں مختلف رسوم کی ادائی کے سلسلہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور اس میں شیخ عبدالحق نے ان رسوم کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں

اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں کلکتہ میں اور ۱۳۰۷ھ /۱۸۸۹ء میں لاہور میں طبع کی گئی تھی۔(۱۵۵)

(۷) الاحادیث الاربعین فی ابواب علوم الدین: اس رسالہ میں چالیس احادیث شامل کی گئی ہیں جو دینی علوم سے متعلق ہیں۔(۱۵۶)

(۸) ترجمۃ الاحادیث الاربعین: اس رسالہ میں ایسی چالیس احادیث کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے، جن میں بادشاہوں اور شہنشاہوں کو تنبیہہ کی گئی ہے۔(۱۵۷)

(۹) دستور فیض النور: (ایتھے، انڈیا آفس نمبر ۲۶۵۸۔اے۔ایس۔پی نمبر ۱۰۰۴) یہ رسالہ فارسی میں لکھا گیا ہے، جو آنحضرت ﷺ کے لباس کے بارے میں ہے اور احادیث پر مبنی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ایک اور رسالہ کے مماثل ہے، جس کا عنوان ہے "رسالہ در آدابِ لباس" (۱۵۸) اور یہ نام کتب خانۂ برلن کی فہرست میں موجود ہے۔(۱۵۹)

(۱۰) ذکر اجازۃ الحدیث فی القدیم والحدیث: (۱۶۲) شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو ہند میں علمِ حدیث کا بانی کہا جاتا ہے۔(۱۶۰) راقم الحروف کی رائے میں یہ خیال درست نہیں ہے۔(۱۶۱) واقعہ یہ ہے کہ شیخ عبدالحق سے کم از کم ایک صدی پہلے پورے ہند میں حدیث کی تعلیم کا آغاز ان محدثین نے کر دیا تھا، جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ تاہم شیخ عبدالحق کا یہی کارنامہ قابلِ ستائش ہے کہ وہ نہایت خلوص وعقیدت کے ساتھ علمِ حدیث کی اشاعت وترقی کے لیے تمام عمر کام کرتے رہے اور ان ہی کی کوششوں سے شمالی ہند میں علمِ حدیث کو اس قدر فروغ حاصل ہوا۔ اُنھوں نے صرف یہی نہیں کیا، بلکہ ان کی بدولت محدثین کا ایک طویل سلسلہ بھی قائم ہو گیا، جنھوں نے نسلاً بعد نسلٍ علمِ حدیث کی مشعل کو روشن رکھا۔ بلاشبہ یہ بہت شاندار کارنامہ ہے۔ اور اس عظیم جدوجہد میں شیخ عبدالحق کے بزرگ ہم عصر شیخ احمد سرہندی نے بھی اہم حصہ لیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مکتبِ حدیث سے جن محدثین کا تعلق ہے، اُن کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ تو خود ان کے افرادِ خاندان پر مشتمل ہے اور دوسرے گروہ میں اُن کے شاگرد اور اُن سے خاندانی تعلق رکھنے والے محدثین کے شاگرد شامل ہیں۔

گروپ الف: محدثینِ خانوادۂ عبدالحق

۱۔ شیخ نورالحق بن عبدالحق محدث دہلوی (۹۸۳ تا ۱۰۷۳ھ/۱۵۷۵ تا ۱۶۶۲ء):

شیخ نورالحق بہت قابل محدث فقیہ اور مورخ تھے۔ اُنہوں نے اپنے والد شیخ عبدالحق سے تحصیلِ علم کیا اور بہت مشہور ہوئے۔ نورالحق نے زبدۃ التواریخ کے نام سے ہند کی ایک عام تاریخ لکھی تھی، جس کا آغاز معزالدین بن سام معروف بہ سلطان محمد غوری (۵۷۰ تا ۶۰۲ھ/۱۱۷۵ تا ۱۲۰۶ء) سے ہوا ہے اور شہنشاہ جہانگیر کی تخت نشینی (۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) تک کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا کچھ حصہ ایلیٹ نے اپنی ہسٹری آف انڈیا میں شامل کیا ہے۔ نورالحق تمام عمر علمِ حدیث کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے، اُن کے علم وفضل کی قدر کرتے ہوئے شاہجہاں (۱۰۳۷ تا ۱۰۶۹ھ/۱۶۲۸ تا ۱۶۵۹ء) نے ان کو اکبرآباد کا قاضی مقرر کیا تھا۔ اور وہ اس عہدے پر کافی مدت تک فائز رہے۔ نورالحق نے ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء میں نوے سال کی عمر میں دہلی میں وفات پائی۔

تصانیف:

(۱) **تیسیر القاری فی شرح صحیح البخاری:** یہ کتاب صحیح بخاری کی فارسی میں ایک جامع شرح ہے جو پانچ جلدوں میں علوی پریس لکھنؤ سے ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ (۱۶۲)

(۲) **شرح شمائل النبیؐ:** (رام پور، نمبر ۱۹۴) یہ کتاب ترمذی کی شمائل النبیؐ کی فارسی شرح ہے۔

۲۔ حافظ عبدالصمد فخرالدین بن محبّ اللہ بن نوراللہ بن نورالحق (۱۱۵۰ھ):

حافظ عبدالصمد شیخ نورالحق کے پرپوتے تھے۔ (۱۶۳) اُنہوں نے صحاح ستہ کا درس اپنے والد شیخ محبّ اللہ سے لیا تھا۔ اور محبّ اللہ اپنے دادا شیخ نورالحق کے شاگرد تھے۔ عبدالصمد فخرالدین نے اپنے والد کی فارسی شرح صحیح مسلم کو مکمل کیا جو وہ منبع العلم فی شرح صحیح مسلم (بانکی پور نمبر ۱۲۰۷۔ اے۔ ایس۔ بی نمبر ۱۰۰۷) کے عنوان سے لکھ رہے تھے۔ اس کتاب کے دیباچے میں فخرالدین نے بیان کیا ہے کہ ان کے والد نے یہ کتاب اپنی عمر کے آخری ایّام میں لکھنا شروع کیا تھا اور ان کو اس پر نظرثانی کرنے تک کا موقع نہیں ملا، اس لیے اب اُنہوں نے اپنے والد کی تصنیف پر نظرثانی کی ہے

اوراس میں مناسب اضافے اور ترامیم بھی کی ہیں۔ منبع العلم پر نظر ثانی کرتے ہوئے اُنہوں نے اپنے جدِ اعلیٰ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصانیف سے بھی استفادہ کیا۔(۱۶۴)

(۲) شرح عین العلم: (بانکی پور نمبر ۱۳۰۰) یہ کتاب محمد بن عثمان بلخی کی تصنیف عین العلم (۱۶۵) کی فارسی شرح ہے، جس میں قرآن اور حدیث کی روشنی میں مسئلہ رہبانیت پر بحث کی گئی ہے۔ شارح نے دیباچے میں لکھا ہے کہ اصل عربی کتاب عین العلم چونکہ بہت مشکل ہے۔ اور ایرانی طلباء کے لیے اس کا حاصل کرنا بھی دشوار ہے۔ اس لیے اُنہوں نے فارسی میں اس کی شرح لکھی ہے جس میں غزالی کی احیاء علوم الدین سے مدد لی گئی ہے اور خود عین العلم بھی دراصل اسی کا انتخاب ہے۔ اُنہوں نے حروف ق اور ح کے ذیل میں علی الترتیب قرآنی آیات اور احادیث درج کی ہیں۔ اس کتاب میں حدیث روایت کرنے والے صحابہ کے ناموں کے ساتھ ان کتابوں کے نام بھی دیئے گئے ہیں جن میں یہ احادیث درج ہیں۔(۱۶۶) یہ کتاب مقدمہ، بیس ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔(۱۶۷)

(۳) شرح حصن حصین: یہ کتاب الجزری کی حصن حصین کی فارسی شرح ہے۔(۱۶۸)

۳۔ شیخ الاسلام بن حافظ فخر الدین (م ۱۱۸۰ھ):

شیخ الاسلام اپنے والد حافظ فخر الدین کے نامور شاگرد تھے، اور اُن سے صحاح ستہ اور دوسری کتبِ حدیث کا اجازہ حاصل کیا تھا۔(۱۶۹) محمد شاہ کے عہد (۱۱۳۱ تا ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۱۵ تا ۱۷۴۸ء) میں جب نادر شاہ نے حملہ کیا تھا تو شیخ الاسلام شاہ جہاں آباد میں قیام پذیر تھے۔(۱۷۰) وہ شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۳ھ) کے ہم عصر تھے۔

تصانیف:

(۱) شرح صحیح البخاری: یہ صحیح بخاری کی فارسی شرح ہے۔ ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں لکھنؤ میں شیخ نورالحق کی تصنیف تیسیر القاری کے حاشیوں پر شرح شیخ الاسلام کے عنوان سے شائع کی گئی تھی۔(۱۷۱) شارح نے کتاب کے دیباچے میں (بانکی پور، مخطوطہ، ورق ۱۔۲۹) اصطلاحات الحدیث، راویوں کی صحت یا عدم صحت پر بحث کی ہے۔ امام بخاری کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ اور یہ بتایا ہے کہ اُنہوں نے اپنی صحیح کیوں لکھی اور کتبِ احادیث میں اس کا کیا مرتبہ ہے، نیز اس کے تراجم ابواب، تعلیقات

اور دوسرے امور پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی تک خود اپنے اسناد (ورق ۲۶، ۲۷) بھی اس طرح درج کیے ہیں:

شیخ الاسلام عن ابیه الحافظ فخر الدین عن ابیه محب الله بن نور الله عن جده نور الحق عن ابیه شیخ المحدثین الشیخ عبدالحق المحدث الدهلوی۔

اس کتاب کی تدوین میں شیخ الاسلام نے متعدد تصانیف سے استفادہ کیا، جن میں نووی کی شرح صحیح مسلم (و۔۱۸) ابنِ حجر کی فتح الباری (د۔۲۷) عبدالحق کی شروح مشکوٰۃ (و۔۱) اور نورالحق کی تیسیر القاری بھی شامل ہیں۔

(۲) رسالہ کشف الغطاء عما لزم للموتی علی الاحیاء:

(۳) رسالہ ردّ الاوھام عن آثار الامام الہمام: (۱۷۲)

۴۔ سلام اللہ بن شیخ محدث رام پوری (م ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء):

سلام اللہ سراج احمد سرہندی (م ۱۲۲۰ھ) اور عبدالعزیز دہلوی (م ۱۲۳۵ھ) کے ہم عصر تھے۔ وہ خانوادۂ عبدالحق دہلوی کے آخری نامور عالم تھے۔ سلام اللہ دہلی کو چھوڑ کر رام پور چلے گئے تھے جہاں وہ محدثِ رام پور کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُنہوں نے علمِ حدیث کی تعلیم اپنے والد شیخ الاسلام سے حاصل کی تھی اور اس علم کی اشاعت و ترقی کا کام بہت قابلیت سے انجام دیتے رہے جو ان کے آباواجداد کا مایۂ ناز ورثہ تھا۔ سلام اللہ نے جمادی الثانی ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) یا ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء میں رام پور میں وفات پائی۔ (۱۷۳) ان کی خدماتِ حدیث کا اندازہ مندرجہ ذیل تصانیف سے ہوسکتا ہے۔

تصانیف:

(۱) المحلی باسرار الموطأ: (بانکی پور، نمبر ۱۲۷، حدیث) (۱۷۴) یہ کتاب موطأ امام مالک (م ۱۷۹ھ) کی شرح ہے جو عربی میں لکھی گئی ہے۔ اس کا تعلق مسائل فقہیہ اور ان سے متعلق مذاہب اربع (۱۷۵) کے اختلافات سے ہے۔ کتاب کے مقدمے میں پہلے امام مالک کے مختصر حالاتِ زندگی اور موطأ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد سلام اللہ نے یہ واضح کیا ہے کہ اس ملک میں موطأ

کی ایک شرح کی ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی تھی کیونکہ زرقانی کی شرح یہاں موجود نہیں ہے۔ اور اس وقت تک حدیث کی اس اہم کتاب کی شرح کسی ہندی عالم نے نہیں لکھی (۱۷۶) چنانچہ وہ یہ شرح لکھ کر اس ضرورت کی تکمیل کر رہے ہیں۔ محلی ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں رام پور میں لکھی گئی تھی۔ (۱۷۷) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب لاہوری (م ۱۰۹۸ھ) اور شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) کی شروح موطا جو سلام اللہ سے پہلے لکھی جا چکی تھیں، ان کی نظر سے نہیں گزری تھیں۔

(۲) ترجمہ فارسی صحیح البخاری:

(۳) ترجمہ فارسی شمائل النبیؐ:

(۴) رسالہ فی اصول الحدیث: اصول حدیث پر یہ رسالہ عربی میں لکھا گیا ہے۔ (۱۸۸)

۵۔ شیخ سیف اللہ بن نور اللہ بن نور الحق بخاری دہلوی:

شیخ سیف اللہ، شیخ نور الحق دہلوی کے پوتے تھے اور ان کو علم فقہ اور حدیث دونوں پر گہرا عبور حاصل تھا۔ اُنہوں نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکومت (۱۰۶۹ تا ۱۱۱۹ھ/۱۶۵۹ تا ۱۷۰۷ء) میں شمائل النبیؐ کی ایک شرح ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء میں لکھی تھی، جس کا نام اشرف الوسائل فی شرح الشمائل ہے۔ (۱۸۹)

گروپ ب: خانوادۂ عبدالحق کے تلامذہ

۱۔ خواجہ خواند مُعین الدین (م ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء):

مُعین الدین خواجہ خواند محمود نقشبندی کشمیری (م ۱۰۵۲ھ) کے فرزند تھے۔ (۱۹۰) اُنہوں نے حدیث، تفسیر اور فقہ کی تعلیم شیخ عبدالحق دہلوی سے حاصل کی۔ ان کا زمانۂ حیات گیارہویں صدی ہجری ہے۔ مُعین الدین نے ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں کشمیر میں وفات پائی۔ (۱۹۱)

۲۔ خواجہ حیدر پٹلو بن فیروز کشمیری (م ۱۰۵۷ھ/۱۶۷۴ء):

خواجہ حیدر نے علمِ حدیث کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن کشمیر میں بابا جواہر ناتھ کشمیری (م ۱۰۲۶ھ) سے حاصل کی جو ابنِ حجر الہیثمی کے شاگرد تھے۔ (۱۹۲) اس کے بعد وہ دہلی میں شیخ عبدالحق

دہلوی کے مدرسہ میں داخل ہوئے، اور وہاں علمِ حدیث سے فارغ التحصیل ہوئے۔ کشمیر کے صوبہ دار نے ان کو قاضی بنانے کی بار بار پیش کش کی، لیکن اُنہوں نے قبول نہیں کیا، اور درویشانہ زندگی کو ہر شے پر ترجیح دیتے رہے۔ خواجہ حیدر نے ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء میں کشمیر میں وفات پائی۔ (۱۹۳)

۳۔ بابا داوٗد مِشکاتی کشمیری (۱۰۹۷ھ/۱۶۸۵ء):

بابا داوٗد نے علمِ حدیث خواجہ حیدر کشمیری (م ۱۰۵۷ھ) اور علمِ تصوف خواجہ خواند محمود (۱۰۵۲ھ) سے حاصل کیا۔ وہ مِشکاتی کے نام سے اس لیے معروف ہوئے کہ اُنہوں نے مشکوٰۃ المصابیح پوری حفظ کر لی تھی۔

تصنیف:

(۱) اسرار الاسرار: یہ مشائخ کشمیر کی سوانح عمری ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانۂ دارالمصنفین، اعظم گڑھ میں محفوظ ہے۔ بابا داوٗد نے ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۵ء میں کشمیر میں وفات پائی۔

۴۔ شیخ عنایت اللہ مثال کشمیری (م ۱۱۸۵ھ/۱۷۱۳ء):

شیخ عنایت اللہ خواجہ حیدر کے فرزند کے شاگرد تھے۔ اُن کے استاد کشمیر کے ایک مشہور معلّم تھے۔ اُنہوں نے شروح سے آخر تک صحیح بخاری کا درس ۳۶ مرتبہ دیا تھا۔ شیخ عنایت اللہ نے شعبان ۱۲۲۵ھ/۱۷۱۳ء میں ۶۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (۱۹۴)

۵۔ میر سیّد مبارک بلگرامی (۱۰۳۳ تا ۱۱۱۵ھ/۱۶۲۴ تا ۱۷۰۳ء):

میر مبارک حسینی، واسطی، بلگرامی کا تعلق واسطی سیّدوں کے ایک قدیم خاندان سے تھا (۱۹۵) جو ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء سے بلگرام (۱۹۶) (ضلع ہردوئی، یو۔پی) میں آباد تھا۔ وہ شیخ نورالحق بن شیخ عبدالحق دہلوی کے شاگرد تھے۔ جب وہ دہلی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو اپنے استاد کے گھر میں رہتے تھے اور ان سے قریبی ربط رکھتے تھے۔ ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء میں میر مبارک نے شیخ عبدالحق سے سند حاصل کی اور اس کے بعد وہ تمام عمر بلگرام میں علمِ حدیث کی اشاعت وتعلیم کے لیے انتھک محنت کرتے رہے۔ میر مبارک شعبان ۱۰۳۳ھ/مئی ۱۶۲۴ء میں پیدا ہوئے تھے اور یکم ربیع الاوّل ۱۱۱۵ھ (جولائی ۱۷۰۳ء) کو بلگرام میں وفات پائی۔

علمِ حدیث میں تبحر و قابلیت کی وجہ سے میر مبارک کو قطب المحدثین کہا جاتا تھا۔(۱۹۷) اُنہوں نے بلگرام میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس نے حدیث کے دو مشہور عالم پیدا کیے۔ سیّد محمد فیض بن صادق بلگرامی اور سیّد عبدالجلیل بلگرامی۔ محمد فیض بلگرام کے ایک موروثی زمیندار تھے۔ اُنہوں نے شمائل النبیؐ اور حصن حصین کا فارسی میں ترجمہ کیا۔(۱۹۸) سیّد محمد فیض نے ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۶ء میں وفات پائی۔(۱۹۹)

۶۔ میر عبدالجلیل بلگرامی (۱۰۷۱ تا ۱۱۳۸ھ/۱۶۶۰ تا ۱۷۲۵ء):

عبدالجلیل بن احمد حسینی، واسطی، بلگرامی (۲۰۰) جو مشہور عالمِ غلام علی آزاد بلگرامی کے نانا تھے، بہت مہذب اور قابل شخص تھے۔ اُنہوں نے حدیث کی تعلیم میر مبارک (م ۱۱۱۵ھ) میر سعد اللہ (م ۱۱۱۹ھ)(۲۰۱)۔ میر طفیل بلگرامی (م ۱۱۵۱ھ) اور غلام نقشبند لکھنوی (م ۱۱۲۶ھ)(۲۰۲) سے حاصل کی۔ میر عبدالجلیل محدث تھے۔ اُنہیں اسماء الرجال پر عبور حاصل تھا اور اُنہوں نے بڑی تعداد میں احادیث مع اسناد زبانی یاد کر لی تھیں۔(۲۰۳) کتبِ احادیث سے اُن کی محبت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ بھکر میں بخشی اور وقائع نگار(۲۰۴) کے عہدہ سے ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء(۲۰۵) میں سبکدوش ہونے کے بعد گھر جاتے ہوئے راستے میں سندھ کے ایک مقام نوشہرو میں مع تمام خدام وغیرہ کے چھ ماہ تک ٹھہرے رہے تاکہ صحیح بخاری کے اس نسخہ کا مقابلہ اور تصحیح کر سکیں جو اُنہوں نے بھکر میں نقل کیا تھا۔(۲۰۶) عبدالجلیل کے استاد میر مبارک نے ان کو ایک چھوٹے سے رسالہ کی شکل میں اجازہ عطا کیا تھا جو اُنہوں نے اپنے کتب خانہ میں محفوظ رکھا۔(۲۰۷) عبدالجلیل نے ربیع الاوّل ۱۱۳۸ھ/اکتوبر ۱۷۲۵ء میں دہلی میں وفات پائی۔(۲۰۸)

۷۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶ تا ۱۲۰۰ھ/۱۷۰۴ تا ۱۷۸۵ء):

میر غلام علی آزاد بن نوح حسینی، واسطی، حنفی، بلگرامی ۲۵ رصفر ۱۱۱۶ھ (مئی ۱۷۰۴ء) کو بلگرام کے محلّہ میدان پورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے نانا عبدالجلیل بلگرامی سے علمِ حدیث میں سند حاصل کرنے کے بعد وہ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں حجاز روانہ ہو گئے جہاں اُنہوں نے دو سال تک قیام کیا اور اس دوران میں اُنہوں نے مدینہ منورہ میں شیخ حیات سندھی (م ۱۱۶۳ھ) سے صحیح بخاری کا درس لیا

اور مکہ معظمہ میں عبدالوہاب طنطاوی (م ۱۱۵۷ھ) سے حدیث کی کچھ اور کتابیں پڑھیں۔ شیخ حیات نے ان کو صحیح بخاری کے لیے اجازہ عطا کیا۔ آزاد بلگرامی نے ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء میں ۸۴ برس کی عمر میں اورنگ آباد میں وفات پائی۔(۲۰۹)

آزاد بلگرامی ایک مشہور مصنف، مورخ، سوانح نگار اور فارسی شاعری کے نقاد تھے۔(۲۱۰)

مندرجۂ ذیل کتابوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک محدث کی حیثیت سے کتنی اہم خدمات انجام دی ہیں۔

تصانیف:

(۱) ضوّ الداری شرح صحیح البخاری: یہ کتاب الذکوٰۃ تک صحیح بخاری کی شرح ہے جو قسطلانی کی ارشاد الساری پر مبنی ہے۔ نواب صدیق حسن خاں نے اپنی تصنیف اتحاف النبلاء میں اس کا ذکر کیا ہے۔(۲۱۱)

(۲) شمامۃ العنبر فی ماورد فی الہند من سیّد البشر: اس رسالہ میں آزاد نے ایسی تمام احادیث جمع کردی ہیں، جن میں ہند کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔(۲۱۲)

(۳) سبحۃ المرجان فی آثارِ ہندوستان: (۱۳۰۳ھ میں بمبئی میں طبع ہوئی)۔ اس کتاب کے مقدمہ میں علمِ حدیث پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور ان آیاتِ قرآنی کا ذکر کیا گیا ہے، جن سے ہند کا کچھ تعلق ظاہر ہوتا ہے۔

(۴) سند السعادۃ فی حسن خاتمۃ السادات: (بمبئی میں شائع ہوئی) یہ رسالہ فضائل اہلِ بیت کے بارے میں ہے، اور فارسی میں لکھا گیا ہے۔ مصنف نے احادیثِ نبوی اور بعض نامور اولیاء کے اقوال سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کا انجام اچھا ہوگا، اور ان کا بہشت میں داخل ہونا یقینی ہے۔(۲۱۳)

فصلِ چہارم: گیارہویں صدی ہجری کے وسط سے بارہویں صدی ہجری کے وسط تک کے محدثین

۱۔ محمد صدیق بن شریف (م ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۰ء):

محمد صدیق گیارہویں صدی ہجری کے ایک محدث تھے۔ ان کا انتقال ۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۳ء کے بعد ہوا۔ اس سال اُنہوں نے اپنی کتاب شرح الزواجر مکمل کی تھی۔ محمد صدیق کے حالاتِ زندگی کا علم نہیں ہے۔ اُنہوں نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح لکھی تھی جس کا نام نجوم المشکوٰۃ ہے۔ (بانکی پور، حدیث نمبر ۳۶۳) اس میں دینی مسائل کسی قدر وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ (۲۱۴)

۲۔ شیخ حسین الحسینی ہروی (م ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء):

شیخ حسین گیارہویں صدی ہجری کے اوّل نصف میں بقیدِ حیات تھے۔ اُنہوں نے فارسی میں شمائل النبیؐ کی شرحیں لکھیں جن میں سے ایک جس کا نام شرح الشمائل ہے، شہزادہ سلیم (ولادت ۹۷۶ھ، وفات ۱۰۳۷ھ) کے لیے لکھی تھی اور دوسری شرح جس کا نام نظم الشمائل ہے، شہزادہ مراد بن اکبر (ولادت ۹۷۸ھ-۱۰۰۷ھ) کے لیے۔ حکیم عبدالحی حسنی ندوی نے یہ دونوں کتابیں خود پڑھی تھیں اور ان کی بہت تعریف کی ہے۔ (۲۱۵)

۳۔ سیّد جعفر بدر عالم (۱۰۲۳ تا ۱۰۸۵ھ/ ۱۶۱۴ تا ۱۶۷۵ء):

جعفر بن جلال بن محمد حسینی بخاری جو بدرِ عالم کے لقب سے زیادہ معروف ہیں، اُچھ کے مشہور ولی مخدوم جہانیاں سیّد جلال بخاری (م ۷۸۵ھ) کی اولاد میں تھے۔ سیّد جعفر کے والد سیّد جلال مقصودِ عالم جن کو شہنشاہ جہانگیر کے عہد (۱۰۱۴ تا ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۰۵ تا ۱۶۲۸ء) میں شش ہزار سوار کا منصب حاصل تھا، اسلامی علوم کے ایک ممتاز عالم تھے۔ (۲۱۶) سیّد جعفر ۱۲/ شعبان ۱۰۲۳ھ (ستمبر ۱۶۱۴ء) کو احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے والد سے تحصیلِ علم کیا اور ایک قابل عالم بن گئے۔ اور علمِ حدیث و تفسیر میں خاص طور پر بڑی مہارت و قابلیت پیدا کر لی۔ قلمی نسخوں کی نقلیں وہ خود لکھا کرتے تھے اور اس تیز رفتاری سے لکھتے تھے کہ ۲۴ گھنٹوں میں پورا قرآن مجید لکھ لیتے تھے۔

شہنشاہ جہانگیر نے ان کو صوبہ دار بنانے کی پیش کش کی تھی، لیکن اُنہوں نے انکار کر دیا۔ سیّد جعفر نے ۹رذوالحجہ ۱۰۸۵ھ (مارچ ۱۶۷۵ء) کو وفات پائی، اور احمد آباد میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ (۲۱۷)

تصانیف:

(۱) الفرید الطاری فی شرح صحیح البخاری: آصفیہ ا، نمبر ۴۔ ۴۳۳۔ حدیث) یہ کتاب عربی میں صحیح بخاری کی شرح ہے اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۲) روضۃ الشاہ: یہ ضخیم تصنیف ۲۴ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی جلد اولیاء کے ملفوظات سے متعلق ہے اور آخری چار جلدیں محدثین اور مفسرینِ قرآن کے بارے میں ہیں۔ (۲۱۸)

۴۔ ابوالمجد محبوب عالم بن جعفر بدرِ عالم (۱۰۴۷ تا ۱۱۱۱ھ / ۱۶۳۷ تا ۱۶۹۹ء):

ابوالمجد ۳۰ربیع الاوّل ۱۰۴۷ھ (جولائی ۱۶۳۷ء) کو احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے والد جعفر بدرعالم اور گجرات کے دوسرے ممتاز علماء سے تعلیم حاصل کی۔ علمِ حدیث پر درج ذیل کتاب کے علاوہ اُنہوں نے قرآن مجید کی دو تفسیریں بھی لکھیں۔ ایک عربی میں اور ایک فارسی میں۔ فارسی تفسیر اس اعتبار سے بے نظیر ہے کہ یہ ایسی احادیث پر مبنی ہے جو اہلِ بیت سے مروی ہیں۔ ابوالمجد نے جمادی الثانی ۱۱۱۱ھ / نومبر ۱۶۹۹ء میں احمد آباد میں وفات پائی۔ (۲۱۹)

تصنیف:

زینۃ النکات فی شرح المشکوٰۃ: مصنف نے اس شرح میں اہم ترین مکاتبِ فقہ کے نظریات شامل کر لیے ہیں۔ (۲۲۰)

۵۔ شیخ یعقوب بنّانی لاہوری (م ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء):

شیخ یعقوب معروف بہ ابویوسف لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ یہ بہت قابل محدث اور فلسفی تھے۔ ابویوسف دہلی کے مدرسۂ شاہجہانیہ میں استاذ تھے۔ شاہ جہاں کے عہد (۱۰۳۷ تا ۱۰۶۹ھ) میں اُنہوں نے میر عدل کا عہدہ قبول کر لیا، اور اورنگ زیب کے عہد (۱۰۶۹ تا

۱۱۱۹ھ) میں ترقی کر کے ناظرِ محاکم ہو گئے۔ اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کے علاوہ ابو یوسف اسلامی علوم کے مختلف مضامین کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء میں دہلی میں وفات پائی۔(۲۲۱)

تصانیف:

(۱) الخیر الجاری فی شرح صحیح البخاری:

(۲) المعلم فی شرح صحیح مسلم:

(۳) کتاب المصفٰی فی شرح المؤطا: (۲۲۲)

۶۔ مولانا نعیم بن محمد فیض صدیقی اودھی، جونپوری (م ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء):

مولانا نعیم کے دادا شیخ پیر حضرت سالار مسعود غازی (۲۲۳) کے ہمراہ اودھ آئے تھے۔ نعیم کے والد نے بدو سرائے میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اودھ کے مفتی بنا دیے گئے تھے۔ نعیم مناظر الرشیدیہ کے مشہور مصنف عبدالرشید جونپوری (م ۱۰۸۳ھ) کے شاگرد تھے۔ ایک سو برس سے زیادہ عمر پائی اور صفر ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں جون پور میں انتقال کیا۔

تصنیف:

(۱) شرح مشکوٰۃ المصابیح: یہ کتاب اس وقت قلم بند کی گئی جب مصنف کی بینائی میں نقص پیدا ہو گیا تھا۔(۲۲۴)

۷۔ شیخ محمد اکرام بن عبدالرحمٰن حنفی، سندھی (م ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء):

محمد اکرام سندھ میں نصیر پور کے باشندہ تھے۔ ان کا زمانۂ حیات بارہویں صدی ہجری کا اوّل نصف تھا۔ اُنہوں نے ابنِ حجر کی نخبۃ الفکر کی ایک جامع شرح قلم بند کی جس کا نام امعان النظر فی توضیح نخبۃ الفکر ہے۔ اس کا مخطوطہ فرنگی محل، لکھنؤ میں مولانا عبدالحی مرحوم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔(۲۲۵)

۸۔ شیخ یحییٰ بن امین عباسی الہ آبادی (۱۰۸۰ تا ۱۱۴۴ھ/۱۶۶۹ تا ۱۷۳۱ء):

شیخ یحییٰ اپنے چچا شیخ افضل بن عبدالرحمٰن الہ آبادی (م ۱۱۲۴ھ) کے شاگرد تھے۔ شیخ یحییٰ، خوب اللہ الہ آبادی کے نام سے زیادہ معروف تھے۔ وہ قابل محدث اور مختلف علوم کے عالم تھے۔ اُنہوں نے جمادی الاوّل ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء میں وفات پائی۔(۲۲۶)

تصانیف:

(۱) اعانۃ القاری فی شرح ثلاثیات البخاری: یہ کتاب بخاری کی ثلاثیات کی ایک جامع شرح ہے جو عربی میں لکھی گئی ہے۔(۲۲۷)

(۲) اربعین:

(۳) تذکرۃ الاصحاب:

(۴) مآخذ الاعتقاد فی شان الصحابۃ واھل البیت: (عربی میں ہے)۔

(۵) شرح حدیث صلوٰۃ التسبیح۔

(۶) ترجمہ وظائف النبی: (۲۲۸)

۹۔ شاہ محمد فاخر الہ آبادی (۱۱۲۰ تا ۱۱۶۴ھ/۱۷۰۸ تا ۱۷۵۰ء):

محمد فاخر، شاہ یحییٰ الہ آبادی کے فرزند تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور زائر اُن کا تخلص تھا۔ محمد فاخر محدثؒ تھے، اور اُنہوں نے مدینہ منورہ میں شیخ حیات سندھی سے پہلی بار ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں اور اس کے بعد ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء سے ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء تک حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں وہ الہ آباد واپس آئے اور اگلے سال ایک کشتی میں براہِ عظیم آباد (پٹنہ) و مرشد آباد ہگلی پہنچے۔ جہاں سے وہ حجاز جانے والے ایک جہاز میں سوار ہوئے۔ لیکن خلیج بنگال میں زبردست طوفان آ گیا جس کی وجہ سے ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں ان کا جہاز چٹا گانگ کے ساحل سے جا لگا۔ یہاں وہ تین چار مہینے ٹھہرے اور پھر وطن واپس آ گئے۔ شعبان ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء میں محمد فاخر حجاز جانے کے قصد سے پھر روانہ ہوئے۔ لیکن راستے میں بیمار ہو گئے۔ اور ۱۱/ ذوالحجہ ۱۱۶۴ھ کو برہان پور میں وفات پائی۔ شاہ ولی

اللہ دہلوی (م ۱۱۷۲ھ) سے محمد فاخر کے گہرے مراسم تھے اور آزاد بلگرامی بھی ان کے ہم مکتب تھے۔(۲۲۹)

الہ آباد میں فاخر کے مدرسہ میں صحیح مسلم کا ایک نسخہ ہے، جسے روح الامین خاں (م ۱۱۵۱ھ)(۲۳۰) نے نقل کیا تھا اور جو کتب خانہ حبیب گنج میں محفوظ تھا۔(۲۳۱)

تصانیف:

(۱) قرۃ العین فی اثبات رفع الیدین:(۲۳۲)

(۲) رسالۃ نجاتیہ در عقائد حدیثیہ: یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے اور اس کا ایک نسخہ مولانا عبداللہ الباقی دیناج پوری کے خاندانی کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ فارسی میں ہے اور محمد فاخر نے ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں اسلام آباد (چٹاگانگ) میں اپنے مختصر قیام کے دوران میں لکھا تھا۔ اس میں احادیث کی روشنی میں سنیوں کے عقائد کی وضاحت کی گئی ہے۔(۲۳۲)

(۳) نظم عبارتِ سفر السعادۃ:(۲۳۳)

(۴) مثنوی در تعریف علمِ حدیث:(۲۳۴)

۱۰۔ مولانا امین الدین بن محمود عمری، حنفی، جونپوری

(۱۰۷۲ تا ۱۱۴۵ھ/۱۶۶۱ تا ۱۷۳۲ء):

امین الدین جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں ارشد بن عبدالرشید جون پوری سے تعلیم حاصل کی۔ وہ بہت قابل معلم تھے، اور نہ صرف علمِ حدیث بلکہ اقلیدس، حساب، اصطرلاب اور قانونِ وُراثت جیسے مختلف علوم پر بھی عبور رکھتے تھے۔ اُنہوں نے شیخ عبدالحق دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کی تصنیف اَشِعۃ اللمعات کا ایک ملخص تیار کیا تھا۔ وہ ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء تک بقیدِ حیات تھے۔ صحیح تاریخ وفات کا علم نہیں ہے۔(۲۳۵)

۱۱۔ مولانا نور الدین بن صالح احمد آبادی (۱۰۶۳ تا ۱۱۵۵ھ/۱۶۵۳ تا ۱۷۴۲ء):

نور الدین احمد آباد کے ایک مشہور معلم اور بکثرت لکھنے والے مصنف تھے۔ اُنہوں نے

۱۵۰ کتابیں لکھیں جو زیادہ تر شروح و حواشی پر مشتمل ہیں۔ علمِ حدیث میں وہ محبوب عالم (م ۱۱۱۱ھ) کے شاگرد تھے۔ اور ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں جب حج کے لیے مکہ معظمہ گئے تھے تو وہاں کے محدثین سے بھی حدیث کا درس لیا تھا۔ احمد آباد میں ان کا مدرسہ ہدایت بخش کے نام سے مشہور تھا۔ یہ مدرسہ ایک شان دار عمارت میں قائم کیا گیا تھا جو نور الدین کے ایک شاگرد نواب اکرم الدین صدر گجرات نے سوا لاکھ روپے کی کثیر رقم صرف کر کے تعمیر کرایا تھا۔ اور یہ بہت بڑا تعلیمی مرکز بن گیا تھا۔ (۲۳۶) نور الدین نے دوشنبہ ۹ ر شعبان ۱۱۵۵ھ (ستمبر ۱۷۴۲ء) کو ۹۱ سال کی عمر میں احمد آباد میں وفات پائی۔ اور اپنے مدرسہ کی عمارت میں مدفون ہوئے۔ (۲۳۷)

تصنیف:

نور القاری شرح صحیح البخاری: (۲۳۸)

۱۴۔ مرزا محمد بن رستم بدخشی (۱۰۹۸ تا ۱۱۹۵ھ/۱۶۸۷ تا ۱۷۸۱ء):

محمد بن رستم بن قباد حارثی، بدخشی جمعہ ۲۱ ر جمادی الاوّل ۱۰۹۸ھ (اپریل ۱۶۸۷ء) کو جلال آباد میں، جو اب افغانستان میں ہے، پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد رستم جن کو معتمد خاں کا خطاب عطا کیا گیا، اورنگ زیب عالمگیر کی ملازمت میںؒ داخل ہوئے تھے اور ۱۱۱۷ھ/۱۷۰۵ء میں دکن کی جنگ میں مارے گئے۔ مرزا محمد نے اپنے والد سے جو ایک بڑے عالم بھی تھے، تحصیلِ علم کیا۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں اُنہوں نے رسالہ ردِ البدعہ وعقائد اہل السنہ لکھا اور اسی رسالہ کی وجہ سے روح اللہ خاں نے ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء میں ان کو اورنگ زیب عالمگیر سے متعارف کرایا۔ اورنگ زیب نے مرزا محمد کو شش صدی منصب عطا کیا۔ علمِ حدیث پر کتابوں کے علاوہ جن کے نام درج ہیں، مرزا محمد نے دو گراں قدر تاریخی کتابیں بھی لکھیں۔ ایک کا نام تاریخِ محمدیؒ ہے اور دوسری کا "عبرت نامہ"(۲۳۹) مرزا محمد نے ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء کے بعد وفات پائی۔ اُن کی تاریخ محمدیؒ اسی سال مکمل ہوئی تھی۔ (۲۴۰)

تصانیف:

(۱) مفتاح النجا فی مناقب العبا: یہ کتاب فضائل اہلِ بیت کے بارے میں ہے جو زیادہ تر

احادیث پر مبنی ہے۔ اور اس میں اہلِ بیت کی ولادت کا مختصر حال بھی قلم بند کیا گیا ہے۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر ایک باب فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ رمضان ۱۱۲۳ھ (۱۷۱۱ء) میں مرزا محمد نے اسے لکھنا شروع کیا اور ۱۷ر محرم ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) کو اسے لاہور میں مکمل کرلیا۔ (۲۴۱)

(۲) تراجم الحفاظ: (بحار نمبر ۳، ۲۵۲۔ دارالعلوم دیوبند والے نسخہ کے لیے ملاحظہ ہو برہان، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۳۷۸)۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ اس میں ممتاز حفاظِ حدیث کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے گئے ہیں۔ اور اُن کو حروفِ تہجی کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب سمعانی کی کتاب الانساب پر مبنی ہے۔ اور ربیع الاول ۱۱۴۶ھ / اگست ۱۷۳۳ء میں دہلی میں لکھی گئی تھی۔

(۳) نزول الابرار بما صح من مناقب اہل البیت الاطھار: یہ احادیث کا مجموعہ ہے، جن سے آلِ رسولؐ کے اوصاف کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ یہ رسالہ امیر الامراء حسین علی خاں الحسینی بارہوی کے لیے لکھا گیا تھا۔ (۲۴۲)

(۴) تحفۃ المحبین فی مناقب الخلفاء الراشدین: (رام پور، نمبر ۶۶۸)۔ یہ رسالہ چاروں خلفائے راشدین کے اوصاف و فضائل سے متعلق ہے۔ (۲۴۳)

۱۳۔ مرزا جان برکی (م ۱۱۰۰ھ):

اوحد الدین مرزا جان برکی، جالندھری، مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کے باشندہ تھے۔ وہ گیارہویں صدی ہجری کے ایک محدث تھے۔ (۲۴۴) اس سے زیادہ اُن کے بارے میں علم نہیں ہے۔

تصنیف:

نظم الدرر والمرجان: (بانکی پور، ج ۱۵، نمبر ۱۰۳۳) یہ سیرتِ نبویؐ پر ایک جامع تصنیف ہے۔ اس میں حالات، معجزات، خصوصی حقوق، اور امتیازی اوصاف احادیث کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۲ر ذوالحجہ ۱۰۹۱ھ (دسمبر ۱۶۸۰ء) کو مکمل ہوئی تھی۔ (۲۴۵) سیّد علیم اللہ جالندھری (م ۱۲۰۲ھ) نے نثر الجواہر کے نام سے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ (۲۴۶)

۱۴۔ محمد صادق لاہوری (۱۱۲۸ تا ۱۱۹۳ھ/۱۷۱۶ تا ۱۷۷۹ء):

محمد صادق نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں یحییٰ بن صالح المکی اور ابوالحسن سندھی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ ابوالحسن نے ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء میں ان کو مدینہ منورہ میں اجازہ عطا کیا تھا۔ محمد صادق ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں لاہور میں وفات پائی۔ ان کے والد کا اصل وطن کابل تھا۔ اور لاہور میں وہ مسجد وزیر خاں کے امام تھے۔

تصنیف:

ازالۃ الفسادات فی شرح مناقب السادات: یہ کتاب دولت آبادی کی تصنیف مناقب السادات کی شرح ہے۔ اور اس کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ (۲۴۴)

فصل پنجم: شاہ ولی اللہ اور ان کا مکتبِ محدثین

(۱۱۴۶ تا ۱۲۸۳ھ/۱۷۳۴ تا ۱۶۶۶ء)

شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴ تا ۱۱۷۶ھ/۱۷۰۳ تا ۱۷۶۲ء):

قطب الدین ابوعبدالعزیز احمد بن عبدالرحیم عمری، حنفی، دہلوی، جو شاہ ولی اللہ کے نام سے مشہور و معروف ہیں، ایک نامور ہندی محدث تھے۔ شاہ ولی اللہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے چار سال قبل بروز چہار شنبہ، بتاریخ ۱۴ر شوال ۱۱۱۴ھ/فروری ۱۷۰۳ء دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ پانچ سال کی عمر میں ان کی تعلیم کا آغاز ہوا تھا اور صرف ۷ سال کی عمر میں اُنہوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ ولی اللہ نے اس زمانہ کے مدارس کی اعلیٰ ترین تعلیم جب مکمل کی تو ان کی عمر پندرہ برس تھی۔ جہاں تک کہ تحصیلِ علمِ حدیث کا تعلق ہے، شاہ ولی اللہ نے مشکوٰۃ المصابیح، شمائل النبی اور صحیح بخاری کے ایک حصہ کا درس افضل سیالکوٹی (م ۱۱۴۶ھ) اور اپنے والد شاہ عبدالرحیم (م ۱۱۳۱ھ) سے لیا جو فتاوائے عالمگیری کے مرتبین میں شامل تھے۔ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں اُنہوں نے حرمین کا سفر کیا اور وہاں چودہ ماہ تک مقیم رہے۔ حرمین میں اُنہوں نے ابوطاہر بن ابراہیم کردی شافعی، مدنی (م ۱۱۴۵ھ) سے صحاح ستہ، مشکوٰۃ المصابیح اور حصن حصین کا

اور وفد اللہ المالکی، المکی سے مؤطا امام مالک کا درس لیا۔ (۲۴۸) اس کے علاوہ تاج الدین قلعی المکی اور عمر بن احمد المکی سے بھی علمِ حدیث حاصل کیا۔ (۲۴۹) جمعہ ۱۴ ار رجب ۱۱۴۶ھ (دسمبر ۱۷۳۳ء) کو وہ دہلی واپس آئے، اور اپنے والد کے قائم کردہ مدرسۂ رحیمیہ میں حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ طلباء کی کثیر تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، اس لیے کچھ عرصہ کے بعد یہ جماعت ایک وسیع عمارت میں منتقل کر دی گئی جو محمد شاہ (۱۱۳۱ تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۱۹ تا ۱۷۴۸ء) نے اس مقصد کے لیے دی تھی۔ یہاں شاہ ولی اللہ صحاح ستہ، (۲۴۹) مؤطا، مسند الدارمی اور مشکوٰۃ المصابیح وغیرہ کی تعلیم ربع صدی تک دیتے رہے۔ ان کے درس دینے کا طریقہ یہ تھا کہ سب سے پہلے وہ طلباء سے یہ کہتے تھے کہ وہ خود اپنا روزانہ کا سبق پڑھ کر آئیں۔ اور پھر ان سے اس سبق پر بحث و گفتگو کرتے تھے۔ ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں شاہ ولی اللہ نے صحیح بخاری پر جو لیکچر دیئے تھے، ان میں ایک قاری (۲۴۹) خواجہ امین ولی اللّٰہی اور ایک سامع (۲۵۱) محمد الہ آبادی بھی تھے۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے اپنی ایک تصنیف مصفّٰی اور مسویٰ میں بھی کیا ہے، مسائل فقیہہ پر بحث کرتے وقت ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان پر مذاہبِ اربع میں جو اختلافات پایا جاتا ہو، اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے بجائے کم سے کم کر کے دکھائیں۔ بالخصوص ایسے اختلافات کو جو حنفی اور شافعی مسالک میں پائے جاتے ہوں۔ اس مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے، وہ ایسے تمام فقہی مسائل کے صرف ان پہلوؤں پر زور دیتے، اور ان کا تجزیہ کرتے تھے، جن میں اتفاق رائے پایا جاتا تھا۔ اور کسی ایک مسلک کو دوسرے پر فوقیت نہ دیتے تھے۔ یہ ایک ایسا طریقۂ تعلیم تھا جس سے نوجوان طلباء میں وسیع النظری پیدا کرنے میں بہت مدد ملتی تھی، اور ان کے دل میں چاروں اماموں اور ان کے مسالک کے بارے میں احترام و رواداری کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا تھا۔

شاہ ولی اللہ کے ممتاز شاگردوں میں، ان کے فرزند اکبر شاہ عبدالعزیز کے علاوہ جنہوں نے شاہ صاحب سے درسِ حدیث لیا تھا، قاضی ثناء اللہ پانی پتی معروف بہ بیہقیِ وقت، محمد عاشق پھلتی، خواجہ امین ولی اللّٰہی، خیرالدین سواتی، رفیع الدین مراد آبادی وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں۔ (۲۵۲)

شاہ ولی اللہ نے ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ (جولائی ۱۷۶۲ء) کو دہلی میں وفات پائی۔ جہاں خونی دروازہ کے قریب مہندیان میں ان کا مزار اور ان کے اہلِ خاندان کے مزارات اب تک موجود

ہیں۔(۲۵۳)

تصانیف:

علمِ حدیث پر شاہ ولی اللہ کی تصانیف درج ذیل ہیں:

(۱) حجۃ اللہ البالغہ: یہ قاموسی نوعیت کی تصنیف ہے، جس میں علمِ فقہ، دینیات، طبیعیات، الٰہیات، تدبیر المنازل، سیاستہ المدنیہ اور اسرار الدین جیسے اہم علوم پر بحث کی گئی ہے۔ اسرار الدین علمِ حدیث کا اہم ترین حصہ (۲۵۴) اور دینی علوم کی روح ہے، جس میں قرآنی آیات اور احادیث سے بکثرت حوالے دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے ایک باب میں طبقات یا مدارجِ کتبِ احادیث پر بحث کی گئی ہے۔ شاہ صاحب نے درجۂ اوّل کی کتب میں صحیحین کے ساتھ مؤطا مالک کو بھی شامل کیا ہے اور درجۂ دوم میں سنن ابوداؤد و نسائی اور جامع ترمذی کو۔(۲۵۵)

شاہ ولی اللہ کی تصانیف میں حجۃ اللہ البالغہ اسلامی ہند کا ایک ایسا عظیم شاہکار ہے، جس کی تعریف اور قدردانی تمام اسلامی دنیا میں ہوئی۔ نواب صدیق حسن خاں کی رائے ہے کہ 'ہمارے سیوطی ہند کی یہ کتاب اپنی نوعیت کی ایک ایسی نادر تصنیف ہے. جس کی کوئی نظیر عرب اور عجم کے علماء گزشتہ بارہ صدیوں میں کبھی پیش نہ کر سکے'(۲۵۶)

حجۃ اللہ البالغہ پہلی مرتبہ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں صدیقی پریس، بریلی میں حسبِ فرمائش منشی جمال خاں بھوپالی طبع ہوئی تھی۔(۲۵۷) اور اس کا مصری ایڈیشن ۲۳-۱۳۲۲ھ/۵-۱۹۰۴ء میں مطبع خیریہ، قاہرہ نے شائع کیا تھا۔ کئی ہندی علماء نے اُردو میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔

(۲) اربعین: یہ رسالہ چالیس احادیث کا انتخاب ہے، جو حضرت علیؓ بن ابی طالب سے مروی ہیں اور ان کے اخلاف کے توسط سے آنے والی نسلوں تک پہنچی ہیں۔ خرم علی بلہوری (م ۱۲۷۱ھ) نے اُردو میں اس کا ترجمہ کیا تھا اور حواشی بھی لکھے تھے۔ جسے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۸ء میں ہادی علی لکھنوی نے ایک منظوم شرح کی شکل میں قلم بند کیا اور اس کا نام تسخیر رکھا جو ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں مصطفائی پریس، دہلی میں طبع کی گئی تھی۔(۲۵۸)

(۳) وشیقۃ الآخرۃ معروف بہ چہل حدیث: یہ النووی کی اربعین کی فارسی شرح ہے، جس میں

بین السطور اُردو ترجمہ بھی درج کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ عبدالحلیم کا کاخیل کی منظوم پشتو شرح کے ساتھ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں دہلی میں طبع ہوا تھا۔(۲۵۹)

(۴) الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین: یہ رسالہ ایسی چالیس احادیث کا مجموعہ ہے جو شاہ ولی اللہ اور ان کے شیوخ نے عالمِ خواب میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنیں۔ یہ رسالہ مع اُردو ترجمہ کے جو ظہیر الدین احمد نے کیا تھا، ۱۸۹۰ء میں دہلی میں شائع ہوا تھا۔(۲۶۰)

(۵) الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین: (۲۶۱) یہ حدیث مسلسل کا مجموعہ ہے، جو حفاظ کے گروہوں۔ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہاء۔ اہلِ بیت، ہسپانوی، محدثین، مشارقہ یعنی مشرقی صوبوں کے محدثین۔ شاعر محدثین اور علمِ حدیث سے دلچسپی رکھنے والی جماعتوں نے روایت کی ہیں۔ یہ بہت ہی نادر رسالہ صحیح بخاری کی جلد دوم کے اس ترجمے کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کیا گیا تھا جو شاہ ولی اللہ کے ایک شاگرد شیخ محمد الہ آبادی نے ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء سے قبل کیا تھا، اور یہ بانکی پور کی اورینٹل پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔(۲۶۲)

(۶) الارشاد الیٰ مھمات الاسناد: یہ کتاب خود شاہ ولی اللہ کے شیوخ اور ان راویوں کا تذکرہ ہے جن کی سند سے احادیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان لوگوں تک پہنچی ہیں۔ یہ رسالہ شاہ ولی اللہ کی تراجم البخاری کے ساتھ ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں دہلی میں طبع کیا گیا تھا۔(۲۶۳)

(۷) تراجم البخاری: یہ صحیح بخاری کی وسعت و غایت اور اصولِ ترتیب پر مختصر تبصرہ ہے۔(۲۶۴)

(۸) شرح تراجم ابواب البخاری: یہ رسالہ ترجمۃ الابواب عنواناتِ صحیح بخاری کی شرح ہے۔ جو دائرۃ المعارف، حیدرآباد، دکن نے ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں دوسری مرتبہ شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ رسالہ صحیح بخاری کے اس ایڈیشن میں بطور مقدمہ شامل کیا گیا تھا جو ۱۹۴۰ء میں اصح المطابع دہلی میں طبع ہوا تھا۔(۲۶۵)

(۹) مصفا شرح موطا: یہ کتاب امام مالک (م ۱۷۹ھ) کی موطا کی مختصر شرح ہے جو فارسی میں دو جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ اور ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں فاروقی پریس، دہلی میں پہلی بار طبع کی گئی تھی۔ اس

کتاب میں ولی اللہ نے ہر ایک حدیث کا فارسی ترجمہ درج کیا ہے، اور حسبِ ضرورت اس کا مفہوم بھی بیان کر دیا ہے۔ نیز اس کے متعلق مذاہب اربعہ بالخصوص حنفی اور شافعی مکاتب کا نقطۂ نظر بھی بیان کر دیا ہے۔ اور جابجا فقہی مسائل پر بحث کی ہے۔ مگر کسی مسلک کو دوسروں پر ترجیح نہیں دی ہے۔ اس کتاب کے شروع میں ۲۰ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ ہے، جو امام مالک اور ان کی موطأ کے بارے میں ہے جو شاہ ولی اللہ کے خیال میں اور امام شافعی (م ۲۰۴ھ) کے نزدیک بھی حدیث کی سب سے مقدم مستند کتاب ہے اور قرآن مجید کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ (۲۶۶)

(۱۰) مسوّیٰ شرح مؤطا: یہ کتاب ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء میں لکھی گئی تھی اور ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں مطبع فاروقی، دہلی نے اسے مصفّا کے حاشیوں پر طبع کیا تھا۔ یہ رسالہ امام مالک کی مؤطا کی عربی میں شرح یا تعلیقات ہے جس میں زیادہ تر حنفی اور شافعی مکاتب کی آراء پر بحث کی گئی ہے۔ ضخامت میں یہ کتاب مصفا کے آٹھویں حصے کے قریب ہے، اس لیے اتنی جامع نہیں ہے۔ (۲۶۷)

(۱۱) آثار المحدثین: (مخطوطہ، کتب خانہ آصفیہ)

(۱۲) مکتوبات مع مناقبِ امام البخاری و ابنِ تیمیہ: یہ کتاب فارسی میں ہے، اور سیّد عبدالرءُوف نے، جن کا تعلق نذیریہ بزمِ ادب دہلی سے تھا، اُردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ (۲۶۸)

شاہ ولی اللہ کے مکتب سے تعلق رکھنے والے محدثین:

ا۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، نقشبندی، مجددی، مظہری

(۱۱۴۵ تا ۱۲۲۵ھ/۱۷۳۳ تا ۱۸۱۰ء):

قاضی ثناء اللہ پانی جلال الدین کبیر اولیاء (۲۶۹) کی دسویں پشت میں تھے۔ اُنہوں نے حدیث کا درس شاہ ولی اللہ سے لیا اور علمِ تصوف مرزا مظہر جانِ جاناں (م ۱۱۰۵ھ) سے حاصل کیا۔ علمِ حدیث میں ان کی لیاقت و تبحر کی بنا پر اُنہیں شاہ عبدالعزیز دہلوی نے بیہقیِ وقت کا لقب دیا تھا۔ ثناء اللہ کی تفسیر مظہری میں احادیث بکثرت درج کی گئی ہیں، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُنہیں علمِ حدیث پر کتنا زیادہ عبور حاصل تھا۔ (۲۷۰)

تصنیف:

اللباب: (بانکی پور، ۱۵، نمبر ۱۰۳۹) یہ کتاب شمسُ الدین صالحی (م ۹۴۲ھ) کی تصنیف سبل الھدیٰ والرشاد کی جلد سوم کا خلاصہ ہے، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ عالیہ، معاملات اور معمولات بیان کیے گئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ دُعائیں، احکام اور فیصلے وغیرہ بھی شامل کیے گئے ہیں۔ دیباچہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قاضی ثناء اللہ نے یہ کتاب اپنے مرشد مظہر جانِ جاناں کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اللباب میں جن اسناد کا حوالہ دیا گیا ہے، اُن کے اختصارات یوں درج کیے گئے ہیں: خ، برائے البخاری۔ م، برائے مسلم۔ د، برائے ابوداؤد۔ س، برائے النسائی۔ جہ، برائے ابنِ ماجہ۔ ک، برائے مالک۔ فع، برائے الشافعی۔ کم، برائے الحکیم۔ طب، برائے الطبرانی۔ می، برائے الدارمی۔ قط، برائے دارقطنی، وغیرہ وغیرہ۔(۲۷۱) اللباب کا ایک دستخطی نسخہ مدرسہ جامع العلوم، کانپور کے مولانا فاروق کے پاس موجود ہے۔(۲۷۲)

۲۔ شاہ عبدالعزیز بن ولی اللہ دہلوی (۱۱۵۹ تا ۱۲۳۹ھ/ ۱۷۴۶ تا ۱۸۲۳ء):

شاہ عبدالعزیز نے ابتدائی تعلیم اپنے والد شاہ ولی اللہ کے دو ممتاز شاگردوں خواجہ امین اور عاشق پھلتی سے حاصل کی۔ اس کے بعد وہ شاہ ولی اللہ کے مدرسہ میں داخل ہو گئے جہاں اُنہوں نے بہت تفصیل کے ساتھ مصابیح، مسوّیٰ فی شرح المؤطا، صحیحین کا ایک حصہ اور باقی ماندہ صحاح ستہ کا درس لیا۔ ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۰ء میں جب عبدالعزیز کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی، اُنہوں نے تعلیم مکمل کر لی۔ اور ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء میں اپنے والد شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد وہ ان کے مدرسہ میں پروفیسر ہوئے اور وہاں علومِ قرآن و حدیث کا درس ساٹھ برس سے زیادہ مدت تک دیتے رہے۔(۲۷۳)

شاہ عبدالعزیز نے ہند میں علمِ حدیث کی ترقی و اشاعت کے لیے جو خدمات انجام دیں، اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے کئی شاگردوں نے ہند کے مختلف مقامات میں حدیث کی تعلیم و اشاعت کے مرکز قائم کیے، ان شاگردوں اور ان مقامات کے نام، جہاں اُنہوں نے تعلیمِ حدیث کے مراکز قائم کیے، درجِ ذیل ہیں:

(۱) شاہ رفیع الدین دہلوی (م ۱۲۴۹ھ)۔ شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی تھے۔ بمقام

دہلی۔(۲۷۴)

(۲) شاہ محمد اسمٰعیل شہید (۱۱۹۳ تا ۱۲۴۶ھ)، بمقام دہلی۔(۲۷۵)

(۳) شاہ محمد مخصوص اللہ (م ۱۲۷۳ھ)، بمقام دہلی۔(۲۷۶)

(۴) مفتی صدر الدین دہلوی (۱۲۰۴ تا ۱۲۵۸ھ)، بمقام دہلی۔(۲۷۷)

(۵) حسن علی محدث لکھنوی، بمقام لکھنؤ۔(۲۷۸)

(۶) حسین احمد (۱۲۰۱ تا ۱۲۷۵ھ)، بمقام ملیح آباد (نزد لکھنؤ)۔(۲۷۹)

(۷) شاہ رفیع الدین احمد مجددی (م ۱۲۴۹ھ)، بمقام بھوپال۔(۲۸۰)

(۸) شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی (م ۱۳۱۵ھ)، بمقام مراد آباد۔(۲۸۱)

(۹) خرم علی بلہری (م ۱۲۷۱ھ)۔(۲۸۲) اُنھوں نے تحفۃ الاخیار (۲۸۳) کے نام سے صغانی کی مشارق الانوار اور شاہ ولی اللہ کی اربعین کا اُردو ترجمہ کیا، بمقام بلہر (نزد لکھنؤ)۔

(۱۰) شاہ ابوسعید (م ۱۲۵۰ھ)، بمقام رام پور اور دہلی۔

(۱۱) محمد شکور جعفری (۱۲۱۱ تا ۱۳۰۰ھ)، بمقام مچھلی شہر (نزد اعظم گڑھ)(۲۸۴)

(۱۲) شاہ ظہور الحق قلندری۔ بمقام پھلواری شریف (نزد پٹنہ)(۲۸۵)

(۱۳) اولادِ حسین۔ نواب صدیق حسن خاں کے والد۔ بمقام قنوج۔(۲۸۶)

(۱۴) کرم اللہ محدث (م ۱۲۵۸ھ)، بمقام دہلی۔(۲۸۷)

(۱۵) سلامت اللہ بدایونی۔ بمقام کانپور۔(۲۸۸)

تصانیف:

(۱) بستان المحدثین: (مطبوعہ)(۲۸۹) یہ معلومات افزا رسالہ فارسی میں لکھا گیا ہے، جس میں حدیث کی اہم کتب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مؤطا امام مالک سے آغاز اور البغوی کی مصابیح پر اختتام ہوا ہے۔ اور اس میں ان کتب کے مصنفین کے مختصر حالات بھی درج کیے گئے ہیں۔

(۲) عجالۂ نافعہ: یہ اصول الحدیث پر فارسی میں بہت مفید رسالہ ہے، جو ۱۳۰۲ھ میں لاہور میں اور ۱۳۱۲ھ میں دہلی میں طبع ہوا تھا۔

۳۔ شاہ اسحٰق بن افضل فاروقی دہلوی (۱۱۹۲ تا ۱۲۶۲ھ / ۱۷۷۸ تا ۱۸۴۶ء):

۱۲۳۰ھ / ۱۸۲۳ء میں شاہ عبدالعزیز کی وفات کے بعد اُن کے مدرسہ کے پروفیسران کے مشہور شاگرد اور پوتے شاہ اسحاق ہوئے جو بہت قابلیت کے ساتھ بیس برس تک علمِ حدیث کا درس دیتے رہے۔ ۱۲۵۰ھ / ۱۸۴۳ء میں شاہ اسحاق ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے، جہاں اُنہوں نے رجب ۱۲۶۲ھ / جون ۱۸۴۶ء میں وفات پائی۔ (۲۹۰)

تراجم علمائے حدیث ہند میں نوشہروی نے ہند کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے ایسے ۴۱ محدثین کے نام درج کیے ہیں جو شاہ اسحاق کے شاگرد تھے۔ (۲۹۱) ان میں مولانا مظہر نانوتوی اور احمد علی سہارن پوری، دارالعلوم سہارنپور میں حدیث کی تعلیم کا آغاز کرنے والے علماء تھے۔ شاہ عبدالغنی، مشہور و معروف دارالعلوم دیوبند (۲۹۲) کے بانی مولانا قاسم نانوتوی کے استاد تھے۔ اور مولانا نذیر حسین اہلِ حدیث کے مکتبِ محدثین کے بانی تھے۔ ان میں سے چند ممتاز محدثین کے مختصر حالات درج ہیں:

۴ پ۔ مظہر نانوتوی (۱۳۰۲ھ / ۵-۱۸۸۴ء):

مولانا مظہر نانوتوی نے شاہ اسحاق کے علاوہ علمِ حدیث کی تعلیم رشید الدین دہلوی (م ۱۲۴۹ھ) اور مفتی صدرالدین دہلوی (م ۱۲۷۳ھ) سے بھی حاصل کی تھی۔ وہ مظاہر العلوم سہارنپور میں اوّل مدرس، معلم اور محدث تھے۔ (۲۹۲) شیخ الہند مولانا محمود حسن بن ذوالفقار علی دیوبندی (۱۲۶۸ تا ۱۳۳۹ھ) بھی جو دارالعلوم دیوبند کے ناظم اور حسین احمد مدنی کے شیخ تھے، مولانا مظہر کے شاگرد تھے۔

۵۔ احمد علی بن لطف اللہ انصاری سہارنپوری (م ۱۲۰۷ھ / ۱۸۸۰ء):

احمد علی دہلی میں شاہ اسحاق سے سند حاصل کرنے کے بعد فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے مکہ معظمہ گئے تھے، جہاں اُنہوں نے حرمین کے محدثین سے بھی درسِ حدیث لیا۔ حجاز سے واپس آنے کے بعد اُنہوں نے اپنی نگرانی میں اور اپنے مشہور شاگرد مولانا قاسم کے تعاون سے دہلی میں مطبعِ احمدی قائم کیا، جس نے حدیث کی مستند کتابیں طبع کر کے اس ملک میں علمِ حدیث کی اشاعت کے لیے کئی سال تک قابلِ قدر خدمت انجام دی۔

اس ضمن میں صحیح بخاری پر اُن کی تعلیقات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، جس میں نہایت اختصار کے ساتھ صحیح بخاری کے اسناد اور متن کے بارے میں وہ تمام معلومات قلم بند کر دی گئی ہیں جن کو جاننا ایک طالب علم کے لیے ضروری ہے۔(۲۹۴) اس کے علاوہ احمد علی نے جامع الترمذی پر حواشی بھی لکھے تھے جو ۱۳۲۸ھ میں مجتبائی پریس، دہلی نے شائع کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں شورش عظیم برپا ہونے پر مولانا احمد علی نے اپنا مطبع بند کر دیا۔ اور دہلی چھوڑ کر اپنے آبائی شہر سہارن پور چلے گئے، جہاں کچھ عرصہ کے بعد وہ نو قائم شدہ مدرسہ مظہر العلوم میں حدیث کے استاد ہو گئے۔ احمد علی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں اپنی وفات تک علمِ حدیث کی یہ خدمت انجام دیتے رہے۔(۲۹۵)

۶۔ شاہ عبدالغنی مجددی (۱۲۳۵ تا ۱۲۹۶ھ/۱۸۱۹ تا ۱۸۷۹ء):

شاہ عبدالغنی کے حالات شیخ احمد سرہندی کے مکتبِ محدثین کے سلسلہ میں درج کیے جا چکے ہیں۔

۷۔ قاسم بن اسد بن غلام شاہ نانوتوی (۱۲۴۶ تا ۱۲۹۷ھ/۱۸۳۰ تا ۱۸۸۰ء):

مولانا قاسم نے درسیاست یعنی عربی و فارسی نصاب کی تعلیم اپنے چچا مملوک علی سے حاصل کی جو دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قائم کردہ مدرسہ میں معلم تھے۔ اور حدیث کا درس شاہ عبدالغنی مجددی سے لیا۔ مذکورۂ بالا مدرسہ میں کچھ عرصہ تک معلم رہنے کے بعد مولانا قاسم، مطبع احمدی، دہلی سے منسلک ہو گئے، اور اپنے استاد احمد علی کے ساتھ کتبِ حدیث کو مرتب کرنے اور ان پر حواشی لکھنے کا کام ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم شروع ہو جانے تک انجام دیتے رہے۔ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں اُنہوں نے فریضۂ حج ادا کیا۔ اور حاجی امداد اللہؒ (م ۱۳۱۷ھ) کے مرید ہو گئے، جنہوں نے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں مولانا قاسم نے اپنے مرشد حاجی امداد اللہ اور اپنے استاد شاہ عبدالغنی کے حسبِ ایما دیوبند میں ایک عربی مدرسہ قائم کیا جو کچھ عرصہ بعد ہی دارالسلام کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس مدرسہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، فخر الحسن گنگوہی اور احمد حسین امروہی نے مولانا قاسم سے حدیث کا درس لیا۔ مولانا قاسم نے ۴ ربیع الاوّل ۱۲۹۷ھ (فروری ۱۸۸۰ء) کو وفات پائی اور نانوتہ میں دفن کیے گئے۔(۲۹۶)

۹۔ میاں صاحب سیّد نذیر حسین بہاری دہلوی

(۱۲۲۰ تا ۱۳۲۰ھ/۱۸۰۵ تا ۱۹۰۲ء):

میاں صاحب بہار کے ضلع مونگھیر میں بمقام بتھوہ پیدا ہوئے تھے۔ مشکوٰۃ المصابیح اور قرآن مجید کے چند پاروں کی تفسیر کی تعلیم شاہ محمد حسین سے صادق پور میں حاصل کی جو پٹنہ کے قریب ہے۔ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں وہ دہلی گئے اور شاہ اسحاق کے مدرسہ میں داخل ہو گئے، جہاں اُنہوں نے علمِ حدیث میں اعلیٰ ترین امتحان کامیاب کر کے ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں سند حاصل کی۔ (۲۹۷) اس کے بعد اُنہوں نے دہلی کی مسجد اورنگ آبادی میں ایک مدرسہ قائم کیا جو کچھ عرصہ کے بعد پھاٹک حبش خاں کی ایک عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ مدرسہ اور اس کا کتب خانہ جو میاں صاحب کے نام پر کتب خانہ نذیریہ کہلاتا ہے، اب تک موجود ہیں۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی کی طرح میاں صاحب بھی ساٹھ برس تک علمِ حدیث کا درس دیتے رہے۔ محدث کی حیثیت سے ان کی شہرت تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئی۔ چنانچہ افغانستان، بخارا، سمرقند، حجاز اور سوڈان جیسے دور دراز ملک سے بھی شوقین طلباء اُن سے حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی آتے تھے۔ میاں صاحب کی سوانح عمری، الحیات بعد الممات میں ایسے پانچ سو محدثین کے نام موجود ہیں، جو میاں صاحب کے شاگرد تھے۔ حافظ ابراہیم آردی، بانیٔ مدرسۂ احمدیہ، آرہ۔ شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی، عون المعبود فی شرح ابی داوٗد (۲۹۸) کے مشہور مصنف، حافظ عبدالمنان پنجابی۔ نواب وحید الزمان حیدرآبادی۔ عبدالعزیز رحیم آبادی بہاری۔ حافظ عبداللہ غازی پوری (م ۱۳۲۲ھ) اور عبدالرحمٰن مبارک پوری تحفۃ الاحوذی فی شرح جامع الترمذی (۲۹۹) کے مصنف ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔ یہ ایسے محدث تھے جنہوں نے علمِ حدیث کی اشاعت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں اور اپنے سینکڑوں شاگردوں کو بھی اس مقصد کے لیے ہند کے تمام حصوں میں روانہ کیا تھا۔

میاں صاحب نذیر حسین نے سو برس کی عمر پائی۔ اور رجب ۱۳/ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو انتقال کیا۔ اُنہیں شیدی پورہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ (۳۰۰)

دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کا قیام

اس باب کی فصل دوم، فصل سوم اور فصل پنجم میں ان ہندی محدثین کا ذکر کیا گیا ہے، جن کا تعلق مکتبِ حضرت شیخ احمد سرہندی (۱۰۰۰ تا ۱۲۹۶ھ)، مکتبِ شیخ عبدالحق دہلوی (۱۰۰۰ تا ۱۲۲۹ھ) اور مکتبِ شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۲۵ تا ۱۲۸۳ھ) سے تھا۔ شیخ عبدالحق کا مدرسہ دہلی میں بارہویں صدی ہجری کے آخر تک قائم رہا۔ پھر شیخ سلام اللہ محدث نے اس کو رام پور منتقل کر دیا اور وہی اس کے سربراہ رہے۔ شیخ احمد سرہندی کا مکتب سرہند میں تھا جو ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۰ء سے سکھوں کی غارت گری کا شکار بن گیا۔ اس لیے ۱۱۷۷ھ/ ۱۷۶۲ء میں یہ بھی رام پور منتقل کر دیا گیا۔ ریاست رام پور کے نوابوں کی شاہانہ فیاضی کی بدولت سرہند اور دہلی کے یہ دونوں مکاتبِ حدیث بہت اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ تیرہویں صدی ہجری کی تیسری دہائی تک علمِ حدیث کی اشاعت و ترقی کا فرض انجام دیتے رہے۔ لیکن ۱۲۲۹ھ میں شیخ سلام اللہ کی وفات کے بعد شیخ عبدالحق محدث کا مدرسہ بند ہو گیا۔ اور دوسرے مدرسہ کے سربراہ شاہ ابوسعید مجددی (م ۱۲۵۰ھ) رام پور چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ اور شاہ عبدالعزیز کے ارادت مندوں میں شامل ہو گئے۔ اس طرح سرہند کا مکتبِ محدثین بھی شاہ ولی اللہ کے مکتب میں ضم ہو گیا۔ شاہ عبدالغنی بن ابوسعید مجددی جو دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتوی کے استاد تھے، اس متحدہ مکتبِ محدثین کی ممتاز ترین شخصیت تھے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند شاہ ولی اللہ اور شیخ احمد سرہندی دونوں بزرگوں کے مکاتبِ حدیث کا ماحصل ہے۔ اور اس میں ان دونوں اداروں کی روح کارفرما ہے۔

مظاہر علوم سہارن پور اپنے قیام کے لیے مولانا مظہر نانوتوی کا مرہونِ منت ہے جو شاہ اسحاق دہلوی کے شاگرد تھے۔ جب سے یہ ادارے قائم ہوئے ہیں، یہ اپنے قابل علماء کی سرکردگی میں منجملہ دیگر اسلامی علوم کے ہند میں علمِ حدیث کی اعلیٰ تعلیم کا بھی انتظام کر رہے ہیں۔ اور نہ صرف ہند کے مختلف صوبوں بلکہ اسلامی دنیا کے مختلف حصوں سے بھی طلباء کی ایک بڑی تعداد یہاں تحصیلِ علم کے لیے آتی ہے۔ چنانچہ علمِ حدیث میں خصوصی مہارت و قابلیت حاصل کرنے کے لیے ہندی طلباء کے حجاز جانے کا صدیوں پرانا طریق قدرتی طور پر مسدود ہو گیا، اور ہند کے دو بڑے ادارے

دارالعلوم اور مظاہر اب بھی حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی زندہ یادگار کی حیثیت سے برقرار ہیں۔

حواشی:

(۱) ابنِ فہد، معجم، مخطوطہ، بانکی پور، نمبر ۲۴۲۹، و ۲۶۱ الف، سخاوی۔ الضوء اللامع، ج ۹، ص ۱۵۱۔
(۲) ایضاً، ج ۱، ص ۲۰۸۔
(۳) ایضاً، ج ۲، ص ۴۴۔
(۴) ایضاً، ص ۷۱۔
(۵) ایضاً، ج ۳، ص ۸۷۔
(۶) ایضاً۔
(۷) ایضاً، ص ۲۳۲۔
(۸) ایضاً، ج ۵، ص ۲۵۴۔
(۹) ایضاً، ج ۶، ص ۱۴۵۔
(۱۰) ایضاً، ص ۱۸۰۔
(۱۱) ایضاً، ج ۱۰، ص ۱۶۸۔
(۱۲) ایضاً، ص ۱۵۶۔
(۱۳) ایضاً، ص ۲۴۵۔
(۱۴) ایضاً، ج ۵، ص ۱۴۶۔
(۱۵) ایضاً، ج ۱۱، ص ۶۱۔
(۱۶) ایضاً، ج ۳، ص ۲۱۶۔
(۱۷) کتاب کا پورا نام عمدۃ القاری والسامع فی ختم الصحیح الجامع۔ ابن العماد، شذرات، ج ۸، ص ۱۶۔
(۱۸) سخاوی، الضوء اللامع، ج ۳، ص ۲۲۲۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۶۲، عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۵۴۔
(۱۹) یعنی الاودھی، (نمبر ۲)۔ الجونپوری (نمبر ۴) اللکھنوی (نمبر ۶) اور الدھلوی (نمبر ۱۴)۔
(۲۰) اتھے Catalogue of Persian Manuscrips in the library of India :(H.Ethe) Office، آکسفورڈ، ۱۹۰۳ء، ج ۱، نمبر ۲۶۴۱۔
(۲۱) عبدالحی حسنی، معارف العوارف، مخطوطہ، باب: الحدیث فی بلاد الہند۔
(۲۲) ایوانو: Catalogue of Persian Manuscripts Asiatic Society Ivanow، کلکتہ ۱۹۲۴ء،

نمبر ۹۹۶۔

(۲۳) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۳۸-۲۳۷، بیرم خاں غلطی سے پیر خان چھپ گیا ہے، غلام سرور، خزینہ، ج ۱، ص ۴۲۷-۹۲۸ھ کے بجائے غلطی سے ۹۹۸ لکھا ہے۔ فقیر محمد، ہدائق، ص ۸۰-۳۷۹، صدیق حسن، اتحاف، ص ۳۰۲ اور تقصار، ص ۱۷۷۔ محمد صدیق، کلمۃ الصادقین، مخطوطہ بانکی پور، نمبر ۶۷۱ (فارسی) و ۸۰ ب۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۰۶۔ عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۳۵-۳۶۔ معارف، ج ۲۲، ص ۴۲، ۲۵۹۔ استوری، کتابِ مذکور، ج ۲، ص ۹۳-۱۹۲۔ عبدالاوّل بن علی غلطی سے عبدالاوّل بن الاعلیٰ کے بجائے لکھا ہے۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، حوالۂ مذکور۔

(۲۴) ایضاً، حوالۂ مذکور۔

(۲۵) معارف، حوالۂ مذکور۔

(۲۶) عبدالحق، اخبار الاخیار، حوالۂ مذکور۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، حوالۂ مذکور، زیرِ عنوان رسالۂ احوالِ پیغمبر۔

(۲۷) الغ خانی، ظفر الوالہ۔ ج ۱، ص ۲۶۰۔

(۲۸) ایوانو، فہرست مذکور، نمبر ۹۹۶۔ استوری، کتابِ مذکور ۲۷، ص ۱۹۳۔

(۲۹) لے اسٹرینج، کتابِ مذکور، ص ۴۸، سیوطی، لب اللباب، مرتبہ و۔تھ veth، ص ۹۔

(۳۰) بکھرا میں ان کی قبر اب تک موجود ہے۔ عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ج ۴، تذکرۂ شیخ مبارک بناری۔

(۳۱) تجلی نور، ص ۵۵، معارف، ج ۲۵، ش ۵، ص ۳۴۷۔ عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، حوالۂ مذکور۔

(۳۲) تجلی نور، حوالۂ مذکور، معارف، حوالۂ مذکور، فہرست، بانکی پور، ۵ (۲) ۹۳: وقدتمت هذه النسخة الشريفة المسمى مدارج الاخبار، وكان اسمهاقبل الترتيب مشارق الانوار۔

(۳۳) نمبر ۳۶۴، حدیث۔ کتب خانہ بانکی پور کی فہرست کے مرتب اس کتاب اور اس کے مصنف کا صحیح تعین نہیں کر سکے، اس لیے اس بارے میں ان کی رائے کوئی وزن نہیں رکھتی۔

(۳۴) ایضاً۔

(۳۵) بدایونی، منتخب التواریخ، ص ۴۴ = ہیگ، ص ۴۲۔ بدایونی نے بھکاری کو بھیرکاں سمجھا۔ ملاحظہ ہو علی حیدر کاکوروی، مشاہیر کاکوروی، لکھنؤ، ۱۹۲۷ء، ص ۴۴۱۔

(۳۶) عبدالحی ندوی، معارف العوارف، باب: الحدیث فی بلاد الہند۔

(۳۷) بدایونی، منتخب، ۴۴ = ہیگ ۴۲۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۳۳۔ علی حیدر کاکوروی، مشاہیر کاکوروی، ص ۴۴۱ و مابعد، عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ج ۴، تذکرۂ نظام الدین بن سیف الدین۔ معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۳۲۔

(۳۸) عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۵۵: وكان حافظ القرآن و صحيح البخاری وكان يدرس عن ظهر

قلبہ۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۴، معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۶۰-۲۵۹۔

(۳۹) طاہر پٹنی، مجمع بحا الانوار، نول کشور، لکھنؤ، ۱۳۱۴ھ، ج ۱، ص ۳۔ اور المغنی، ابنِ حجر کی تقریب کے حاشیہ پر طبع شدہ، دہلی، ۱۲۹۰ھ، ص ۳، ۴۔

(۴۰) عید روسی، نور السافر، ص ۶۲-۳۶۱۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۲۶۴۔ آزاد، مآثر الکرام، ص ۹۶-۱۹۴۔ آزاد، سبحہ المرجان، ص ۴۳، غلام سرور، خزینۃ، ج ۱، ص ۳۷-۴۳۶۔ فقیر محمد، حدائق، ۸۶-۳۸۵۔ صدیق حسن، اتحاف، ص ۳۹۷۔ صدیق حسن ابجد، ص ۸۹۵۔ صدیق حسن، تقصار، ص ۱۸۰۔ عبدالحی لکھنوی کی التعلیقات السنیہ، فوائد البھیہ کے حاشیہ پر طبع شدہ، لکھنؤ ۱۸۹۵ء، ص ۶۷۔ رحمان علی تذکرۂ علماء، ص ۹۶-۱۹۵۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۶۴۔ فہرست بانکی پور، ج ۲، ص ۳۲، ۳۴۔ فہرست بوحار، ج ۲، ص ۴۶۷۔ بروکلمن، ضمیمہ ا، ص آ ۶۰۱، ۶۰۲۔

(۴۱) اس کتاب کے صحیح نام کے لیے ملاحظہ ہو، مصنف مذکور کی کتاب مجمع بحار، ص ۴۔

(۴۲) طاہر پٹنی، المغنی، ابنِ حجر کی تقریب کے حاشیہ پر طبع شدہ، دہلی، ۱۳۰۸ھ، ص ۳۵۳۔

(۴۳) فہرست بانکی پور، ج ۱۲، ص ۶۸۔

(۴۴) طاہر پٹنی، تذکرۃ الموضوعات، مصر، ۱۳۴۳ھ، طبع اوّل، ص ۴۔

(۴۵) ایضاً، ص ۱۱۔

(۴۶) ایضاً، ص ۲۲۶۔

(۴۷) فہرست بانکی پور، ج ۵، ح ۲، ص ۳۳۔

(۴۸) ایضاً، ج ۱۲، ص ۶۷۔

(۴۹) کتاب کا پورا نام مجمع بحار الانوار فی لطائف التنزیل وغرائب الاخبار۔

(۵۰) طاہر پٹنی، مجمع بحار، نول کشور، لکھنؤ، ۱۳۱۴ھ، ج ۲۔

(۵۱) ایضاً، ج ۱، ص ۳، ۴۔ ج ۴، ص ۲۔

(۵۲) ایضاً، ج ۳، ص ۵۵۱۔

(۵۳) ایضاً، ج ۱، ص ۳، ۴۵۔ ج ۳، ص ۵۰۶۔

(۵۴) صدیق حسن، ابجد العلوم، ص ۸۹۶۔

(۵۵) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، مخطوطہ، ج ۴، تذکرۂ مولانا طیب سندھی، بحوالۂ گلزارِ ابرار۔ عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۳۵، ۳۶۔

(۵۶) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۴، تذکرۂ شیخ جمال برہان پوری۔

(۵۷) ایضاً، حوالۂ مذکور۔

(۵۸) بدایونی، منتخب، ص ۷۰ = ہیگ، ص ۱۱۴۔

(۵۹) یعنی شیر شاہ، سلیم شاہ، فیروز شاہ اور عادل شاہ جنہوں نے ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء سے ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء تک حکومت کی۔ ہیگ، ہسٹری، ص ۹۸، نمبر ۶۔

(۶۰) ایضاً، نیز ص ۱۱۳، نمبر ۲۔

(۶۱) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۴، تذکرۂ شیخ عبداللہ سلطان پوری۔

(۶۲) ۱۰۰۶ھ بمطابق غلام سرور، خزینہ، ج ۱، ص ۴۴۷، ۴۴۸۔

(۶۳) ۔

(۶۴) ۔

(۶۵) ۔

(۶۶) ۔

(۶۷) ۔

(۶۸) ۔

(۶۹) اس عہدہ سے متعلق تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، ابوالفضل، آئینِ اکبری، ج ۱۷، ص ۲۷۰۔

(۷۰) ہیگ، ہسٹری، ص ۴۱۲، نوٹ۔

(۷۱) بدایونی، منتخب، ص ۴۸ = ہیگ، ص ۱۳۱۔

(۷۲) عیدروی، نور السافر، ص ۸۰-۳۷۰۔ بدایونی نے اس کی تاریخ وفات، ج ۳، ص ۱۳۱ میں ۹۹۱ھ اور ج ۲، ص ۳۱۲ میں ۹۹۲ھ لکھی ہے۔ حالات کے لیے ملاحظہ ہو، ابوالفضل آئینِ اکبری، ج ۱، ص ۴۹۰۔ مراۃ العالم، و ۲۶۲ ب۔ مآثر الامرا، محمد حسین آزاد، دربارِ اکبری، ۲۸-۳۲۰۔ عبدالحی لکھنوی، طرب الاثل، لکھنو، ص ۲۸۱۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ۱۳۴۔ فہرست، بحار، ج ۲، ص ۱۴۶۔

(۷۳) ایک مخطوطہ دارالعلوم دیوبند میں بھی موجود ہے۔

(۷۴) اس کتاب کے مشمولات کے لیے ملاحظہ ہو، فہرست کتب خانہ بحار، ج ۲، ص ۵۰-۴۴۶۔

(۷۵) بروکلمن، ضمیمہ ۲، ص ۶۰۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ وظائف النبی فی ادعیت الماثورہ ہے جس کا ذکر عبدالحی حسنی ندوی نے معارف العوارف میں مصنفات اہل الہند فی الحدیث کے ضمن میں کیا ہے۔

(۷۶) عماد الدین ترکی کے لیے عیدروی، نور السافر، ص ۲۰۴ اور غوث گوالیاری کے لیے بدایونی منتخب، ص ۵ = ہیگ، ص ۶، ملاحظہ ہو۔

(۷۷) عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۳۴، ابوالحسنات، کتاب مذکور، ص ۷۶۔

(۷۸) بانکی پور، ج ۵، ج ۲، نمبر ۴۵۴۔

(۷۹) نمبر ۱۶، اصولِ حدیث۔

(۸۰) دستی فہرست، نمبر ۷۰۴، نوادر۔

(۸۱) بدایونی، منتخب، ص ۴۴، ۴۵۔ ہیگ، ص ۷۰-۷۳۔ مراۃ احمدی، ضمیمہ، ترجمہ نواب علی، بمبئی، ۱۹۲۴ء، ص ۶۷-۶۹۔ آزاد، سبحۃ المرجان، ص ۴۵، مآثر الکرام، ص ۱۹۶۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۸۹-۳۸۸۔ صدیق حسن۔ ابجد، ص ۸۹۶، رحمٰن علی، تذکرۂ علماء ۲۴۹۔ فہرست، بحار، ج ۳، ص ۱۸۸۔

(۸۲) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۴، تذکرۂ طیب سندھی۔

(۸۳) ایضاً، تذکرۂ طاہر بن یوسف سندھی، گلزارِ ابرار۔

(۸۴) ایضاً۔

(۸۵) عبدالحی حسنی، معارف العوارف، باب: مصنفات اہل الہند فی الحدیث۔

(۸۶) ایضاً، بیان شروح البخاری۔

(۸۷) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، حوالۂ مذکور۔

(۸۸) بدایونی، منتخب، ص ۱۲= ہیگ، ص ۲۰۔

(۸۹) ایضاً، ص ۴۹-۱۴۲=۰۹-۲۰۰۰۔ ص ۲۶۰۔ ۲۶۰۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، تذکرۂ یعقوب بن حسن۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۹۵-۳۹۴۔ اعظمی، تاریخ کشمیر، ص ۱۱-۱۱۰۔ رحمٰن علی، تذکرۂ علماء، ص ۲۵۵۔ موخر الذکر دو کتابوں میں ان کی تاریخ پیدائش ۹۷۸ھ بیان کی گئی ہے اور معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۶۱ میں یہی حوالہ دیا گیا ہے جو درست نہیں۔ ملاحظہ ہو، بدایونی، حوالۂ مذکور، اور اسٹوری، کتابِ مذکور، ج ۲، ص ۱۹۳۔

(۹۰) معارف، ج ۲۲، ش ج۔

(۹۱) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، حوالۂ مذکور۔

(۹۲) حاجی کشمیری، شرح شمائل النبیؐ مخطوطہ، بانکی پور، نمبر ۱۱۸۲، فارسی، و ۳۰۔

(۹۳) شرح حصن حصین، مخطوطہ، بانکی پور، نمبر ۱۴۱۹، فارسی، خاتمہ! حاجی محمد الکشمیری، ثم المکی، ثم المدنی، ثم الکشمیری۔

(۹۴) رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۴۶۔ فہرست بانکی پور، ج ۱۶، ص ۵۱، معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۳۶۱۔ اسٹوری، کتابِ مذکور، ج ۲، ص ۱۷۵۔

(۹۵) مصنف نے اپنی کتاب شرح حصن حصین کے خاتمہ میں اپنی تصانیف کے نام درج کیے ہیں۔ مخطوطہ بانکی پور۔

(۹۶) مخطوطہ، بانکی پور، و ۱۴۴۔

(۹۷) بانکی پور، ج ۱۶، نمبر ۱۴۱۹۔ مکتوب چٹا گانگ، ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء۔

(۹۸) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۵، تذکرۂ عثمان بن عیسیٰ بن ابراہیم سندھی، گلزارِ ابرار۔

(۹۹) عبدالحی حسنی، معارف العوارف: شروح البخاری۔

(۱۰۰) لوتھ، فہرست مذکور، نمبر ۱۲۹۔

(۱۰۱) ایضاً۔

(۱۰۲) بدایونی، منتخب، ص ۵۳۔ ہیگ، ص ۸۷۔

(۱۰۳) بدایونی، منتخب، ص ۵۲۔ ہیگ، ص ۸۶۔

(۱۰۴) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، تذکرۂ منور بن عبدالجید لاہوری، اور معارف العوارف: شروح حصن حصین و شروح المشارق۔

(۱۰۵) فقیر محمد، حدائق، ص ۴۰۴۔ عبدالحی حسنی، معارف العوارف: شروح شمائل النبیؐ۔

(۱۰۶) خودنوشت حالات، عیدروسی، نورالسافر، ص ۴۳-۳۴۴۔ محبی، خلاصۃ الاثر، مصر، ج ۲، ص ۴۴۔ تعلیق السنیہ، ص ۳۶۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۴۰۶-۴۰۷۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۲۹۔

(۱۰۷) فقیر محمد، حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۷ میں اٹھارہ تصانیف کے نام لکھے گئے ہیں۔ بروکلمن، ضمیمہ ا، ص ۶۱۷۔

(۱۰۸) عیدروسی، نورالسافر، ص ۳۳۸۔

(۱۰۹) ان کے شاگرد احمد بن علی بسکری نے ان سے صحیح بخاری کا درس لیا تھا اور ان کے ایک رسالہ کا بھی یہی نام تھا۔ بوحار، فہرست، ج ۲، ص ۴۵۴۔

(۱۱۰) عیدروسی، نورالسافر، ص ۳۳۸۔

(۱۱۱) شطاری سلسلہ کے متعلق معلومات کے لیے ملاحظہ ہو جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۴ء، ج ا، ص ۲۱۶۔

(۱۱۲) وحشی نگرامی، وفیات الاخیار، ص ۶۵۔

(۱۱۳) ص ۳۵-۱۳۴۔

(۱۱۴) حالات کے لیے ملاحظہ ہو، اعظمی، تاریخ کشمیر، ص ۱۱۹۔

(۱۱۵) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۵، تذکرۂ شیخ احمد مجدد۔ بدخشی کا سلسلۂ اسناد حسب ذیل ہے، القاضی بهلول البدخشي عن الشيخ عبدالرحمن بن فهد عن ابيه الشيخ عبدالقادر و عمه الشيخ جار الله عن ابيهما الشيخ عزالدين عبدالعزيز عن جده الحافظ الرحله تقي الدين محمد بن العلوی الهاشمی و الحافظ شهاب الدين ابن حجر العسقلاني۔

(۱۱۶) رحمان علی کا بیان (تذکرۂ علماء، ص ۱۰) کہ عبدالرحمٰن ہندی محدث تھے، درست نہیں ہے، زبدۃ المقاصد، ۹۲و الف۔

(۱۱۷) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۳۰۳۔ غلام سرور، خزینۃ، ج ا، ص ۶۰۷۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۴۰۴-۴۰۶۔ محسن

ترہتی، الیانع الجنی، ص ۹۱-۹۵۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۰-۱۲۔

(۱۱۸) معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۳۵-۳۴۴۔

(۱۱۹) وکان یدرس فی علوم شتی من الفقہ والاصول والحدیث (المشکوٰۃ والبخاری)۔ عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، حوالۂ مذکور۔

(۱۲۰) برہان احمد The Mujaddids Conception of Tauhid، مجدد کا نظریۂ توحید)، لاہور، ۱۹۴۰ء، ص ۱۶ و مابعد۔

(۱۲۱) الفرقان، ولی اللہ نمبر، مرتبہ نعمانی، بریلی، ۱۹۴۱ء، اشاعتِ دوم، ص ۳-۱۷۲۔ معارف، حوالۂ مذکور۔

(۱۲۲) معارف، حوالۂ مذکور۔

(۱۲۳) معارف، حوالۂ مذکور۔

(۱۲۴) محسن ترہتی، الیانع الجنی، ص ۹۵۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۴۱۷۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۹۰۔ نیز عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر اور العوارف، پانی پتی، تذکرۃ الانساب تذکرۂ سعید بن احمد سرہندی۔

(۱۲۵) محسن ترہتی، الیانع، حوالۂ مذکور، عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر: تذکرۂ فرخ بن سعید۔

(۱۲۶) شیخ مرشد کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو، احمد علی خاں شوق کا تذکرۂ کاملانِ رام پور، دہلی، ۱۲۲۹ء، ص ۹۱-۳۸۹۔

(۱۲۷) ایضاً، ص ۳۸۹۔

(۱۲۸) ایضاً، ص ۴۹-۱۴۷۔ معارف، ج ۳۳، ش ۶، ص ۴۴۴۔

(۱۲۹) غلام سرور، خزینہ، ج ۱، ص ۶۳۹ و مابعد۔ فقیر محمد، حدائق، ۴۱۹۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۲۱۲۔ فہرست بانکی پور، ج ۱۶، ص ۷۱-۲-۷۲۔ معارف، حوالۂ مذکور۔

(۱۳۰) فقیر محمد، حدائق، ص ۴۲۴۔ معارف، حوالۂ مذکور۔

(۱۳۱) معارف، ج ۲۳، ش ۶، ص ۴۴۳۔

(۱۳۲) عبدالحی حسنی، معارف العوارف: شروح البخاری۔

(۱۳۳) محسنی ترہتی، الیانع، ص ۸۸-۹۰۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۷۲-۴۷۱۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۴۰۔ احمد علی شوق، تذکرۂ کاملانِ رام پور، ص ۳، ۵۔ محمد زکریا کاندہلوی، مقدمہ اوجز المسالک فی شرح مؤطا مالک، سہارنپور، ۱۳۴۸ھ، ص ۴۲، ۴۳۔

(۱۳۴) ان کی اسانید صحاح ستہ کو محسن ترہتی نے اپنی کتاب لایانع الجنی، دہلی، ۱۲۸۷ھ، میں محفوظ کرلیا ہے۔

(۱۳۵) محسن، الیانع، ص ۸۳-۸۵۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۴۹۱۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۲۶۔ محمد زکریا، مقدمہ اوجز، ص ۴۲۔ معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۴۸-۳۴۷۔

(۱۳۶) صدیق حسن تقصار، ص ۸۴-۱۸۳۔ ریو، فہرست مذکور، ج ۱، ص ۱۴۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج ۲۲، ۱۹۲۵ء۔ ہدایت حسین، مولانا عبدالحق کی خودنوشت سوانح عمری، ص ۴۳، ۴۴۔

(۱۳۷) فہرست بانکی پور، ج ۶، ص ۱۲-۱۱۱۔

(۱۳۸) یہ گراں قدر مخطوطہ شفاالملک حکیم حبیب الرحمٰن کے پاس ہے۔ معارف، ج ۳۳، ش ۲، ۱۹۳۴ء، ص ۱۲۲۔

(۱۳۹) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۲۴۲۔

(۱۴۰) شیخ عبدالوہاب سے درس لینے کی مدت تین سال کے قریب ہے۔ شیخ الاسلام، شرح بخاری، مخطوطہ، بانکی پور، نمبر ۸-۱۲، فارسی مخطوطہ، و ۲۶۔

(۱۴۱) بدایونی، منتخب، ص ۱۱۳، ہیگ ۱۶۷۔

(۱۴۲) بدایونی، منتخب، ص ۱۱۵، ۱۱۶۔ ہیگ، ص ۱۷۰، ۱۷۱۔

(۱۴۳) صحاح ستہ، موطا مالک، مسند احمد بن حنبل اور طبرانی، بیہقی دارقطنی وغیرہ کے مرتب کردہ احادیث کے مجموعوں کے علاوہ ان تصانیف میں مندرجہ ذیل کتاب کے حوالے بھی ملتے ہیں۔

النوری، شرح مسلم (ماثبت بالسنہ، لاہور، ۱۳۰۷ھ، ص ۱۸، ۲۵، ۵۵)۔ المارزی، شرح مسلم (ایضاً، ص ۶۶) ابن حجر، تبیین العجب (ایضاً، ص ۷۱، موضوعات پر) علی متقی، کنز العمال (ایضاً، ص ۶، جامع الکبیر)۔ ابن حجر الہیثمی، الصواعق المحارقہ (ایضاً، ص ۶)۔ السخاوی، المقاصد الحسنہ (ایضاً، ص ۸) العراقی، تنزیہ الشریعہ (ایضاً، ص ۹) موضوعات پر۔ ابن الاثیر، جامع الاصول (ایضاً) النھایہ (ایضاً، ص ۱۸۷) اور شرح جامع الاصول (ایضاً، ص ۱۹) کرمانی، شرح البخاری (ایضاً، ص ۱۸)۔ الطبری، شرح مشکوۃ، (ایضاً، ص ۱۸)۔ قاضی عیاض، مشارق الانوار (ایضاً، ص ۱۸)۔ التورشی شرح المصابیح۔ (ص ۱۹)۔ علی القاری، مرقاۃ المفاتیح (ص ۲۰) ابن حجر، شرح نخبۃ (ص ۲۸)۔ ابن سعد، طبقات (ص ۳۰)۔ الحاکم، المستدرک (ص ۳۲) القسطلانی، ارشاد الساری فی شرح البخاری (ص ۳۳)۔ عزالدین، اسد الغابہ (ص ۴۵)۔ یافعی، مراۃ الجنان (ص ۶۸)۔ ابن حجر، فتح الباری (اشعۃ اللمعات، لکھنؤ، ۱۹۱۳ء، ج ۱، ص ۱۱) وغیرہ۔

(۱۴۴) طاہر پٹنی، مجمع بحار، نول کشور، لکھنؤ، ۱۳۱۴ء، ج ۳، ص ۵۵۱۔

(۱۴۵) توزک جہانگیری، لندن، ۱۹۰۹ء، ص ۱۶۔

(۱۴۶) عبدالحق، اخبار الاخیار، خودنوشت، سوانح، ص ۲۹۰ و مابعد۔ بدایونی، منتخب، ۱۱۳-۱۱۷، ہیگ، ص ۴۳-۱۶۷۔ عبدالحمید لاہوری، پادشاہ نامہ، ببلوانڈیکا، ۱۸۶۷ء، ج ۱، ص ۴۲-۳۴۱۔ آزاد، سبحۃ المرجان، ص ۵۱۔ اور مآثر الکرام، ص ۲۰۰-۲۰۱۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۱۲-۴۰۹۔ غلام سرور، خزینہ، ج ۱، ص ۱۶۴۔ صدیق حسن، اتحاف، ص ۳۰۳، ۳۰۴۔ سیّد احمد خاں، آثار الصنادید، کانپور، ۱۹۰۴ء، ص ۶۳۔ رحمان علی، تذکرہ علماء، ص ۱۰۹-۱۱۰۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، تذکرہ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی۔ قاسم ناگوری، شرح مقدمات

الدہلوی، مطبوعہ، کلکتہ۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۶۸ - ۲۶۷۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ۶، ص ۱۷۵۔ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج ۲۲، ۱۹۲۶ء، ص ۴۳ - ۴۴۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۱، ص ۳۹۔ ریو، فہرست، ج ۱، ص ۱۴الف۔ فہرست بانکی پور، ج ۱، ص ۴۹۰۔ اسٹوری، کتابِ مذکور، ج ۲، ص ۱۹۴۔

(۱۴۷) جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج ۲۲، ۱۹۱۶ء، ص ۴۳ - ۶۰۔

(۱۴۸) برائے مخطوطات، بانکی پور، ج ۱۴، نمبر ۱۱۸۶، ص ۴۶ - ۴۷۔ ریو، حوالۂ مذکور۔

(۱۴۹) فہرست انڈیا، آفس نمبر ۲۶۵۷، ریو، فہرست ج ۱۔

(۱۵۰) مخطوطات، بانکی پور، ج ۱۴، ۹۴ - ۱۱۹۳۔ آصفیہ، ج ۱، ص ۸۳۔ اتھے، فہرست، نمبر ۲۶۵۴۔ ریو، فہرست، ج ۱، ص ۱۴، ۱۵۔

(۱۵۱) اَشِعۃ، نول کشور، لکھنؤ، ج ۱، ص ۱، فہرست بانکی پور، ج ۱۴، ص ۵۲، ۵۳۔

(۱۵۲) فہرستِ مصنفین، حوالۂ مذکور۔

(۱۵۳) اَشِعۃ، حوالۂ مذکور، فہرست بانکی پور، ج ۵ (۲)، ص ۹۰۔

(۱۵۴) جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی، حوالۂ مذکور۔

(۱۵۵) عربی مقدمہ اُردو شرح کے ساتھ ۱۹۲۷ء کلکتہ میں شائع ہوا تھا، جسے قاسم ناگوری نے شرح مقدمۃ الدہلوی کے نام سے قلم بند کیا گیا تھا۔ یہ مقدمہ ایک اور ایڈیشن، ۱۳۵۷ھ میں مدرسۂ عالیہ کے ایک استاد محمد امین الاحسان نے عربی میں ضخیم حواشی کے ساتھ کلکتہ میں شائع کیا تھا اور اس کا نام الحواشی السعدی رکھا تھا۔ اَشِعۃ کا فارسی مقدمہ ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء میں جونپور میں طبع کیا گیا تھا۔

(۱۵۶) فہرست کتاب، ص ۶۱۔

(۱۵۷) فہرست بانکی پور، ج ۱۲، ص ۶۹ - ۷۰۔

(۱۵۸) برائے مخطوطات، بانکی پور، ج ۵ (۲)، نمبر ۴۰۴۔ رام پور، ۱، نمبر ۲۰ - ۳۱۸۔

(۱۵۹) جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی، نمبر ۲۱۔

(۱۶۰) ایضاً، نمبر ۲۲۔

(۱۶۱) اتھے، حوالۂ مذکور۔

(۱۶۲) جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی، نمبر ۷۔

(۱۶۳) معارف، حوالۂ مذکور، یادِ ایام، ص ۲۹۔

(۱۶۴) عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۲۹، ۳۰۔

(۱۶۵) آزاد، سبحۃ المرجان، ص ۵۳۔ اور مآثر الکرام، ص ۲۰۱۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۴۱۸۔ غلام سرور، خزینہ، ج ۱، ص ۹۸۹۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۲۴۶۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۶۸ - ۲۵۸۔ ایلیٹ، ہسٹری، ج ۶، ص

۱۸۲۔ ریو، فہرست، فارسی مخطوطات، ج ا، ص ۲۲۴۔ ایتھے، فہرست، انڈیا آفس، نمبر ۲۹۰۔ فہرست بانکی پور، ج ۱۴، ص ۵۴۔

(۱۶۶) معارف، حوالۂ مذکور، برائے مخطوطات، ملاحظہ ہو، ایتھے، فہرست، نمبر ۲۶۵۹، بانکی پور، فہرست، نمبر ۹۹-۱۱۹۵۔

(۱۶۷) عبدالمقتدر کا یہ بیان (فہرست بانکی پور، ج ۱۴، ص ۶۲ اور معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۶۹-۲۶۸) کہ فخر الدین، شیخ نور الحق کے فرزند تھے، درست نہیں ہے۔ شیخ الاسلام فخر الدین نے اپنی تصنیف شرح بخاری (مخطوطہ، بانکی پور، نمبر ۱۲۰۸، و ۲۷ الف) کے دیباچے میں جو شجرہ درج کیا، اس میں صاف لکھا ہے: فخر الدین، بن محب اللہ، بن نور اللہ بن نور الحق، بن عبدالحق، نیز ملاحظہ ہو، نزہتہ، تذکرۂ شیخ الاسلام فخر الدین دہلوی۔ اس کے علاوہ نور الحق کو منبع العلم قرار دینا بھی غلط ہے۔

(۱۶۸) بانکی پور، ج ۱۴، ص ۶۱، ۶۲۔

(۱۶۹) بلخی ایک ہندوستانی عالم تھے (لوتھ، فہرست، مذکور، ص ۱۹۰۔ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ج ۴، ص ۲۸۲۔ ان کی تصنیف عین العلم کے لیے ملاحظہ ہو، لوتھ، فہرست، نمبر ۲-۶۸۰۔ بانکی پور، فہرست نمبر ۱۳۵۳۔ (عربی دستی فہرست، ج ۱)۔

(۱۷۰) بانکی پور، مخطوطہ، نمبر ۱۳۹۰۔

(۱۷۱) مشمولات کے لیے ملاحظہ ہو، بانکی پور، ج ۱۶، ص ۶۸، ۶۹۔

(۱۷۲) فقیر محمد، حدائق، ص ۴۶۸۔

(۱۷۳) شیخ الاسلام، شرح بخاری، مخطوطہ، بانکی پور، و ۲۶ ب، ۲۷ الف۔ عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر، ج ۶، حوالۂ مذکور، فقیر محمد، حدائق، حوالۂ مذکور۔

(۱۷۴) بانکی پور، ج ۱۴، ص ۶۲: ۶۳۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۶۹۔

(۱۷۵) بانکی پور، ج ۱۴، ص ۶۲۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۶۹۔ بانکی پور، نمبر ۹-۱۲۰۸۔

(۱۷۶) فقیر محمد، حدائق، ص ۴۶۸۔

(۱۷۷) ایضاً، رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۴۷۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴۔ ص ۲۶۹۔ احمد علی شوق۔ تذکرۂ کاملانِ رام پور، ص ۱۵۹۔

(۱۷۸) کتب خانہ بانکی پور میں جو مخطوطہ ہے وہ نامکمل ہے اور کتاب الحج کے ایک حصہ پر ختم ہو گیا ہے۔ (فہرست، ج ۵ (ا)، ص ۸)۔ رامپور کے سرکاری کتب خانہ میں محلا کا مکمل مخطوطہ موجود ہے۔ (احمد علی شوق، تذکرۂ کاملانِ رام پور، ص ۱۵۹)۔ ٹونک کے کتب خانہ میں مکمل نسخہ ہے اور سہارن پور کے مدرسۂ مظاہر علوم کے کتب خانہ میں صرف آخری نصف حصہ ہے۔ محمد زکریا، مقدمہ اوجز المسالک، ص ۳۳۔

(۱۷۹) فہرست بانکی پور، ج ۵، ح ا، ص ۸، ۹۔

(۱۸۰) معارف، دسمبر ۱۹۴۲ء، ص ۲۲-۴۲۱۔

(۱۸۱) بانکی پور، ج ۵ (ا)، ص ۹۔

(۱۸۲) فقیر محمد، حدائق، حوالۂ مذکور۔

(۱۸۳) عبدالحی حسنی، نزہتہ الخواطر، ج ۶، تذکرۂ سیف اللہ بخاری۔

(۱۸۴) حالات کے لیے ملاحظہ ہو، اعظمی، تاریخ کشمیر، ص ۱۳۸۔

(۱۸۵) غلام سرور، خزینہ، ج ا، ص ۳۴۳۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۴۲۱۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۲۲۹، معارف، ص ۲۶۹۔

(۱۸۶) اعظمی، تاریخ کشمیر، ص ۱۰۳-۱۰۴۔

(۱۸۷) ایضاً، ص ۱۴۳۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۴۰۹-۴۰۸۔ داؤد مشکوتی، اسرار الابرار، مخطوطہ دار المصنفین، حوالۂ در معارف، ص ۲۶۹۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۵۴۔

(۱۸۸) اعظمی، تاریخ کشمیر، ص ۱۷۶۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۲۴-۴۲۳۔ غلام سرور، خزینہ، ج ا، رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۶۰۔ معارف، ص ۲۷۰۔

(۱۸۹) فقیر محمد، حدائق، ص ۴۳۵۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۵۲۔ معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۳۳۔

(۱۹۰) جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ ج ۲۲، ۱۹۳۶ء، ص ۱۱۹، این، ا۔

(۱۹۱) امپیریل گزیٹر، ج ۸، ص ۲۳۵۔

(۱۹۲) آزاد، مآثر الکرام، ص ۹۴۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۷۴۔ مقبول احمد صمدانی، حیاتِ جلیل، ج ا، ص ۱۴۴، این۔ ۱۲۴۔ معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۲۷۰۔

(۱۹۳) عبدالحی حسنی، معارف العوارف: شروح الشمائل اور شروع حصن حصین۔

(۱۹۴) حیاتِ جلیل، ج ا، ص ۱۴۹، این۔ ۱۲۹۔

(۱۹۵) تفصیلِ حالات کے لیے ملاحظہ ہو، مقبول احمد صمدانی، حیاتِ جلیل، ج ا-۲، الٰہ آباد، ۱۹۲۹ء۔

(۱۹۶) انہوں نے احمد آباد میں وفات پائی، جہاں وہ مدرسۂ نور الدین میں استاذ تھے۔ صمدانی، حیاتِ جلیل۔ ایضاً، ج ا، ص ۱۴۳، این ۱۲۱۔

(۱۹۷) ایضاً، این ۱۲۳۔

(۱۹۸) ایضاً، ص ۱۴۵، ۱۶۰، ۱۶۱۔

(۱۹۹) یہ اورنگ زیب کے عہد میں (۱۰۶۹-۱۱۱۹ھ) اور ان کے جانشین کے زمانہ میں بھی (۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء تا ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء) بخشی اور وقائع نگار تھے۔ پہلے گجرات میں پھر بھکر میں۔ ایضاً، ص ۲۳۰ و مابعد۔

(۲۰۰) ایضاً، ص ۲۴۸۔

(۲۰۱) ایضاً، ص ۱۶۷-۱۶۹۔

(۲۰۲) ایضاً، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔

(۲۰۳) ایضاً، ص ۱۷۱-۱۷۲: ان کے حالات فقیر محمد، حدائق، ص ۴۳۷، آزاد، مآثر الکرام، ص ۷۷، ۲۵۷۔ آزاد، سروِ آزاد، ص ۲۵۳۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۰۸، ۱۰۹۔ معارف ج ۲۲، ش ۵، ص ۲۷۰۔ ریو، فارسی فہرست کتب، ج ۳، ص ۹۶۳۔ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، ص ۱۱۹، این ۵ میں بھی درج ہیں۔

(۲۰۴) آزاد، سبحۃ المرجان، خودنوشت سوانح، ص ۱۱۸-۱۲۳۔ مآثر الکرام، خودنوشت سوانح، ص ۱۶۱-۱۶۴۔ سروِ آزاد، خودنوشت سوانح، ۱۱۸-۱۲۳۔ اور خزانۂ عامرہ، خودنوشت سوانح، ص ۱۲۳-۱۲۶۔ فقیر محمد، حدائق، ۴۴۵، ۴۴۶۔ معارف، ص ۲۷۰-۲۷۱۔ صدیق حسین، اتحاف، ص ۳۰۳۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۵۴-۱۵۶۔ ریو، فارسی فہرست کتب، ج ۱، ص ۳۷۳ الف۔ بانکی پور، ج ۳، ص ۲۵۲، ۲۵۳۔ مسلم ریویو، کلکتہ، ۱۹۲۶ء، ش ۲، ص ۲۵-۳۶۔

(۲۰۵) بروکلمن، ضمیمہ ا، ص ۶۰۱۔

(۲۰۶) ص ۵۶، ۱۰۷۔ آزاد، سبحۃ المرجان، ص ۱۲۲۔

(۲۰۷) بروکلمن، حوالۂ مذکور، آصفیہ، نمبر ۸۵۳، ۸۵۷، ۸۵۹۔

(۲۰۸) جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، ص ۱۲۷۔

(۲۰۹) نجوم المشکوٰۃ کا ایک مخطوطہ کتب خانۂ دارالعلوم، لکھنؤ میں موجود ہے۔ عبدالحی حسنی، معارف العوارف: شروح المشکوٰۃ۔

(۲۱۰) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، تذکرۂ حسین ہروی۔

(۲۱۱) مقصود عالم کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو، ضمیمہ مراۃ احمدی، انگریزی ترجمہ، نواب علی و سیڈان، بڑودہ، ۱۹۲۴ء، ص ۴۳، ۴۴۔

(۲۱۲) ایضاً، ص ۴۴، رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۲۱۶۔

(۲۱۳) ایضاً۔

(۲۱۴) ضمیمہ مراۃ احمدی، ص ۴۴-۴۶۔ عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۶۱، تذکرۂ محمد رضوی، عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، تذکرۂ محمد بن جعفر گجراتی، رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۲۱۴-۲۱۵۔

(۲۱۵) عبدالحی حسنی، عوارف المعارف: شروح المشکوٰۃ۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۲۱۵۔

(۲۱۶) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، رزق اللہ، الافق المبین۔ مراۃ عالم۔

(۲۱۷) عبدالحی ندوی نے نزہۃ الخواطر، اور معارف العوارف میں ان تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

(۲۱۸) یہ سلطان محمود غزنوی کی ہمشیرہ کے فرزند تھے۔ بیگ، منتخب التواریخ کا ترجمہ، ج ۳، ص ۴۶، این ۶۔

(۲۱۹) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۶: تذکرۂ نعیم بن فیض۔

(۲۲۰) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۶: تذکرۂ محمد اکرام بن عبدالرحمٰن سندھی۔

(۲۲۱) آزاد، سروِ آزاد، ص ۲۱۰-۲۱۲۔

(۲۲۲) عبدالحی حسنی، معارف العوارف: شروح ثلاثیات البخاری۔

(۲۲۳) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۶۔

(۲۲۴) آزاد، سروِ آزاد، ص ۲۱۲-۲۱۸۔ صدیق حسن، اتحاف، ص ۲۰۶، ۲۰۷۔ معارف ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۳۹۔ نوشہروی، تراجم علمائے حدیثِ ہند، دہلی، ۱۹۳۸ء، ج ۱، ص ۳۳۴-۳۴۰۔ صدیق حسن، تقصار، ص ۱۱۵۔

(۲۲۵) آزاد، مآثر الاکرام، ص ۸۹-۲۸۷۔

(۲۲۶) معارف، ج ۲۳، ش ۲، ص ۹۱-۹۲۔

(۲۲۷) صدیق حسن، اتحاف، ص ۴۰۶۔

(۲۲۸) ایضاً، ص ۸۴، ۴۰۶۔

(۲۲۹) ایضاً۔

(۲۳۰) ایضاً۔

(۲۳۱) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، گنج ارشدی۔

(۲۳۲) عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۳۳۔

(۲۳۳) ایضاً، ص ۶۱-۶۲۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، فقیر محمد، حدائق، ص ۴۴-۴۴۳۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۴۸۱، ۲۴۷۔ معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۴۱۔ ضمیمہ مراۃ احمدی، ص ۵۶-۵۸۔

(۲۳۴) عبدالحی حسنی، معارف العوارف: شروح البخاری۔

(۲۳۵) برائے مخطوطاتِ تاریخ محمدی، ایتھے، ۹۰-۳۸۸۹۔ ریو، ج ۳، ۸۹۵ الف۔ اور برائے مخطوطہ عبرت نامہ، بانکی پور، ج ۷، نمبر ۶۲۳۔

(۲۳۶) ریو، حوالۂ مذکور، بانکی پور، حوالۂ مذکور، بوحار، ج ۲، ص ۲۴۵۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، تذکرۂ محمد بن رستم بدخشی۔ اسٹوری، کتابِ مذکور، ج ۲، ص ۲۴۱۔ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، تذکرۂ محمد بن رستم۔ بروکلمن، ضمیمہ ۱، ص ۶۰۰۔

(۲۳۷) برائے فہرست عنوانات ملاحظہ ہو، فہرست بوحار، ج ۲، ص ۵۰-۲۴۵۔

(۲۳۸) برائے فہرست عنوانات، ایضاً، ص ۸۸-۲۸۵۔

(۲۳۹) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، حوالۂ مذکور۔

(۲۴۰) بروکلمن، حوالۂ مذکور۔

(۲۴۱) صدیق حسن، اتحاف، ص ۱۷۳۔

(۲۴۲) فہرست بانکی پور، ج ۱۵، ص ۹۴، ۹۵۔

(۲۴۳) رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۴۷۔

(۲۴۴) فقیر محمد، حدائق، ۵۲-۴۵۱۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۹۴۔ عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ج ۶، تذکرۂ صدیق لاہوری۔

(۲۴۵) شاہ عبدالعزیز، اجالۂ نافعۃ، لاہور، ۱۳۰۲ھ، ص ۲۲-۳۰۔

(۲۴۶) شاہ ولی اللہ، مصفا شرح موطا، مطبع فاروقی، دہلی، ۱۲۹۳ھ، ج ۱، ص ۲۲۔

(۲۴۷) بانکی پور، ج ۵ (ا)، ص ۲۲۔

(۲۴۸) ایضاً۔

(۲۴۹) ایضاً۔

(۲۵۰) نوشہروی، تراجم علمائے حدیثِ ہند، ج ۱، ص ۱۵۔

(۲۵۱) ولی اللہ، الجزء اللطیف، خودنوشت سوانح، مع انگریزی ترجمہ از ہدایت حسین، جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۹۱۲ء، ص ۷۵-۱۶۱۔ محسن، یانع الجنی، ص ۳۸-۱۱۳۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۴۸-۴۴۷۔ صدیق حسن، اتحاف، ص ۴۴۸۔ صدیق حسن، ابجد، ص ۹۱۲ و مابعد۔ رحمٰن علی، تذکرۂ علماء، ص ۵۲-۲۵۰۔ عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، ج ۶: تذکرۂ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ نوشہروی، کتابِ مذکور، ص ۴۴-۴۸۔ معارف، ج ۲۲، ش ۵، ۴۳-۳۴۱۔ الفرقان، ولی اللہ نمبر، بریلی، ۱۹۴۱ء، دوسرا ایڈیشن، ص ۷۹-۱۷۷، ۳۸-۲۳۶، ۱۰-۴۰۱۔ اسماعیل گزروی ولی اللہ، مطبوعہ دہلی، مختار احمد، خاندانِ عزیزی، مطبوعہ کانپور، ص ۱-۲۶۔ عبیداللہ سندھی، حزب، لاہور، ۱۹۴۲ء، ص ۱۳، ۴۳۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۱، ص ۱۰۱۲، استوری، کتابِ مذکور، ج ۱، ص ۲۰-۲۲۔ بانکی پور، ۵ (ا)، ۵-۶۔

(۲۵۲) ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، قاہرہ، ۱۳۲۲ھ، ج ۱، ص ۳۔

(۲۵۳) ایضاً، ص ۱۰۶، ۱۰۷۔

(۲۵۴) صدیق حسن، اتحاف، ص ۷۱۔

(۲۵۵) مختار احمد، کتابِ مذکور، ص ۱۸۔

(۲۵۶) ہادی علی، تسخیر، ص ۳۷۔

(۲۵۷) جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی، ص ۱۶۹۔ بروکلمن، ضمیمہ ا، ص ۶۱۵۔

(۲۵۸) ایضاً، معارف، دسمبر ۱۹۴۲ء، ص ۲۶-۴۲۵۔

(۲۵۹) یہ رسالہ اور النوادر غالباً ایک ہی ہیں، جس کا ذکر ڈاکٹر زبیداحمد نے معارف، ص ۲۷-۲۲۶ میں کیا ہے۔

(۲۶۰) بانکی پور، ۵ (۱)، نمبر ۱۳۴ اور ص ۲۳، ۲۴۔

(۲۶۱) جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی، حوالۂ مذکور۔

(۲۶۲) ایضاً۔

(۲۶۳) نشریاتِ علمیہ یعنی فہرست دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن، ۱۳۶۳ھ، ص ۳۷۔ فرقان، ص ۴۰۸، نمبر ۱۳۔

(۲۶۴) ولی اللہ، مصفا، ج ۱، ص ۷۔

(۲۶۵) ڈاکٹر زبیداحمد کا بیان (معارف، ص ۴۲۰) کہ مسوا، مصفا سے زیادہ جامع ہے، محلِ نظر ہے۔

(۲۶۶) فرقان، ص ۴۱۰۔ نمبر ۳۰۔

(۲۶۷) حالات کے لیے ملاحظہ ہو، عثمانی، سیر الاقطاب، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۳ء، ص ۱۹۷ و مابعد۔

(۲۶۸) صدیق حسن، اتحاف، ص ۴۱-۲۴۰۔ اور تقصار، ص ۱۱۳۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۶۸-۴۶۵۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۳۸، معارف، ج ۲۳، ش ۶، ص ۴۴۴ و مابعد۔ نوشہروی، کتابِ مذکور، ص ۲۰۶ و مابعد۔

(۲۶۹) بانکی پور، ج ۱۵، ص ۱۰۲-۱۰۳۔

(۲۷۰) معارف، حوالۂ مذکور۔

(۲۷۱) رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۲۲۔ صدیق حسن، ابجد، ۹۱۴۔ معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۴۶۔ اور ج ۵۳، ش ۵، ص ۴۶-۳۴۵۔ نوشہروی، کتابِ مذکور، ص ۴۹ و مابعد۔

(۲۷۲) کتابِ مذکور، ایضاً، ص ۶۵، ۶۶۔

(۲۷۳) ایضاً، ص ۶۹، ۱۱۲۔

(۲۷۴) ایضاً، ص ۱۱۳-۱۱۵۔

(۲۷۵) فقیر محمد، حدائق، ص ۴۸۱۔

(۲۷۶) رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۴۷۔

(۲۷۷) ایضاً، ص ۵۰، ۵۱۔

(۲۷۸) ایضاً، ص ۶۶، ۶۸۔ احمد علی شوق، تذکرۂ کاملانِ رام پور، ص ۴۷-۱۴۳۔

(۲۷۹) رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۶۳-۱۶۲۔

(۲۸۰) ایضاً، ص ۵۶-۵۷۔

(۲۸۱) ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں مکمل ہوئی، اور ۱۹۱۷ء، ۱۹۲۵ء میں کانپور سے شائع کی گئی۔

(۲۸۲) رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۹۲۔

(۲۸۳) معارف، ج ۲۳، ش ۵، ص ۶۴-۳۶۲۔

(۲۸۴) نوشہروی، کتابِ مذکور، ص ۲۶۹ و مابعد۔

(۲۸۵) رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۷۲۔

(۲۸۶) ایضاً، ص ۷۷، ۸۰۔

(۲۸۷) ۱۸۹۸ء میں اور اس کے بعد بھی دہلی میں طبع ہوئی۔

(۲۸۸) ایضاً، ص ۱۷۸۔ معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۴۷ اور ج ۵۳، ش ۶، ص ۴۷-۳۴۶۔

(۲۸۹) نوشہروی، کتابِ مذکور، ص ۲۰-۱۹۹۔ عبید اللہ سندھی، حزب، ص ۱۲۱ و مابعد۔ محمد زکریا، اوجز المسالک، ج ۱، مقدمہ، ص ۴۵-۴۶۔

(۲۹۰) دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارن پور، دونوں ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں قائم کیے گئے تھے۔

(۲۹۱) محمد زکریا، اوجز المسالک، ج ۱، ص ۴۳۔ معارف، ج ۵۳، ش ۵، ص ۳۵۲۔

(۲۹۲) معرف، حوالۂ مذکور۔

(۲۹۳) فقیر محمد، حدائق، ۴۹۳۔ محمد زکریا، اوجز، ج ۱، ص ۴۵۔

(۲۹۴) فقیر محمد، حدائق، ۹۳-۴۹۱۔ عبید اللہ، حزب، ص ۱۸۶۔ معارف، حوالۂ مذکور۔

(۲۹۵) نوشہروی نے کتابِ مذکور، ص ۱۳۲ میں سند کی نقل شامل کی ہے۔

(۲۹۶) ۱۳۲۳ھ میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

(۲۹۷) ۵۳-۱۳۴۶ھ میں دہلی میں چار جلدوں میں شائع کی گئی۔

(۲۹۸) نوشہروی، کتابِ مذکور، ص ۱۳۲ و مابعد۔

(۲۹۹) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۴، ص ۴۲۱۔

(۳۰۰) احمد علی شوق، تذکرۂ کاملانِ رام پور، ص ۹۱-۳۸۹۔

حصّہ دوم

ہندی محدثین — بیرونِ ہند

باب اوّل

قدیم ہندی راویانِ حدیث

دوسری صدی ہجری کے بعد سے ہمیں اسلامی علوم کے مراکز، بالخصوص خلافت کے مشرقی صوبوں میں، ایسے مشہور وممتاز محدثین وعلماء کے نام نظر آتے ہیں، جو ہندی نژاد تھے۔ اور اس کا ذکر اسماء الرجال میں بھی موجود ہے۔ یہ لوگ یا ان کے آباو اجداد اسلامی ممالک میں کب اور کس طرح سکونت پذیر ہوئے اور اسلام قبول کیا، ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ہمیں گہری دلچسپی ہے۔ لیکن سوانحی کتب میں ان کے متعلق کچھ اشارے تو موجود ہیں، مگر تفصیلات درج نہیں۔ تاہم خوش قسمتی سے سندھ کے بعض ایسے قبائل کے متعلق شواہد موجود ہیں، جو اسلام قبول کرنے کے بعد عراق میں آباد ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان ہندی اسیرانِ جنگ کے متفرق حالات کا بھی علم ہے جن کو ہند پر عربوں کے ابتدائی حملوں کے زمانہ میں قید کر کے اسلامی ملکوں میں لے جایا گیا تھا۔ اسماء الرجال سے جو ناکافی معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان میں تاریخی شواہد سے کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔

فصلِ اوّل

(الف) سندھی قبائل کا قبولِ اسلام:

ظہورِ اسلام سے قبل زمانے میں فارس کی فوج میں ہندی سپاہیوں کا ایک امدادی دستہ شامل تھا، جس میں خوفناک جاٹ (الزط)، سیابجہ اور اساوریہ بھرتی کیے جاتے تھے۔(۱) حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں جب عظیم الشان ساسانی شہنشاہیت کو عربوں کے زبردست حملوں نے تہس نہس کر ڈالا تو یہ ہندی سپاہی حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فاتحوں سے جا ملے اور اسلام قبول کر لیا۔ ان لوگوں نے بصرہ کے گرد ونواح میں سکونت اختیار کر لی اور بنو تمیم کے حلیف بن گئے۔(۲) بصرہ کی نہر الاساویہ سے، جو اساویہ کے نام سے موسوم ہے، اس بیان کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔(۳) محمد بن

قاسم کے سندھ فتح کر لینے کے بعد سندھ کے کچھ جاٹ اور اس صوبہ کے کئی دوسرے قبائل کے لوگ مع اپنے خاندانوں، اہل و عیال اور بھینسوں کے حجاج بن یوسف کے پاس بھیج دیئے گئے تھے جس نے ان کو کسکر زیریں علاقے، ضلع واسط (۴)، میں آباد کر دیا تھا۔ وہ البطیحہ میں سکونت پذیر ہوئے اور خوب پھلے پھولے۔ وہاں کی نہر زطّ اسی قبیلہ (زط یعنی جاٹ) کے نام سے موسوم ہوئی۔(۵) معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ کا ایک حصہ خوزستان چلا گیا اور ہومہ یا ضلع زطّ میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں دریائے طب کے کنارے ایک گاؤں آباد تھا جو الزطّ کہلاتا تھا۔(۶)

(ب) اسیرانِ جنگ:

ہند پر فوجی حملوں کے آغاز ہی سے عرب اپنے ساتھ کثیر تعداد میں جنگی قیدی لے جانے لگے تھے جو آگے چل کر مسلمان ہو جاتے اور مسلم ممالک میں سکونت اختیار کر لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں عربوں اور ہندیوں کے درمیان پہلی لڑائی دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ۲۳ھ/۶۴۳ء میں ہوئی تھی۔(۷) اس لڑائی میں ہندیوں کو شکست ہوئی اور کثیر مالِ غنیمت عربوں کے ہاتھ آیا، جس میں بہت سے ہاتھی اور بڑی تعداد میں جنگی قیدی بھی شامل تھے جن کو عرب اپنے ساتھ لے گئے۔(۸) مہلب بن ابی صفرا نے ۴۴ھ/۶۶۴ء ہندی علاقوں پر حملہ کیا(۹) اور اپنے ساتھ بارہ ہزار جنگی قیدی لے گیا، جن میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔(۱۰) ۵۷ھ/۶۷۶ء میں المنذر بن جارود العبدی نے قصدار (موجودہ بلوچستان کا شمال مشرقی حصہ) فتح کر لیا اور بہت سے قیدی اپنے ساتھ لے گیا۔(۱۱) ۹۳ھ/۷۱۱ء میں فتح سندھ سے قبل ۳۵ سال کے دوران میں عرب ہند کے سرحدی علاقوں پر وقتاً فوقتاً حملے کرتے رہے، اور ان کے نتیجے میں بہت سے قیدی وہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ۱۶۰ھ/۷۷۶ء میں المہدی (۱۵۸ تا ۱۶۹ھ/۷۷۵ تا ۷۸۵ء) نے ہند کے خلاف ایک بحری بیڑہ روانہ کیا تھا، جس نے بربد پر، جو اب بھار بھوٹ کہلاتا ہے اور گجرات کے ساحل پر واقع ہے، حملہ کیا اور ہندیوں کو شکست دی۔ اس لڑائی کے بعد عرب جو قیدی اپنے ساتھ لے گئے اور محمد بن سلیمان والیٔ بصرہ کے سامنے پیش کیا، ان میں بربد کی راجکماری بھی شامل تھی۔(۱۲) اگلے خلیفہ الہادی (۱۶۹ تا ۱۷۰ھ/۷۸۵ تا ۷۸۶ء) کے وقت تک ہندی غلام جو مختلف لڑائیوں میں

قید کیے گئے تھے، تمام سلطنت میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا اظہار خلیفہ کے ایک فرمان سے ہوتا ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک سنگین جرم کی پاداش میں اپنی سلطنت کے کسی حصے میں پائے جانے والے غلاموں کو سزا دینے کے لیے جاری کیا تھا اور اس فرمان کی وجہ سے ہندی غلاموں کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ (۱۳)

چوتھی صدی ہجری میں خراسان میں ہند سے لائے ہوئے غلاموں کی بڑی کثرت ہوگئی تھی۔ چنانچہ ۳۶۲ھ/۹۷۲ء سے قبل ہی بلخ کا ایک محلہ جہاں یہ غلام لائے جاتے تھے، ''ہندوان'' کہا جانے لگا تھا۔ (۱۴) پانچویں صدی ہجری کے اوائل کے نامور سیاح ابن بطوطہ نے غلاموں کی خریداری کے بیان میں لکھا ہے کہ ''ہندی گھر کا انتظام اچھی طرح کرتے ہیں اور عمدہ دست کاری میں مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن مرگی کا مرض ہو جانے کی وجہ سے یہ عموماً کم عمر میں مر جاتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر قندھار سے لائے جاتے ہیں۔ سندھ کی عورتیں اپنی نازک کمر اور لمبے بالوں کے لیے مشہور ہیں۔ (۱۵)

(ج) اسلامی فوج میں ہندی قبائلی:

جاٹ اور ان کے ہم وطن قبائل اسلامی فوج کا جنگ جُو عنصر تھے، اور ان کی شرکت سے مسلمانوں کی جنگی قوت میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ امیر معاویہ نے ان کو شام میں رومیوں کے خلاف صف آراء کیا تھا۔ اور عبدالملک نے جاٹوں کو انطاکیہ اور اس کے مضافات میں منتقل کر دیا تھا۔ (۱۶) حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں بصرہ کے جاٹ اور سیابجہ نے حضرت علیؓ کی حمایت کی۔ ان کی بہادری اور وفاداری کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ حضرت علیؓ کے عہد میں خانہ جنگی کے ہنگامہ خیز دور میں جاٹوں کو بصرہ کے بیت المال کی حفاظت کرنے کا فرض سونپا گیا تھا۔ (۱۷) اساورہ اور سیابجہ قبائل کے چار ہزار سپاہی بحری فوج میں شامل تھے۔

ہندی نو مسلم جن میں جاٹ، اساورہ اور سیابجہ شامل تھے، چھوٹی چھوٹی برادریوں کی شکل میں رہتے تھے۔ کچھ عرصہ تک تو اُنھوں نے اپنی نسلی علیحدگی کو برقرار رکھا۔ اور آخرکار دوسرے مسلمانوں میں مل گئے۔ ہندی غلام سارے عرب اور دوسرے ہمسایہ مسلم ممالک میں پھیل گئے تھے،

اور یہ فوراً ہی عام مسلمانوں میں ضم ہو گئے۔

فصلِ دوم

(الف) قبائلیوں کی علمی سرگرمیاں:

اسلام قبول کرنے اور عربوں کے ساتھ رہنے سہنے اور میل جول رکھنے کی وجہ سے ہندی قبائل کے نقطۂ نظر میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ بصرہ میں بیت المال کے محافظوں کا سردار ابو سالمہ جاٹ ایک مردِ صالح تھا۔(۱۸) اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان میں تغیرِ کلی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اب ان کا پیشہ صرف سپہ گری ہی نہ رہا تھا، بلکہ وہ ثقافتی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگے تھے اور ذہنی و روحانی طور پر ترقی کرنے لگے تھے۔ پہلے ہندی قبائل جب عراق میں آباد ہوئے تو اس کی شان و شوکت روز افزوں تھی۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں ہی بصرہ اور کوفہ آباد ہو گئے تھے، اور ترقی کر کے خلافت کے مشرقی علاقہ کے بڑے شہر بن گئے تھے۔(۱۹) بہت جلد یہ دونوں شہر حکومت کے مستقر اور اسلامی علوم اور تہذیب و ثقافت کے مرکز بن گئے تھے۔(۲۰) ان شہروں کے بسنے کے ساتھ ہی وہاں صحابۂ کرام سکونت اختیار کرنے لگے۔(۲۱) اور دینی تعلیم دینا شروع کر دیا جسے حاصل کرنے کے لیے قریب اور بعید علاقوں کے طلبا کثرت سے آنے لگے۔(۲۲) ہندی موالی نے بھی خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ علمی سرگرمیاں کس قدر ترقی کر رہی ہیں اور وہ خود بھی بڑی کامیابی سے ان میں حصہ لینے لگے۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ میدانِ جنگ کی طرح ثقافتی ترقی کے میدان میں بھی ہندی نو مسلم کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

ا۔ امامِ اعظم ابو حنیفہ (۸۰ تا ۱۵۰ھ/۶۹۹ تا ۷۶۷ء):

امام اعظم حنفی مسلک کے نامور بانی ہیں۔ ان کے متعلق یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ عراق کے جاٹوں کی نسل سے تھے۔(۲۳)

۲۔ ابو عیسیٰ اسواری (م ۱۲۵ھ):

ابو عیسیٰ کا تعلق اساویرہ کے ایک خاندان سے تھا اور وہ بصرہ کے بہت مشہور راوئ حدیث

تھے۔(۲۴) ابوعیسیٰ تابعی تھے۔ اُنہوں نے مشہور راوی ابوسعید خدری (م ۷۴ھ) عبیداللہ بن عمرؓ (م ۷۴ھ) اور رفائی بن مہران معروف بہ ابوالعالیہ (م ۹۳ھ) سے احادیث روایت کیں، اور ثابت البنانی (م ۱۲۷ھ) قتادہ (م ۱۱۷ھ) اور عاصم الاحوال (م ۱۴۳ھ) جیسے راویوں نے ابوعیسیٰ اسواری کی سند سے احادیث روایت کی ہیں۔(۲۵) ان سے مروی احادیث امام بخاری کی صحیح اور الادب المفرد میں درج کی گئی ہیں۔(۲۶)

۳۔عباس بن عبداللہ سندھی انطا کی (وفات/ تیسری صدی ہجری):

عباس کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ جاٹوں یا سیابجوں کی نسل سے تھے۔ اموی خلفا معاویہ اور عبدالملک کے عہد میں انطا کیہ منتقل ہو گئے تھے۔ عباس نے علمِ حدیث کی تعلیم ہثیم بن جمیل انطا کی (م ۲۱۳ھ)، محمد بن مسلمہ مکی (م ۲۲۱ھ)، سعید بن منصور خراسانی، محمد بن کثیر یمنی (م ۲۱۶ھ)، مسلم بن ابراہیم بصری (م ۲۲۲ھ) اور علی المدنی (م ۲۳۴ھ) سے حاصل کی۔ عباس ایک مستند راوی تھے۔ نسائی (م ۳۰۳ھ)، ابواعوان (م ۳۱۰ھ) اور دوسرے محدثین نے عباس کی سند سے احادیث روایت کی ہیں۔(۲۷) اور ان سے مروی احادیث سنن نسائی میں موجود ہیں۔(۲۸) عباس نے غالباً تیسری صدی ہجری کے وسط میں وفات پائی۔(۲۹)

۴۔ابوالسندھی واسطی (م ۱۶۵ھ):

سہل بن ذاکوان جو ابوالسندھی کے لقب سے معروف ہیں، غالباً جاٹوں کے ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو بطیحا میں اپنے ہم وطنوں سے جدا ہو کر واسط میں آباد ہو گیا تھا۔ اسی لیے ان کو واسطی کہا جانے لگا۔ ابوالسندھی ہثیم (م ۱۸۱ھ) اور یزید بن ہارون واسطی (م ۲۰۶ھ) کے استاد ہونے کے باعث مشہور ہوئے۔ لیکن بحیثیت محدث ان پر کذب بیانی کا الزام عائد کیا گیا اور ان سے مروی احادیث مسترد کر دی گئیں۔ تاہم ابنِ حبان نے اپنی کتاب الثقات میں سہل بن ذکوان کے نام سے ان کا ذکر کیا ہے۔(۳۰)

(ب) جنگی اسیروں کی علمی سرگرمیاں:

جنگی قیدیوں کو سوا ان کے جو فدیہ دے کر آزاد کرائے جاتے، غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اور ان

کو آزاد کر دینا بہت بڑا کارِثواب قرار دیا گیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ وہ (غلام) تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ نے ان کو تمہارا محکوم بنا دیا ہے۔ جس شخص کا بھائی اس کا محکوم ہو، اسے چاہیے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے اور وہی پہنائے جو خود پہنے۔ وہ اس سے اتنا سخت کام نہ لے جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ اور اگر اس سے یہ کام لینا ہی ہو تو خود بھی اس کی مدد کرے۔(۳۱) اس ارشادِ گرامی اور دوسرے احکامِ نبویؐ کی تعمیل میں مسلمانوں نے اپنے غلاموں سے عموماً بہت اچھا اور برادرانہ سلوک کیا۔ ان کو کشادہ دلی سے کھانا اور کپڑا دیتے تھے۔ اور ان سے ایسی جسمانی مشقت نہ لیتے تھے جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔ غلاموں سے مسلمانوں کے حسنِ سلوک کا روشن ترین پہلو یہ ہے کہ آقاؤں نے غلاموں کو اپنی صلاحیتوں کو روبہ کار لانے اور ترقی دینے کی سہولتیں فراہم کیں۔ چنانچہ آقا اپنے غلام کو تعلیم دلانے پر بہت توجہ کرتا تھا۔ انسانی ہمدردی کے علاوہ اقتصادی اعتبار سے بھی غلام کو تعلیم دلانا مفید ہوتا تھا۔ کیوں کہ غلاموں کی قیمت ان کے اوصاف و ہنر مندی کے لحاظ سے متعین ہوا کرتی تھی۔ زیادہ خوبیوں کے مالک غلام کی قیمت بھی زیادہ ہوتی تھی۔ اس لیے آزاد انسانوں کے ساتھ غلاموں کو بھی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی اور دست کاری و مختلف فنون سکھائے جاتے تھے۔ نہ صرف غلاموں بلکہ لونڈیوں کو بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ غلاموں کی تعلیم و تربیت کے محرکات خواہ دینی ہوں یا اقتصادی ان کا نتیجہ بہر حال غلاموں کی بہتری اور فلاح و ترقی کی شکل میں نکلتا تھا۔ ان مواقع کی بدولت غلاموں کو اپنی فطری صلاحیتوں کو روبہ عمل لانے کا موقع ملتا تھا اور اکثر وہ آزاد لوگوں پر بھی فوقیت حاصل کر لیتے تھے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ایک غلام کا عالم بن جانا مسلمانوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایسے نامور علماء میں نافع (۳۲) (م ۱۱۷ھ) اور عکرمہ (۳۳) (م ۱۰۴ھ) جو علی الترتیب ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ کے مولا کی حیثیت سے مشہور تھے، احادیثِ نبوی پر بہت ممتاز سند مانے جاتے تھے۔(۳۴) مشہور و معروف شیخ حسن بصری (م ۱۱۰ھ) بھی ایک مولا تھے۔(۳۵) شام کے ایک فقیہہ اور محدث مکحول (۳۶) (م ۱۱۸ھ) اور نامور محدث عبداللہ بن مبارک (۳۷) دونوں مولا تھے۔

ان حالات میں یہ بات بالکل متوقع اور قرینِ عقل ہے کہ ہندی اسیرانِ جنگ میں سے جو

لوگ غلام بنائے گئے تھے، ان کو بھی وہ تمام مراعات حاصل تھیں، جو دوسرے غلاموں کو دی گئی تھیں، اور چونکہ ان کا تعلق ہند جیسے قدیم تہذیب کے حامل ملک سے تھا، اس لیے یہ قدرتی طور پر اسلامی علوم کو بھی جلد اور بہتر طور پر حاصل کر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چنانچہ ہندی اسیرانِ جنگ کے اخلاف میں جو بڑے بڑے عالم و فاضل ممیز و ممتاز ہوئے، ان کی خدمات سے یہ ثابت ہوتا ہے، ان نو مسلم ہندیوں نے ثقافتی سرگرمیوں میں کس قدر اہم حصہ لیا ہے۔ ۲۴۰ھ/۸۵۴ء میں چند ہندی موالی نے بغداد میں ایک فلاحی ادارہ خان السندی قائم کیا تھا جو علمِ حدیث کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ یہاں مشہور محدثین درس دیا کرتے اور علمِ حدیث پر مذاکرات کیا کرتے تھے۔ (۳۸)

ممتاز محدثین

ا۔ الاوزاعی (۸۸ تا ۱۵۷ھ/۷۰۶ تا ۷۷۳ء):

ہندی اسیرانِ جنگ کے اخلاف میں عبدالرحمٰن بن عمرو بن محمد (۳۹) نے جو الاوزاعی کے نام سے مشہور ہیں، لافانی شہرت حاصل کر لی ہے۔ ان کی نسبت یعنی اوزاعی کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ علماء کے ایک گروہ کا جس میں ابنِ سعد (م ۲۳۰ھ/۸۴۴ء) بھی شامل ہیں، یہ خیال ہے کہ اس کا تعلق ہمدان یا حمیار کے ایک ذیلی قبیلے اوزاع (۴۰) سے تھا یا اوزع سے جنہیں قبائل شتی کہا گیا ہے۔ (۴۱) دوسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ اوزاع دمشق کے محلے باب الفرادیس سے متصل ایک قریہ کا نام تھا اور وہاں کا باشندہ ہونے کی بنا پر ان کو اوزاعی کہا جاتا تھا۔ (۴۲) یہ خیال زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اوزاعی بعلبک میں پیدا ہوئے، اور وہیں پرورش پائی، چنانچہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ عبدالرحمٰن کو اوزاع نام کے ایک قریہ سے تعلق کی بنا پر اوزاعی کہا جاتا ہے نہ کہ اس نام سے کسی قبیلہ سے متعلق ہونے کی وجہ سے۔ اور اسی طرح ان کے ہمدانی یا حمیاری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اختلافی مسئلہ ایک محدث ابوزرعہ دمشقی (م ۲۸۱ھ) نے واضح طور پر حل کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

كان اسم الاوزاعی عبدالعزيز نسمى نفسه عبدالرحمن و كان اصله
من سباء السند و كان ينزل الاوزاع فغلب ذلك عليه۔ (۴۳)

یعنی اوزاعی کا تعلق ہندی اسیرانِ جنگ کے ایک خاندان سے تھا۔ وہ ترکِ وطن کر کے اوزاع میں سکونت پذیر ہوئے اور اوزاعی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ابوزرعہ کا یہ بیان اس اعتبار سے بہت وزن دار ہے کہ وہ بھی دمشق کا باشندہ تھے اور ایک صدی قبل اوزاعی بھی اس شہر میں رہتے تھے، اس لیے ابوزرعہ ان کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کے قابل تھے۔ غالباً اسی بنا پر محدث اور مؤرخ ابوذہبی نے بھی ابوزرعہ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔(۴۴)

اوزاعی کے ہندی نژاد ہونے کا ایک ثبوت ان کے دادا کے نام سے بھی ملتا ہے، ان کا نام یحمد تھا۔ جو برہمدا یا برہمند کا مماثل معلوم ہوتا ہے۔ عربوں نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہند پر جب حملہ کیا تھا تو غالباً اس وقت یحمد کو جنگی قیدی بنا لیا گیا تھا۔

اوزاعی ۸۸ھ/۷۰۶ء میں بعلبک میں پیدا ہوئے تھے۔ اوزاعی بہت غریب اور یتیم تھے اور ان کی والدہ نے پرورش کی تھی۔ ان کی ذہنی نشوونما بہت قبل از وقت ہو گئی، اور صرف دس سال کی عمر میں اُنہوں نے علومِ قرآن و حدیث اور خطابت میں کمال حاصل کر لیا۔ اور جب ان کی عمر صرف تیرہ سال تھی تو ان سے فتویٰ حاصل کیے جانے لگے۔ اوزاعی بعلبک سے دمشق آ گئے اور شہر کے نواحی علاقہ اوزاع میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں اُنہوں نے اپنی زندگی کا بہترین زمانہ گزارا۔ اور پھر کبر سنی میں بیروت منتقل ہو گئے۔ اوزاعی نے ۲۸ صفر ۱۵۷ھ (۷۷۳ء) کو بیروت میں وفات پائی۔ وہ اس وقت سرحدی محافظین میں شامل تھے، لیکن اپنی روزی اپنے قلم کے ذریعہ سے حاصل کرتے رہے۔(۴۵)

اوزاعی نے علم کی طلب میں طویل سفر کیے۔ وہ نامور عالم و محدث حضرت شیخ حسن بصری (م ۱۱۰ھ) سے اکتسابِ علم کے لیے بصرہ گئے۔ لیکن ان کے بصرہ پہنچنے سے چالیس روز قبل ہی شیخ حسن کا انتقال ہو گیا تھا۔ بصرہ میں اوزاعی محمد بن سیرین (م ۱۱۰ھ) سے ملے۔ مگر وہ بھی بسترِ مرگ پر تھے۔(۴۶)

اوزاعی ایک ممتاز محدث اور باکمال فقیہہ تھے۔ اور ہم عصر علماء ان کے بہت مداح تھے۔ علمِ حدیث میں وہ محمد بن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ)، نافع (م ۱۱۷ھ) اور دوسرے ممتاز تابعین کے

شاگرد تھے۔(۴۷) شام میں احادیث کو جمع اور مرتب کرنے والے اوّلین محقق تھے۔(۴۸) اس واقعہ سے کہ ان کے کئی شیوخ(۴۹) نیز مالک (م ۱۷۹ھ)، سفیان ثوری، شعبہ اور عبداللہ بن مبارک جیسے ممتاز محدثین نے ان سے حدیث کا درس لیا، یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس علم میں ان کو کس قدر تبحر حاصل تھا۔

اوزاعی تمام عمر آسمانِ علمِ حدیث کا روشن ستارہ بنے رہے۔(۵۰) شام میں وہ سنت کے مسلّمہ عالم تھے، اور اُنہوں نے سات یا آٹھ ہزار فقہی مسائل کا برجستہ جواب دیا تھا۔(۵۱) علمِ فقہ پر اُنہوں نے دو کتابیں بھی لکھی تھیں، کتاب السنۃ فی الفقہ اور کتاب المسائل فی الفقہ۔(۵۲) دینی اور فقہی مسائل پر زبردست عبور، اور زہد و تقویٰ(۵۳) کی وجہ سے اوزاعی کو امام کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا اور ان کے پیرو ان کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی شام اور اسپین میں موجود تھے۔(۵۴) امام اوزاعی کے بارے میں امام شافعی کا قول ہے کہ اُن کے طریقہ کی نمایاں خصوصیت علمِ حدیث اور حیرت انگیز فقہی ذہانت و فراست کا خوش گوار امتزاج ہے۔(۵۵) چوتھی صدی ہجری کے وسط تک سلسلۂ اوزاعیہ دمشق میں ایک زندہ طریق تھا،(۵۶) اور اس مسلک کے مطابق درس دینے اور فتوے شائع کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن پانچویں صدی ہجری کے بعد یہ سلسلہ باقی نہ رہ سکا۔

اوزاعی بڑی جرأت کے ساتھ اپنے عقائد کا اظہار کرتے تھے۔ اُنہوں نے پہلے عباسی خلیفہ سفاح (۱۳۲ تا ۱۳۶ھ) کی علانیہ مذمت کی کہ وہ بنو امیہ کا خون اپنے نفس کی تسکین کے لیے بہاتا ہے۔ اور اس پر خلیفہ بہت غضبناک ہوا۔ مگر آخر کار وہ اوزاعی کی حق گوئی سے متاثر اور خوش ہوا۔(۵۷)

خلیفہ منصور (۱۳۶ تا ۱۵۸ھ/ ۷۵۳ تا ۷۷۴ء) اوزاعی کی بہت عزت کرتا تھا اور ان کا درس بہت توجہ اور احترام سے سنتا تھا۔(۵۸)

۲۔ نجیح عبدالرحمٰن سندھی (م ۱۷۰ھ/ ۷۸۶ء):

نجیح عبدالرحمٰن سندھی (۵۹) ابو معشر کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کا اصلی وطن سندھ تھا۔(۶۰) اُنہیں لڑکپن میں اغوا کر کے مدینہ منورہ میں بانو مخزوم نامی ایک عورت کے ہاتھ فروخت کر

دیا گیا تھا۔ اس غلامی کے زمانے میں ابو معشر نے مدینہ کے ممتاز تابعین مثلاً نافع (م ۱۱۷ھ)، محمد بن کعب القرظی (م ۱۰۸ھ)، محمد بن المنکدر (م ۱۳۰ھ)، سعید المقبری (م ۱۲۵ھ) اور ہشام بن عروہ (م ۱۴۶ھ) سے اکتسابِ فیض حاصل کیا اور علمِ حدیث اور مغازی، بالخصوص مغازی میں بڑی مہارت حاصل کر لی، اور اس پر سند شمار کیے جانے لگے۔ (۶۱)

معشر نے جلد ہی اپنی قیمت ادا کر کے آزادی حاصل کر لی، اور مدینہ منورہ میں اپنا ایک علمی حلقہ قائم کر لیا۔ جہاں وہ حدیث، مغازی اور فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے عقیدت مند شاگردوں میں جنہوں نے ان سے احادیث روایت کی ہیں، خود ان کے لڑکے محمد (م ۲۳۲ھ)، سفیان ثوری، لیث بن سعد، ہثیم، وکیع اور واقدی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ (۶۲)

دوسری صدی ہجری کے وسط تک ابو معشر بحیثیت عالم کے بہت مشہور ہو گئے تھے۔ چنانچہ (۱۶۰ھ/۷۷۶ء) میں خلیفہ مہدی (۱۵۸ تا ۱۶۹ھ/ ۷۷۴ تا ۷۸۵ء) جب مکہ معظّمہ گئے تو ابو معشر کو ایک ہزار دینار پیش کر کے ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا اور ان کو دعوت دی کہ وہ بغداد میں سکونت اختیار کر لیں، اور شہزادوں کو تعلیم دیں۔ چنانچہ رمضان ۱۷۰ھ/۷۸۶ء میں جب اُنہوں نے وفات پائی تو ان کی نمازِ جنازہ خلیفہ ہارون الرشید نے خود پڑھائی تھی۔ (۶۵) ابو معشر فربہ اندام اور سانولے رنگ کے تھے۔ ان کی زبان میں کچھ لکنت تھی اور بعض الفاظ کا صحیح تلفظ ادا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ کعب کو قعب کہتے تھے۔

ابو معشر بحیثیت راویِ حدیث:

یحیٰی بن مُعین . . تمد بن حنبل، بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی وغیرہ نے ایک راویِ حدیث کی حیثیت سے ابو معشر کو بڑی تنقیدی نظر سے پرکھا ہے۔ اور اکثر کی رائے یہ ہے کہ مغازی ان کا پسندیدہ مضمون تھا اور علمِ حدیث میں وہ زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ (۶۶) تاہم چند محدثین جن میں احمد بن حنبل اور ابوزرعہ (م ۲۸۱ھ) شامل ہیں، ان کو کافی معتبر خیال کرتے ہیں۔ ان کے شاگرد ہثیم کا بیان ہے کہ "میں نے ان کا جیسا یا ان سے زیادہ ذہین کوئی شخص نہیں دیکھا،" ابو معشر (۶۸) کے بارے میں تمام آراء کا خلاصہ ترمذی نے ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے: تکلم اهل العلم من قبل

حفظہ۔(۶۹) ان کے حافظہ پر اہلِ علم کو اعتبار نہ تھا۔ کیونکہ کبرسنی میں ان کا ذہن پراگندہ ہو گیا تھا، اور ان کا حافظہ درست نہیں رہا تھا۔(۷۰) اس کے علاوہ انہیں بڑی کثیر تعداد میں احادیث سے بحث کرنا تھا۔ اور عجب نہیں کہ وہ اس پر موثر طور سے قابو رکھنے میں ناکام ہو گئے ہوں۔ اگرچہ ابومعشر کو ضعیف راوی قرار دیا گیا تھا(۷۱) تاہم ان کے شاگردوں نے ان سے مروی احادیث سنیں اور انہیں قلم بند کیا۔(۷۲) اور نسائی نے تو ان کو حجت تسلیم کر لیا ہے۔(۷۳)

ابومعشر کتاب المغازی کے مصنف تھے، جن کا ذکر ابنِ ندیم نے کیا ہے۔(۷۴) اب اس کتاب کے صرف وہ متفرق حصے باقی رہ گئے ہیں، جنہیں واقدی اور ابنِ سعد نے اپنی تصانیف میں محفوظ کر دیا۔ طبری نے توریت و انجیل سے متعلق تاریخ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور تاریخی وقائع کے بارے میں معلومات میں ابومعشر سے استفادہ کیا ہے۔(۷۵)

ابومعشر کی سند سے روایت کی ہوئی احادیث چاروں سنن میں موجود ہیں۔(۷۶)

ابومعشر ہندی تھے اور غلام بھی رہ چکے تھے۔ اور انہوں نے زندگی میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ وہ اسلام کے قدیم ترین علماء میں سے تھے۔ عربی فنِ تاریخ اور زبانی روایتِ حدیث کی ترقی میں ان کا نمایاں حصہ تھا۔ انہوں نے خود بلند رتبہ حاصل کر کے اپنے خاندان کا مرتبہ بلند کر دیا، اور آئندہ ایک صدی تک ان کے لڑکے اور پوتے علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔ چنانچہ ابومعشر کا چھوڑا ہوا ورثہ کسی قدر تفصیلی جائزے کا مستحق ہے۔

۳۔ محمد بن ابومعشر سندھی (۱۴۸ تا ۲۴۷ھ/ ۷۶۵ تا ۸۶۱ء):

ابومعشر کے فرزند محمد ۱۴۸ھ/ ۷۶۵ء میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور لڑکپن میں مشہور عالم ابن ابی زیب (م ۱۵۰ھ) سے تعلیم حاصل کی تھی۔ محمد مدینہ منورہ میں زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکے۔ کیوں کہ نوجوانی ہی میں ان کو اپنے والد کے ساتھ ۱۶۱ھ/ ۷۷۷ء میں بغداد جانا پڑا۔ چنانچہ وہ مدینہ کے دوسرے علماء، خصوصاً مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) سے علم حاصل نہ کر سکے۔

خلیفہ منصور (۱۳۶ تا ۱۵۸ھ/ ۷۵۳ تا ۷۷۴ء) نے عباسیوں کے دارالخلافہ بغداد کی بنیاد ۱۴۸ھ/ ۷۶۵ء میں ڈالی تھی اور بہت جلد یہ شہر عظمت وقوت اور نشان وشوکت کا حامل بن گیا۔(۷۷)

لیکن علمی مرکز کی حیثیت سے خلیفہ ہارون الرشید (۱۷۰ تا ۱۹۳ھ/۷۸۶ تا ۸۰۸ء) کے زمانے تک یہ عالم طفلی میں رہا اور مدینہ، کوفہ اور بصرہ جیسے علمی مراکز سے اس کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ چنانچہ اس وقت تک مشہور علماء بھی بغداد منتقل نہیں ہوئے تھے۔ اور غالباً یہی سبب ہے کہ محمد بن ابومعشر کے اساتذہ میں خود ان کے والد کے سوا کسی اور مشہور عالم کا نام نہیں ملتا۔ بغداد میں اچھے اساتذہ کی جو کمی تھی، اسے ابومعشر نے خود ہی پورا کر دیا۔ اور اپنے لڑکے کی تعلیم پر پوری توجہ کی۔ چنانچہ محمد نے علمِ حدیث اور مغازی پر جو ابومعشر کے پسندیدہ علوم تھے، بہت جلد عبور حاصل کر لیا۔

محمد ایک عالم باپ کے بیٹے تھے اور اپنے باپ کے علم وفضل کے امین بن گئے۔ اور ان سے علم حاصل کرنے کے لیے طلباء اور مستقبل کے محدث اور مورخ بغداد آنے لگے۔ ابوعیسیٰ ترمذی (م ۲۷۹ھ)، ابوحاتم رازی (م ۲۷۷ھ)، ابن ابی الدنیا (م ۲۸۸ھ) اور طبری (م ۳۱۰ھ) ان کے اتنے مشہور شاگرد ہیں کہ تاریخِ اسلام اور علمِ حدیث کے طلباء کے لیے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ محمد کے دو بیٹوں حسین اور داؤد اور ابویعلیٰ موصلی، یعقوب بن موسیٰ بلخی (م ۲۴۰ھ) اور محمد بن لیث جوہری (م ۲۴۲ھ) نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی۔ طبری نے اپنی مشہور یادگار تاریخِ عالم کے لیے اپنے استاد کے توسط سے ہی قیمتی مواد ابومعشر کی تصانیف سے حاصل کیا تھا۔

محمد ایک مستند راوی حدیث ہیں۔ اور ابنِ حبان نے کتاب الثقاۃ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اُنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے والد سے جو احادیث سنیں، وہ کئی کتابوں میں جمع کرتے رہے، جن سے ان کے زمانے میں علماء نے فائدہ اُٹھایا۔ محمد بن معشر نے ۲۴۷ھ/۸۶۱ء میں ۹۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ محمد کے دو لڑکے تھے، حسین اور داؤد (۷۸) جنہوں نے عمدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ معشر سے مروی احادیث جامع الترمذی میں محفوظ ہیں۔ (۷۹)

۴۔ حسین بن محمد بن ابومعشر سندھی (م ۲۷۵ھ/۸۸۸):

حسین نے اپنے اساتذہ میں اپنے والد محمد بن ابومعشر، وکیع بن جراح (م ۱۹۷ھ) اور محمد بن ربیعہ (م ۱۹۹ھ) کا ذکر کیا ہے۔ وہ صاحب وکیع یعنی شاگردِ وکیع کے نام سے معروف تھے۔ حسین نے علمِ حدیث کا درس دینے میں اپنے خاندان کی شہرت کو ایک حد تک برقرار رکھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ

احادیث روایت کرنے کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ چنانچہ ان سے مروی احادیث قبول نہیں کی گئیں۔

حسین بغداد چھوڑ کر خراسان چلے گئے تھے۔ جہاں اُنہوں نے ۲۱ر رجب ۲۷۵ھ (۸۸۸ء) کو وفات پائی۔(۸۰)

۵۔ داؤد بن محمد (م ۲۸۰ھ/ ۸۹۳ء):

داود نے اپنے والد محمد کی سند سے اپنے دادا ابو معشر کی کتاب المغازی روایت کی۔ احمد بن کامل قاضی بغداد ان کے شاگرد تھے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داؤد نے ثقافتی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ نہیں لیا۔ ان کی تاریخ وفات کا صحیح علم نہیں ہے۔(۸۱) اندازاً ۲۸۰ھ بیان کی گئی ہے۔

۶۔ قاسم بن عباس معشری (م ۲۷۸ھ/ ۸۹۲ء):

قاسم خانوادۂ ابو معشر کے غالباً آخری ممتاز عالم تھے۔ وہ محدث بھی تھے اور فقیہہ بھی۔ اور تصوف کی طرف بھی میلان رکھتے تھے۔ قاسم، ابو معشر کے نواسے تھے، اور معشری کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اُنہوں نے ابوالولید طیالسی (م ۲۲۷ھ)، مسدد (م ۲۲۸ھ) اور دوسرے علماء سے تعلیم حاصل کی۔ خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ/ ۱۰۷۰ء) کا بیان ہے کہ قاسم کو علمِ حدیث، تصوف اور فقہ میں بلند مرتبہ حاصل تھا اور بہت ضعیف ہو جانے کے بعد بھی ان کی صحت پہلے کی طرح اچھی رہی۔ قاسم کافی ثقہ راویِ حدیث تھے۔ اور بقول دارقطنی (م ۳۸۵ھ) ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

احمد بن کامل قاضیِ بغداد، ابوبکر شافعی اور ابو عامر بن سماک نے قاسم کی سند سے احادیث روایت کی ہیں۔ جمعہ، ۲ر شوال ۲۷۸ھ (جنوری ۸۹۲ء) کو قاسم نے وفات پائی۔(۸۲)

۷۔ خلف بن سالم سندھی مخرمی (۱۶۲ تا ۲۳۱ھ/ ۷۷۸ تا ۸۴۵ء):

خلف بن سالم سندھی مخرمی مہالبہ (۸۳) کے مولا اور ہندی نژاد تھے۔ وہ بغداد کے ایک مشہور محلّے مخرم کے رہنے والے تھے، اس لیے مخرمی کہلائے۔(۸۴) خلف بن سالم نے ۲۳ر رمضان ۲۳۱ھ (۸۴۵ء) کو بغداد میں وفات پائی۔(۸۵)

خلف علمِ حدیث کے بہت ذہین اور شوقین طالب علم تھے۔ اور یہ علم حاصل کرنے کے لیے اُنہوں نے حجاز، شام اور عراق کے تمام علمی ذخائر چھان مارے۔ ان کے شیوخ کی طویل فہرست سے

جومختلف مسلم ممالک کے رہنے والے تھے، ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس علم کو حاصل کرنے کی خاطر خلف نے کس قدر محنت و جفاکشی سے کام کیا۔ خلف کے ان اساتذہ میں جومختلف مقامات کے باشندہ تھے، خاص طور پر قابلِ ذکر یہ ہیں۔ واسط کے: ہشیم (م ۱۸۳ھ) اور یزید بن ہارون (م ۲۰۶ھ)۔ بصرہ کے: ابن علیہ (م ۱۹۳ھ)، یحییٰ بن سعید القطان (م ۱۹۸ھ) اور محمد بن جعفر غندر (م ۱۹۳ھ)۔ مدینہ کے: معان بن عیسیٰ (م ۱۹۸ھ)۔ یمن کے: عبدالرزاق (م ۲۱۱ھ)۔ کوفہ کے: ابوبکر بن عیاش (م ۱۹۳ھ)، ابونمیر (م ۱۹۹ھ)، محمد بن عبداللہ زبیری (م ۲۰۳ھ) اور فضل بن دکین (م ۲۱۹ھ)۔ بغداد کے: یعقوب بن ابراہیم (م ۲۰۸ھ) اور سعد بن ابراہیم (م ۲۰۱ھ)۔

علم حدیث کے ممتاز نقادوں نے خلف کے متعلق بحیثیت ایک محدث جو رائے قائم کی ہے، اس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے۔

(۱) یحییٰ بن مُعین (م ۲۳۳ھ): صدوق۔ دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ ان کے خلاف کوئی اعتراض موجود نہیں ہے۔

(۲) یعقوب بن ابی شیبہ (م ۲۶۲ھ): ثقہ ثبت۔ یہ مسدد (م ۲۲۸ھ) اور حمیدی (م ۲۱۹ھ) سے زیادہ ثبت ہیں۔

(۳) نسائی (م ۳۰۳ھ): ابومحمد خلف الحزمی ثقہ ہیں۔

(۴) احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ): ان کی صحت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۵) ابنِ حبان (م ۳۵۴ھ): حذاق المتقین۔ نہایت قابلِ یقین۔

(۶) حمزہ کنعانی: طبقۂ محدثین میں نہایت ثقہ۔(۸۶)

خلف اعیان حفاظِ بغداد(۸۷) میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کا حلقہ علماء ومحدثین کا مرجع تھا، جو ان کے درس میں شریک ہوتے، اور ان سے سنی ہوئی احادیث لکھ لیا کرتے تھے۔(۸۸) ان کے شاگردوں میں عثمان دارمی (م ۲۸۰ھ)، یعقوب بن ابی شیبہ (م ۲۶۱ھ)، احمد بن ابی خثیمہ (م ۲۷۸ھ)، احمد بن علی مروزی (م ۲۹۸ھ)، عباس دارمی (م ۲۷۱ھ) اور اسماعیل بن حارث (م

۲۵۳ھ) مشہور محدث تھے۔(۸۹)

خلف نے احادیثِ نبوی کی ایک مسند مرتب کی تھی(۹۰) جواب موجود نہیں ہے۔ صحابۂ کرامؓ کی برابری کے متعلق خلف نے کچھ احادیث جمع کی تھیں، مگر اُنہوں نے یہ احادیث روایت نہیں کیں۔(۹۱)

۸۔ رجاء بن السندھی (۲۲۱ھ/۸۳۷ء):

رجاء تیسری صدی ہجری کے ایک محدث تھے۔ وہ بنوحنظلہ کے ایک ہندی مولا کے لڑکے تھے۔ اور اسی نسبت سے حنظلی کہے جاتے تھے۔(۹۴) انھوں نے نیشاپور(۹۵) کے ایک شمالی ضلع اسفرائین میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور اسی لیے افرائینی کے نام سے مشہور ہوئے۔(۹۶)

خراسان میں رجاء نے مشہور محدث عبداللہ بن مبارک مروی (م ۱۸۱ھ) سے حدیث کا درس لیا۔ اُنھوں نے تعلیمی زندگی کا بیشتر حصہ کوفہ میں گزارا، جہاں اُنہوں نے ابن ادریس (م ۱۹۲ھ)، ابوبکر بن عیاش (م ۱۹۳ھ)، حفص بن غیاث (م ۱۹۴ھ) اور سفیان بن عیینہ (م ۱۹۸ھ) جیسے مشہور محدثین سے درس لیا۔(۹۵)

علمِ حدیث میں کافی عبور حاصل کرنے کے بعد رجاء اپنے وطن اسفرائین واپس گئے۔ اور وہاں سب سے پہلے خود اپنے خاندان کے لوگوں کو حدیث کی تعلیم دینے پر توجہ کی۔ چنانچہ اس خاندان میں تیسری صدی ہجری کے دو اور مشہور محدث پیدا ہو گئے۔ یعنی رجاء کے بیٹے اور پوتے۔ رجاء کا مکان بہت جلد طالبانِ علمِ حدیث کا مرجع بن گیا۔ اور اس علم کے شوقین طلباء ایک ہندی مولا (غلام) کے بیٹے کے گرد جمع ہونے لگے۔ رجاء کے ہم عصر محدثین میں سے نامور محدث احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، بکر بن خلف (م ۲۴۱ھ) اور ابراہیم بن موسیٰ رازی (م ۲۳۱ھ) نے رجاء سے احادیث سماعت کیں۔ اور رجاء کے پوتے محمد بن محمد بن رجاء سندھی (م ۲۸۶ھ) اور جعفر بن محمد بن شاکرؒ الصائغ (م ۲۸۹ھ) نے ان سے حدیث کا درس لیا۔(۹۶)

رجاء علمِ حدیث کے ایک رکن تھے۔(۹۷) اور اس کی زبانی اشاعت کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ ایک معتبر اور ثقہ راوی ہونے کے علاوہ رجاء کو عربی الفاظ کے صحیح انتخاب اور استعمال پر

بھی بڑی قدرت حاصل تھی۔ بکر بن خلف کا بیان ہے کہ میں نے اُن سے زیادہ فصیح و خوش بیانِ مقرر نہیں دیکھا۔ رجا نے شوال ۲۲۱ھ/ ۸۳۷ء میں وفات پائی۔(۹۸)

۹۔ محمد بن رجاء سندھی (۲۴۶ھ/ ۸۶۰ء):

محمد جن کا لقب ابو عبداللہ تھا، رجاء سندھی کے فرزند تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں ہمیں بہت ہی کم علم ہے۔ غالباً اپنے والد سے علمِ حدیث کی کچھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ بلخ چلے گئے تھے، اور وہاں برجمن میں مکی بن ابراہیم (۲۱۵ھ) سے حدیث کا درس لیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد محمد حج کے لیے مکہ معظمہ گئے۔ اور اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اس دوران میں حافظ ابو بکر بن ابی الدنیا (م ۲۸۱ھ) نے جو محمد کے والد رجاء کے شاگرد تھے، اور احمد بن بشر المرثدی نے ان سے احادیث سماعت کیں۔(۹۹) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن رجاء کو علمِ حدیث پر کس قدر عبور حاصل تھا۔

اسفرائین میں محمد نے اپنے آپ کو علمی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ ان کے والد کے زمانہ میں ان کے حلقے نے جو شہرت حاصل کر لی تھی، اس کو برقرار رکھا۔ محمد کے شاگردوں میں ابوبکر ابراہیم بن علی الزہلی اور خود ان کے لڑکے محمد زیادہ مشہور ہوئے۔ محمد جو احادیث اپنے شیوخ سے سنتے تھے، وہ احتیاط سے لکھ لیا کرتے تھے اور پھر یہ احادیث روایت کرتے تھے۔ ان کا انتقال غالباً تیسری صدی ہجری کے وسط میں ہوا۔ صحیح تاریخ کا علم نہیں ہے۔(۱۰۱)

۱۰۔ محمد بن محمد بن رجاء سندھی (۲۰۶ تا ۲۸۶ھ):

رجاء سندھی کے پوتے محمد بن محمد جو اس سلسلہ کے ایک ممتاز رکن تھے، ۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ علمِ حدیث میں تبحر، صداقت پسندی اور تنقیدی بصیرت اور ان سب سے زیادہ ممتاز علم کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس کی بدولت محمد بن محمد تیسری صدی ہجری کے ایک ممتاز محدث بن گئے۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا جو مختصر تذکرہ کیا ہے، وہ یہاں نقل کیے جانے کے قابل ہے۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ محمد بن محمد بن رجاء السندی حافظ اور امام تھے۔ ان کا لقب ابوبکر السفرائینی تھا۔ وہ صحیح بخاری کی ایک مستخرج کے مصنف تھے۔(۱۰۲) اُنہوں نے علمِ حدیث کی تعلیم اسحاق بن رہوے (م ۲۳۸ھ)،

احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، علی المدنی (م ۲۳۱ھ)، عبداللہ بن نمیر (م ۱۹۹ھ) اور ابوبکر بن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ) سے حاصل کی تھی۔ علمِ حدیث کی جستجو میں اُنہوں نے طویل سفر کیے۔ ابوا عوان (م ۳۱۰ھ)، ابوحامد الشرقی، محمد بن صالح بن حانی، ابن الاخرم، ابوالنظر اور دوسرے محدثین نے ابوبکر کی سند سے احادیث روایت کی ہیں۔ الحاکم کا قول ہے کہ ابوبکر اپنے عہد کے محدثین میں نہایت صادق و ثابت قدم تھے۔(۱۰۳) محمد بن محمد کی سرگرمیاں صرف اسفرائین تک محدود نہیں تھیں۔ اُنہوں نے مکہ معظمہ میں بھی علمِ حدیث کا درس دیا جہاں علمِ حدیث کے شائقین ان کو گھیرے ہوئے تھے اور ان میں ابوحاتم (۲۷۷ھ) بھی شامل تھے۔ اُنہوں نے ۲۸۶ھ/۸۹۹ء میں اسی برس کی عمر میں وفات پائی۔(۱۰۴)

۱۱۔ السندی بن عبدویہ دہکی (م ۲۱۵ھ/۸۳۰ء):

السندی، الدہکی کے نام سے مشہور تھے۔ دہک رے کا ایک قریہ ہے اور یہ وہاں کے باشندہ تھے۔ اور جیسا کہ جدی نسبت السندی سے ظاہر ہوتا ہے، وہ ایک ہندی مولا تھے۔(۱۰۵) بحیثیت ایک قدیم راوی کے السندی نے الزہری کے ایک شاگرد ابواویس اصبحی (م ۱۶۹ھ)(۱۰۶) اور مدینہ منورہ اور عراق کے متعدد محدثین کی سند سے احادیث روایت کی ہیں۔ ان کے شاگردوں میں محمد بن حماد طہرانی (م ۲۷۱ھ) کا ذکر کیا جا چکا ہے۔(۱۰۷)

۱۲۔ سہل بن الرحمٰن سندھی (م ۲۲۵ھ/۸۳۹ء):

سہل کو بنوذہل نے آزاد کر دیا تھا۔ وہ احادیث کے عالم تھے۔ اور اُنہوں نے زہیر بن معاویہ (م ۱۷۲ھ)، جریر بن حازم (م ۱۷۰ھ)، شریک بن حازم اور دوسرے محدثین سے احادیث روایت کی ہیں۔ سہل ہمدان اور قزوین کے قاضی تھے۔ عمرو بن رافع (م ۲۳۷ھ) اور محمد بن حماد طہرانی (م ۲۷۱ھ) ان کے شاگردوں میں تھے۔ سہل تیسری صدی ہجری کے اوائل میں بقیدِ حیات تھے۔(۱۰۸)

۱۳۔ فتح بن عبداللہ سندھی (۲۷۵ھ/۸۸۸ء):

فتح کا لقب ابونصر تھا۔ وہ خاندانِ الحکم کے آزاد کردہ تھے۔ فتح بن عبداللہ فقیہہ، عالمِ دین اور محدث تھے۔ فقہ اور کلام میں وہ ابوعلی ثقفی کے شاگرد تھے۔ اور حدیث کا درس حسین بن سفیان (م

۳۲۰ھ) اور دوسرے محدثین سے لیا کرتے تھے۔ اس زمانے کے لوگ ابونصر سندھی کا کس قدر احترام کرتے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ پیدل چلتے تو ان کے مداحوں کا ایک انبوہ ان کے ساتھ چلنے لگتا۔ (۱۰۹)

۱۴۔ احمد بن سندھی فرخ (م ۲۷۵ھ/۸۸۸ء):

احمد، یعقوب بن ابراہیم دورقی بغدادی (م ۲۵۲ھ) کے مرید تھے۔ جو بخاری (م ۲۵۶ھ) اور مسلم (م ۲۶۲ھ) کے شیوخ میں سے تھے۔ (۱۱۰) احمد بغداد میں سکونت پذیر تھے، مگر وہ بصرہ میں بھی حدیث کا درس دیتے تھے۔ عبداللہ بن عدی جرجانی نے حدیث کی تعلیم اُنہی سے حاصل کی تھی۔ احمد سوزن کاری کے ذریعہ روزی کماتے تھے، اس لیے المطّراز یا سوزن کار مشہور ہو گئے۔ (۱۱۱)

۱۵۔ جیش بن سندھی قاتعی (م ۲۸۰ھ/ ۸۹۳ء):

جیش، نامور محدث احمد بن حنبل کے شاگرد تھے۔ اور عبیداللہ بن محمد العائشی سے بھی حدیث کا درس لیا تھا۔ محمد بن مخلد (۱۹۲) نے جیش سے احادیث روایت کی ہیں۔ (۱۱۳)

۱۶۔ السندی بن ابّان (م ۲۸۱ھ/ ۸۹۴ء):

السندی بن ابان کی کنیت ابونصر تھی۔ وہ بغداد کے ایک عالم خلف بن ہشام (م ۲۲۷ھ) کے غلام تھے۔ ابونصر سندھی کو علمِ حدیث سے دلچسپی تھی اور اُنہوں نے کوفہ کے ایک محدث یحییٰ بن عبدالحامد رحمانی سے یہ علم حاصل کیا تھا۔ عبدالصمد بن علی طشتی نے ابونصر سندھی سے حدیث کا درس لیا تھا۔ ماہِ ذوالحجہ ۲۸۱ھ/ ۸۹۴ء میں ابونصر نے وفات پائی۔ (۱۱۴)

۱۷۔ ابوالفوارس احمد بن محمد بن حسن بن السندی (۲۴۴ تا ۳۴۹ھ):

احمد، جیسا کہ ان کی آبائی نسبت السندی سے ظاہر ہوتا ہے، ایک ہندی غلام تھے۔ وہ ۲۴۴ھ میں مصر میں پیدا ہوئے تھے۔ غالباً اُن کا تعلق صابن سازی کے کاروبار سے تھا، اس لیے ان کو الصابونی کہا جاتا تھا۔ احمد نے طویل عمر پائی، اور ۱۰۵ سال زندہ رہے۔ ان کا انتقال ۳۴۹ھ میں

ہوا۔(۱۱۵)

احمد نے المزنی (م۲۶۴ھ)(۱۱۶) اور یونس بن عبدالاعلیٰ (م۲۶۴ھ) اور محمد بن حماد طہرانی (م۲۷۱ھ) کی سند سے احادیث روایت کی ہیں۔ اوّل الذکر دونوں محدثین مصری تھے۔ اگرچہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں احمد کی بہت تعریف کی ہے کہ وہ مصر میں علمِ حدیث پر ایک معتبر سند(۱۱۷) تھے، لیکن اسماء الرجال کے زیادہ باریک بین نقادوں مثلاً ذہبی اور ابنِ حجر کی رائے میں احمد قابلِ اعتبار نہ تھے۔ کیونکہ اولاً اُنہوں نے اپنے شیخ محمد طہرانی سے مروی ایک باطل حدیث کی اشاعت کی، اور ثانیاً اس لیے کہ مالک کی غرائب میں ان سے مروی ایک ایسی حدیث ہے۔(۱۱۸) جس میں عباس بن فضل بن اعوان تنوہی اور سوادہ بن ابراہیم انصاری کا حوالہ بطور اسناد دیا گیا ہے۔ اس میں سے عباس کاذب(۱۱۹) تھا اور سوادہ ضعیف(۱۲۰)۔ علاوہ ازیں ابنِ المنذر کے نزدیک خود احمد کذاب تھے۔(۱۲۱)

۱۸۔احمد بن سندھی بن حسن بن بحر حداد (م۳۵۹ھ/۹۶۹ء):

احمد کا لقب ابوبکر حداد تھا۔ کیوں کہ وہ بغداد کے ایک محلّے قطیعہ بنی حداد میں رہتے تھے۔(۱۲۲) اُنہوں نے حافظ موسیٰ بن ہارون (م۲۹۴ھ)، محمد بن عباس المودب اور حسن بن علوویہ القطان سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ احمد ایک ثقہ راویِ حدیث تھے۔ دارقطنی (م۳۸۵ھ) نے ان کو ثقہ راوی تسلیم کیا ہے۔ ان کے شاگردوں میں مشہور محدث ابونعیم اصفہانی بھی تھے۔ احمد ولی صفت انسان تھے اور ان کو ایسا بزرگ تصور کیا جاتا تھا جس کی دُعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اُنہوں نے ۳۵۹ھ/۹۶۹ء میں وفات پائی۔(۱۲۳) احمد کے نام کے ساتھ سندھی کی نسبت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندی نژاد تھے۔(۱۲۴)

۱۹۔نصر اللہ بن احمد بن السندی (م۴۳۳ھ/۱۰۴۱ء):

نصر اللہ ایک سندھی غلام کے پوتے تھے، جسے خراسان میں خریدا گیا تھا اور ابن السندھی کے نام سے معروف ہوئے۔ نصر اللہ نے ابوالقاسم بن سابنک کی سند سے احادیث روایت کیں۔ ان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ خطیب بغدادی (م۴۶۳ھ) کے شیخ تھے۔ خطیب نے نصر اللہ سے احادیث

نقل کیں، اور وہ ان کو صدوق تصور کرتے تھے۔ نصر اللہ نے ذوالقعدہ میں وفات پائی۔ (۱۲۵)

۲۰۔ ابو محمد بختیار بن عبداللہ ہندی (۵۴۱ھ/۱۱۴۹ء):

ابو محمد ہندی کتاب الانساب کے مصنف عبدالکریم سمعانی (۵۰۶ تا ۵۶۲ء) کے والد ابوبکر محمد سمعانی (۴۶۶ تا ۵۱۰ھ) کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کی نسبت الہندی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندی نژاد تھے۔

ابو محمد نے حدیث کی تعلیم اپنے آقا سے حاصل کی تھی، جو ان کو علمِ حدیث کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے ساتھ عراق، حجاز اور شام لے گئے تھے۔ چنانچہ ابو محمد نے بغداد میں جعفر بن احمد سراج، محمد بن عبدالسلام انصاری اور دوسرے محدثین سے، ہمدان میں عبدالرحمٰن بن احمد بن حسین دُوینی سے اور اصفہان میں محمد بن حداد سے حدیث کا درس لیا۔ عبدالکریم سمعانی نے ان سے چند احادیث سماعت کی تھیں۔ ابو محمد نے صفر ۵۴۱ھ/۱۱۴۹ء میں مرو میں وفات پائی۔ (۱۲۶)

۲۱۔ ابوالحسن بختیار بن عبداللہ ہندی (م ۵۴۳ھ/۱۱۵۱ء):

ابوالحسن ہندی، ابو محمد ہندی کے ہم عصر اور غالباً بھائی بھی تھے۔ وہ محدث اور صوفی تھے۔ ابوالحسن (۱۲۷) بشنج کے قاضی محمد بن اسماعیل یعقوبی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور وہ عبدالکریم سمعانی کے استاد ہونے کی وجہ سے مشہور ہو گئے۔ ابو محمد ہندی کی طرح ابوالحسن نے بھی اپنے آقا کے ساتھ اسلامی ممالک کا سفر کیا، اور ممتاز محدثین سے احادیث کا درس لیا۔ ان محدثین میں الشریف ابونصر محمد، ابوالفوارس، محمد بن علی اور رزق اللہ بن عبدالوہاب تمیمی بغدادی، علی بن احمد بن علی ستری، عبدالمالک بن علی حافظ، اور احمد بن محمد عبدی، بصری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اصفہان، جبال اور خوزستان کے کئی محدثین بھی ابوالحسن کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ سمعانی کا بیان ہے کہ ابوالحسن نے فوشنج اور ہرات میں بھی علمِ حدیث حاصل کیا تھا۔ ابوالحسن ہندی نے ۵۴۲ یا ۵۴۳ھ/۱۱۵۱ء میں وفات پائی۔ (۱۲۸)

حواشی:

(۱) بلاذری، فتوح، ص ۳۷۳ = مرگوٹن، ص ۱۰۵ و مابعد۔ الزط۔ یعنی جاٹ، سندھ کا ایک قبیلہ۔ لسان العرب:

الزط۔ بلاذری، فتوح، ۳۷۵ = مرگوٹن، ص ۱۰۹، اغانی، ج ۱۴، ص ۴۶ میں سیاجتیہ لکھا ہے۔ ابن اثیر، تاریخ، ج ۲، ص ۲۸۱ میں سیابجہ۔ طبری تاریخ، ج ۱، ص ۱۹۶۱ء۔

سیابجہ وہی ہیں جن کو بلگرنامہ میں سمیجہ کہا گیا ہے اور جو سودھاؤں کی ایک شاخ تھے۔ اور اساورہ غالباً ذیرسہ تھے جو سودھاؤں کا خاص قبیلہ شمار کیے جاتے تھے، (ایلیٹ، ہسٹری، ج ۱، ص ۵۳۱) سیاہ، اساورہ کا سردار تھا۔ (بلاذری، فتوح، ص ۳۷۳) یہ غالباً سیتاہ یا سیاہ یعنی کالا تھا۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ عباسی خلیفہ المہدی کے عہد تک (۱۵۸-۱۶۹ھ/ ۷۷۵-۷۸۹ء) سیابجہ اور اساورہ ایک ساتھ رہتے اور کام کرتے رہے۔ (طبری، تاریخ، مصر، ج ۹، ص ۳۲۷) یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان میں ایک موروثی تعلق پایا جاتا تھا، یعنی یہ دونوں سندھ کے ایک ہی قبیلے سودھاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ معارف، ج ۱۳، ش ۵، ص ۳۲۸۔ گیبریل فیرانڈ Gabriel Ferrand کے بیان کے مطابق سیابجہ سماترہ کے قدیم تارکان وطن کی اولاد تھے جو پہلے ہند میں اور پھر عراق اور خلیج فارس کے علاقوں میں آباد ہوئے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۴، ص ۲۰۱)

(۲) بلاذری، فتوح، ص ۳۷۳ = مرگوٹن، ص ۱۰۶۔

(۳) لے اسٹرینج، کتاب مذکور، ص ۴۲۔

(۴) بلاذری، فتوح، ص ۳۷۵ = مرگوٹن، ص ۱۰۹۔

(۵) یاقوت، معجم، ج ۲، ص ۹۳۰۔

(۶) لے اسٹرینج، کتاب مذکور، ص ۲۴۴۔

(۷) طبری، تاریخ، ص ۷-۲۷۰۶ (لائیڈن)۔

(۸) ریورٹی، کتاب مذکور، ص ۵۶۸۔

(۹) بلاذری، فتوح، ص ۴۳۲ = مرگوٹن، ص ۲۱۰۔

(۱۰) فرشتہ، تاریخ، ج ۱، ص ۱۶۔

(۱۱) بلاذری، فتوح، ص ۴۳۳ = مرگوٹن، ص ۲۱۱۔

(۱۲) طبری، تاریخ، ج ۳، ص ۷۷-۴۷۶۔

(۱۳) ابن العماد، شذرات، ج ۱، ص ۲۷۲۔

(۱۴) سمعانی: انساب، و ۵۹۳ الف۔ لے اسٹرینج، کتاب مذکور، ص ۳۲۴۔ مشہور حنفی فقیہ ابوجعفر الہندوانی کا انتقال ۳۶۲ھ/ ۷۳-۹۷۲ء میں ہوا تھا۔ عبدالحی لکھنوی، الفوائد البھیہ، ص ۷۳۔

(۱۵) خدا بخش اور مارگولیوتھ، کتاب مذکور، ص ۹۹، ۱۲۷۔

(۱۶) بلاذری، فتوح، ص ۲۷۶ = مرگوٹن، ص ۱۱۰، ۱۱۱۔

(۱۷) بلاذری، فتوح، حوالۂ مذکور، ابن عبدالبر، کتاب الاستیعاب فی معرفت الاصحاب، حیدر آباد، ۱۳۳۶ھ، طبع دوم، ج ا، ص ۱۲۲-۱۲۱۔

(۱۸) بلاذری، فتوح، ص ۳۷۶ = مرگوٹن، ص ۱۱۰۔

(۱۹) ایضاً، ص ۲۶ و مابعد۔ ہتی، کتابِ مذکور، ص ۴۳۵ و مابعد۔ مویئر، کتابِ مذکور، ص ۲۳-۱۲۲۔

(۲۰) ہتی، کتابِ مذکور، ص ۲۴۱ و مابعد۔

(۲۱) ابنِ سعد نے طبقات، ج ۸، ح ا، ص ۵-۸ میں اُن ۱۵۰ صحابہ کے نام لکھے ہیں جو ہجرت کر کے بصرہ چلے گئے تھے۔

(۲۲) معارف، جون ۱۹۴۱ء، ص ۱۵-۴۱۴۔

(۲۳) ایضاً، ج ۱۳ (۵)، ص ۳۲۰۔ اگر یہ درست ہے کہ ان کے دادا از وطی کا آبائی وطن کابل تھا (خطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص ۳۲۴ و مابعد) تو ان کا جاٹ ہونا قرینِ قیاس ہو سکتا ہے، کیونکہ کابل جاٹوں کے آباؤاجداد کا وطن تھا۔ کننگھم، Archaeological Survey of India، شملہ، ۱۸۷۱ء، ج ۲، ص ۵۴، ۵۵) یا وہ کم از کم اس اعتبار سے ہندی تھے کہ کابل ثقافتی اعتبار سے ہند کا حصہ تھا۔ واٹرس، Yean Chwang: Watters، ج ا، ص ۱۲۳ اور ج ۲، ص ۲۶۴۔

(۲۴) سیوطی، لب اللباب، ج ا، ص ۱۵۔ سمعانی، انساب، و ۳۷۶۔

(۲۵) عسقلانی، تقریب التہذیب، ص ۴۳۲۔

(۲۶) صفی الدین، خلاصہ، ص ۳۹۳۔

(۲۷) عسقلانی، تہذیب، ج ۵، ص ۱۱۹۔

(۲۸) صفی الدین، خلاصہ، ص ۱۶۰۔

(۲۹) عسقلانی، تقریب، ص ۴، ۱۹۰۔

(۳۰) ذہبی، میزان، ج ا، ص ۴۳۲۔ عسقلانی، لسان، ج ۳، ص ۲۵-۱۲۴۔

(۳۱) مسلم، الصحیح بخاری، جامع الصحیح - احمد بن حنبل، المسند - ابوداؤد، سنن: الباب فی حق المملوک۔

(۳۲) بیان کیا جاتا ہے کہ یہ کابل سے جنگی قیدی بنا کے لائے گئے تھے۔ نووی، اسماء اللغت، ص ۵۸۹۔

(۳۳) یہ موریطانیہ، کے ایک بربر تھے۔ ایضاً، ص ۴۳۱ و مابعد۔

(۳۴) اسناد جن میں مالک، نافع، اور ابنِ عمر شامل ہوں، سلسلۃ الذھب کہلاتے ہیں، ابنِ حجر عسقلانی، نخبۃ الفکر، کانپور، ۱۳۴۴ھ، ص ۳۱۔

(۳۵) یہ زید بن ثابت (م ۵۴ھ) کے غلام تھے۔ نووی، اسماء اللغت، ص ۴۰۹۔

(۳۶) یہ کابل سے لائے ہوئے جنگی قیدی تھے، نووی، اسماء اللغت، ص ۵۷۷۔

(۳۷) ایضاً، ص ۳۶۵ و مابعد۔

(۳۸) خطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص ۳۲۰۔

(۳۹) اس نام کے صحیح تلفظ کے لیے ملاحظہ ہو، نووی، کتاب مذکور، ص ۳۸۲۔

(۴۰) ابنِ سعد، طبقات، ج ۷۔ ح ۲، ص ۱۸۵۔

(۴۱) نووی، اسماء اللغت، ص ۸۳-۳۸۲۔ عسقلانی، تہذیب، ج ۶، ص ۲۳۹۔

(۴۲) نووی، اسماء اللغت، ۳۸۳، سمعانی، انساب، و۵۳ب۔ یاقوت، معجم، ج ۱، ص ۴۰۳۔

(۴۳) عسقلانی، تہذیب، ج ۶، ص ۲۳۶۔

(۴۴) ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۱۶۸: اصلہ من سبی السند، العینی، عمدۃ القاری، مصر، ج ۱، ص ۴۶۵: اصلہ من سبی الہند۔

(۴۵) ابنِ خلکان، وفیات، مصر، ۱۳۱۰ھ۔ ج ۱، ص ۲۷۵۔ نووی، اسماء اللغت، ص ۳۸۲ و مابعد۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۱۶۸ و مابعد۔ سمعانی، انساب، و۵۳ ب۔ عسقلانی، تہذیب، ج ۶، ص ۲۳۸ و مابعد۔ یافعی، مرأۃ الجنان، ج ۱، ص ۳۳۳۔ ابن العماد، شذرات، ج ۱، ص ۲۴۲۔

(۴۶) ذہبی، تذکرۃ، ص ۱۶۹۔

(۴۷) نووی، اسماء اللغت، ص ۸۴-۳۸۳۔ عسقلانی، تہذیب، ص ۳۹-۲۳۸۔

(۴۸) عسقلانی، مقدمۃ الفتح الباری، مصر، ۱۳۷۴ھ، ج ۱، ص ۴۔

(۴۹) قتادۃ، زہری اور یحییٰ بن ابی کثیر۔

(۵۰) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۱، ص ۵۲۴۔

(۵۱) نووی، کتابِ مذکور، ص ۳۸۴۔ عسقلانی، کتابِ مذکور، ص ۲۴۲۔

(۵۲) ابن الندیم، الفہرست، ۳۱۸۔

(۵۳) ان کا شمار قدیم صوفیاء میں کیا جاتا ہے۔ ابن الندیم، الفہرست، ص ۲۶۰۔

(۵۴) ذہبی، تذکرۃ، ص ۱۷۲۔ عسقلانی، کتابِ مذکور، ص ۲۴۳۔

(۵۵) ایضاً۔

(۵۶) مقدسی، احسن التقاسیم، ص ۲۷۔ ذہبی، طبقات الحفاظ، مخطوطہ، بانکی پور، و۹۵-۱۹۴۔

(۵۷) ذہبی، تذکرہ، ص ۷۱-۱۷۰۔

(۵۸) ایضاً، ص ۱۷۲۔

(۵۹) ابنِ عماد نے (شذرات، ج ۱، ص ۴۱۹) غلطی سے السِندی کو السَندی پڑھا تھا اور یہی غلطی احمد سعید نے اپنی کتاب غلامانِ اسلام، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۵۳۰، میں کی ہے۔ صحیح تلفظ کے لیے ملاحظہ ہو، سمعانی، انساب، و

۳۱۴ ب اور عسقلانی، تہذیب، ص ۳۷۰۔

(٦٠) ابونعیم کا بیان ہے کہ ابومعشر سندھ کے رہنے والے تھے: کان ابی معشر سندیا۔ خطیب، تاریخِ بغداد، ج ۱۳، ص ۴۵۸۔ سمعانی، انساب، حوالۂ مذکور۔ دولابی، کتاب الکنا والاسماء، حیدر آباد دکن، ۱۳۲۲ھ، ج ۲، ص ۱۲۰۔ یاقوت، معجم، ج ۳، ص ۱٦٦۔ مقدسی، کتاب الانساب، ص ۷۷، ذہبی، تذکرہ، ج ۱، ص ۲۱٦۔ عسقلانی، تہذیب، ج ۱۰، ص ۴۱۹۔ ذہبی میزان، ج ۲، ص ۲۲۸۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۵۲-۲۵۱۔

(٦۱) خطیب، تاریخِ بغداد، ص ۴۵۷۔

(٦۲) ایضاً، عسقلانی، تہذیب، ص ۲۰-۴۱۹۔

(٦۳) خطیب، تاریخ بغداد، ص ۴۵۸۔

(٦۴) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۱، ص ۱۰۰۔

(٦۵) سمعانی، انساب، حوالۂ مذکور۔

(٦٦) عسقلانی، تہذیب، حوالۂ مذکور۔

(٦۷) ذہبی، تذکرۃ، حوالۂ مذکور۔

(٦۸) عسقلانی، تہذیب، ص ۴۲۰۔

(٦۹) ایضاً، ص ۴۲۱۔

(۷۰) خطیب، تاریخ بغداد، ص ۴٦۰۔ عسقلانی، تہذیب، حوالۂ مذکور۔ عسقلانی، تقرعیب، ص ۳۷۲۔

(۷۱) ابنِ سعد، طبقات، ج ۵، ص ۳۰۹۔

(۷۲) ایضاً، عسقلانی، تہذیب، خطیب، تاریخ بغداد۔

(۷۳) عسقلانی، تہذیب، ص ۴۲۱۔

(۷۴) ذہبی، تذکرہ، حوالۂ مذکور۔

(۷۵) ابنِ ندیم، الفہرست، ۱۳٦۔

(۷٦) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۱، ص ۱۰۰۔

(۷۷) عسقلانی، تقریب، ص ۳۷۲، اور تہذیب، ص ۳۱۹۔

(۷۸) مبنی، کتابِ مذکور، ص ۳۰۱ و مابعد۔

(۷۹) خطیب، تاریخ بغداد، ج ۳، ص ۳۲۹ و مابعد۔ سمعانی، انساب، و ۳۱۴ ب: عسقلانی، تہذیب، ج ۹، ص ۴۳۷۔ اور تقریب، ص ۳۴۰۔

(۸۰) صفی الدین، خلاصہ، ص ۳۰۹۔

(۸۱) خطیب، تاریخ بغداد، ج ۸، ص ۹۱۔ ذہبی، میزان، ج ۱، ص ۲۵٦۔

(۸۲) ایضاً، ص ۳۹۶۔

(۸۳) خطیب، تاریخِ بغداد، ج ۱۳، ص ۴۳۶۔ سمعانی، انساب، و ۵۲۷ الف۔

(۸۴) مہلب بن ابی صفرا (م ۸۲ھ) اور ان کی اولاد کو مہالیب کہا جاتا ہے۔ المبرد کامل کا حوالہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۳۴ء میں دیا گیا ہے۔

(۸۵) لے اسٹرینج، کتابِ مذکور، ص ۳۱، ۳۳۔

(۸۶) خطیب، تاریخِ بغداد، ج ۸، ص ۳۲۸ و مابعد۔ عسقلانی، تہذیب، ج ۳، ص ۱۵۲۔ ذہبی، میزان، ج ۱، ص ۳۱۰۔

(۸۷) خطیب، تاریخِ بغداد، حوالۂ مذکور، عسقلانی، تہذیب، حوالۂ مذکور۔

(۸۸) ایضاً۔

(۸۹) ذہبی، تذکرہ، ص ۵۹: من اعیان حفاظ بغداد۔

(۹۰) ابنِ سعد، طبقات، ج ۷، ح ۲، ص ۹۳۔ ان سے مروی کئی احادیث سنن نسائی میں شامل ہیں۔ صفی الدین، خلاصہ، ص ۹۰۔

(۹۱) خطیب، تاریخِ بغداد، حوالۂ مذکور، عسقلانی، تہذیب، حوالۂ مذکور۔

(۹۲) ابنِ سعد، طبقات، حوالۂ مذکور۔

(۹۳) خطیب، تاریخِ بغداد، عسقلانی، تہذیب التہذیب۔

(۹۴) سمعانی، انساب، و ۳۱۴ الف، ۳۱۴ ب۔

(۹۵) لے اسٹرینج، کتابِ مذکور، ص ۳۹۱۔

(۹۶) عسقلانی، تہذیب، ج ۳، ص ۶۸-۳۶۷۔ اور تقریب، ص ۱۲۳۔

(۹۷) ایضاً۔ (۹۸) عسقلانی، تہذیب، حوالۂ مذکور۔

(۹۹) رکن من ارکان الحدیث، ایضاً۔ (۱۰۰) ایضاً۔

(۱۰۱) خطیب، تاریخِ بغداد، ج ۵، ص ۷۷-۲۷۶۔ سمعانی، انساب، و ۳۱۴ ب۔

(۱۰۲) ایضاً۔ (۱۰۳) یہ کتاب غالباً اب موجود نہیں ہے۔

(۱۰۴) ذہبی، تذکرہ، ج ۲، ص ۳۱-۲۳۰۔

(۱۰۵) سمعانی، انساب، ۳۱۴ ب۔ ذہبی، تذکرہ، حوالۂ مذکور۔

(۱۰۶) سمعانی، انساب، و ۲۳۵ ب۔

(۱۰۷) ان کا پورا نام عبداللہ بن عبداللہ بن اویس بن مالک بن ابی عامر الاصبحی المدنی تھا۔ صفی الدین، خلاصہ، ص ۱۷۲۔

(۱۰۸) سمعانی، انساب، حوالۂ مذکور۔

(۱۰۹) ایضاً، و۳۱۴ ب۔

(۱۱۰) ایضاً۔

(۱۱۱) خطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۴، ص ۲۷۷۔

(۱۱۲) ایضاً، ج ۴، ص ۱۸۷۔

(۱۱۳) ذہبی، میزان، تذکرہ محمد بن مخلد۔

(۱۱۴) خطیب، تاریخ بغداد، ج ۸، ص ۲۸۲۔

(۱۱۵) ایضاً، ج ۹، ص ۲۳۴۔

(۱۱۶) ذہبی، میزان، ج ۱، ص ۷۱۔ عسقلانی، لسان، ج ۱، ص ۲۹۶۔ سیوطی، حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ج ۱، ص ۱۷۲۔ ابن العماد، شذرات، ج ۲، ص ۳۸۰۔

(۱۱۷) یہ امام شافعی (م ۲۰۴ھ) کے ایک مشہور شاگرد تھے، ابن العماد، شذرات، ج ۲، ص ۱۴۸۔

(۱۱۸) ذہبی، میزان، حوالۂ مذکور۔ عسقلانی، لسان، حوالۂ مذکور۔

(۱۱۹) الثقۃ المعمر مسند دیار مصر۔

(۱۲۰) ذہبی، میزان، ج ۱، ص ۴۳۳۔

(۱۲۱) ذہبی، میزان، ج ۲، ص ۱۹۔

(۱۲۲) ایضاً، ج ۱، ص ۴۳۳۔

(۱۲۳) عسقلانی، لسان، ج ۱، ص ۲۹۰۔

(۱۲۴) سمعانی، انساب، و۱۲۴ الف، ۳۱۴ ب۔ خطیب کی تاریخ بغداد، ج ۴، ص ۱۸۷ میں اس محلّہ کا نام غلطی سے قطیعہ بنی حداد چھپ گیا ہے۔

(۱۲۵) خطیب، تاریخ بغداد، ج ۴، ص ۱۸۷۔

(۱۲۶) یاقوت، معجم، ج ۲، ص ۳۷ میں السندی غلطی سے السیدی چھپا ہے۔ صحیح نام کے لیے ملاحظہ ہو، سمعانی، انساب، حوالۂ مذکور، اور خطیب تاریخ بغداد، حوالۂ مذکور۔

(۱۲۷) خطیب، تاریخ، ج ۱۳، ص ۳۰۲۔

(۱۲۸) سمعانی، انساب، و۵۹۳ الف۔ معارف، ج ۲۴، ش ۴، ص ۲۴۹۔

باب دوم

حسن الصغانی اور ان کی تصانیف

حسن الصغانی نے علمِ حدیث کے فروغ میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، ان کی وجہ سے وہ بذاتِ خود ایک مکتبِ حدیث جیسی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لیے ہم نے ان کے متعلق ایک جداگانہ باب قلم بند کرنا مناسب خیال کیا ہے۔

فصلِ اوّل: مختصر حالاتِ زندگی

حسن الصغانی لاہوری (۵۷۷ تا ۶۵۰ھ/۱۱۸۱ تا ۱۲۵۲ء):

رضی الدین حسن بن محمد بن حسن بن حیدر قرشی، عمری، حنفی، جو الصغانی (۱) کے نام سے معروف ہیں، بروز پنجشنبہ بتاریخ ۱۰رصفر ۵۷۷ھ، جولائی ۱۱۸۱ء، لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محمد بن حسن سے حاصل کی، جو ایک ممتاز عالم تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صغانی نے اوائلِ عمر میں ہی ابوعبیدالقاسم بن السلام (م ۲۴۰ھ) کی غرائب زبانی یاد کر کے ایک ہزار دینار بطور انعام حاصل کیے تھے۔ اور اس واقعہ سے بخوبی اندازہ یہ ہوسکتا ہے کہ اُنہوں نے حنفی فقہ میں بہت کامل مہارت حاصل کر لی۔ اور سلطان قطب الدین ایبک (۶۰۳ تا ۶۰۷ھ/۱۲۰۵ تا ۱۲۱۰ھ) نے ان کو لاہور کا قاضی بنانے کی پیش کش کی۔ مگر صغانی نے انکار کر دیا اور اعلیٰ تر تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے غزنی روانہ ہو گئے۔ (۲) اس کے بعد اُنہوں نے عراق اور حجاز میں بکثرت سفر کیے اور بڑی محنت اور عزم کے ساتھ نامور علماء سے علومِ حدیث اور لسانیات کی تعلیم حاصل کی۔ بغداد میں صغانی نے نظام المرغینانی سے اور سعید بن وزاز (م ۶۱۶ھ) سے تحصیلِ علم کیا تھا۔ (۳) لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ عراق میں ان کی تعلیمی سیاحت کتنی مدت تک جاری رہی۔ ۶۱۰ھ/ ۱۲۱۳ء میں صغانی نے حجاز میں ایک محدث کی زندگی اختیار کی اور اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں بہت مقبول ہو گئے

تھے۔ چنانچہ اسی سال جب وہ یمن گئے تو بڑی گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں وہ عدن میں تحصیلِ علم میں مصروف رہے اور ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں مکہ معظمہ واپس ہوئے جہاں اُنہوں نے نامور عالم یاقوت حموی (م ۶۲۶ھ) سے آخری بار ملاقات کی۔(۴) مکہ میں اُن کے استادوں میں برہان الدین الجصری (م ۶۱۸ھ)(۵) کا نام ہمیں معلوم ہے۔ یہاں تعلیم مکمل کرنے کے بعد صغانی ماہِ صفر ۶۱۵ھ/اپریل ۱۲۱۸ء میں بغداد پہنچے اور وہاں بھی ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ خلیفہ الناصر (۵۷۷ تا ۶۲۳ھ/۱۱۸۱ تا ۱۲۲۶ء) نے خلعت عطا کیا۔ صغانی نے بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور عباسی خلفاء کو سلطان التتمش (۶۰۷ تا ۶۳۳ھ/۱۲۱۰ تا ۱۲۲۷ء) کے دربار میں اپنا سفیر مقرر کیا۔(۶) وہ بیس برس تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ ۶۲۱ھ/۱۲۲۷ء میں غالبًا خلیفہ الناصر کی وفات کی وجہ سے صغانی اچانک بغداد چلے گئے تھے۔ لیکن اسی سال کے ماہِ شعبان میں خلیفہ المستنصر (۶۲۴ تا ۶۴۵ھ/۱۲۲۷ تا ۱۲۴۷ء) نے ان کو دہلی میں پھر اپنا سفیر مقرر کر دیا۔(۷) مورخ شمس السراج نے طبقاتِ ناصری میں ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں عباسی خلیفہ کے سفیر کے ہند آنے کا ذکر کیا ہے۔ جس سے اس تقرر کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے۔(۸) ۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء میں صغانی مستقل طور پر بغداد واپس چلے گئے۔ غالبًا اس کا سبب یہ تھا کہ سلطانہ رضیہ (۶۳۴ تا ۶۳۷ھ/۱۲۳۶ تا ۱۲۴۰ء) کے قتل کے بعد سلطنت میں جو بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی، اس نے صغانی کو دہلی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔(۹)

صغانی نے اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام علمِ حدیث اور علم اللسان پر کتابیں لکھنے اور ان کا درس دینے کے لیے بالکلیہ وقف کر دیے۔ ان کے گرد ہمیشہ شاگردوں کا ایک ہجوم رہا کرتا تھا۔ محدث شرف الدین دمیاتی (م ۷۰۵ھ) جو ذہبی (م ۷۳۵ھ) کے شیخ تھے، صغانی کے شاگردوں میں تھے۔ صغانی نے شعبان ۶۵۰ھ/اکتوبر ۱۲۵۲ء میں اپنی رہائش گاہ واقع حریم الظاہری، بغداد میں وفات پائی۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی لاش بعد میں مکہ معظمہ لے جائی گئی اور وہیں تدفین ہوئی۔(۱۰)

دمیاتی نے صغانی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ صغانی ایک دین دار و پرہیزگار عالم تھے اور کوئی لغو بات کبھی نہ کہتے تھے۔ وہ علمِ حدیث، لسانیات اور علمِ فقہ کے بہت مستند عالم تھے۔(۱۱) صغانی نے علمِ حدیث کا جو وسیع مطالعہ کیا، اس کا بہترین اندازہ ان کی تصنیف ''العباب''

میں خود اُنہی کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ ''میں نے مکہ معظمہ، ہند، یمن اور بغداد میں چار سو کے قریب مسلسل احادیث سنی ہیں اور یہ انتہائی تعداد ہے۔

حسن بن محمد الصغانی علمِ حدیث اور لسانیات کے مسلمہ عالم و ماہر تھے۔ اُنہوں نے ہمارے لیے اپنی ۳۲ تصانیف (۱۲) چھوڑی ہیں۔ جن میں نو کا تذکرہ بروکلمن نے بھی اپنی تاریخِ عربی ادبیات (۱۳) میں کیا ہے۔ اگرچہ ان تصانیف کا بڑا حصہ لسانیات سے متعلق ہے، لیکن علمِ حدیث سے متعلق تصانیف کی ایک خاص اہمیت ہے۔ کیونکہ ان کا مقصد صحیح احادیثِ نبوی کو مقبولِ عام بنانا ہے جنہیں پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے بتدریج نظرانداز کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں بالخصوص سلطنت کے مشرقی علاقوں کے باشندوں میں جن کا استعمال اور وقار رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ صغانی کے عہد میں علمِ حدیث کی جو کیفیت تھی، اس کو سمجھنے کے لیے ایک تمہید قلمبند کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

فصلِ دوم: صغانی سے قبل علمِ حدیث کی کیفیت

چوتھی صدی ہجری میں علمِ حدیث کے فروغ اور ترقی کا عظیم دور اپنے عروج کو پہنچ گیا اور طالبانِ علم کی تحقیقات کے نتیجے میں علمِ حدیث مدون کیا گیا۔ (۱۴) تیسری صدی ہجری کے دوران میں مسلمان علماء و فضلاء کے اجتہاد کی بدولت قرآن و سنت پر مبنی شریعتِ اسلامی کے چار فقہی نظام یعنی، حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مسالک ظہور پذیر ہوئے تھے۔ جن میں اوّل الذکر تین مسالک، اجماع اور قیاس کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ (۱۵)

سنیوں کے ممالک میں ان چاروں فقہی مذاہب کے پیرو یکساں طور پر منقسم نہ تھے۔ چوتھی صدی ہجری میں یہ تقسیم اس طرح تھی کہ المغرب یعنی شمالی مغربی افریقہ میں مالکی تھے۔ (۱۶) شام اور بغداد میں حنبلی یا اصحابِ حدیث تھے۔ (۱۷) سلطنت کے مشرقی صوبوں میں حنفی تھے۔ (۱۸) نیشاپور اور ماوراء النہر کے بعض علاقوں کو مستثنیٰ کر کے جہاں کے لوگ شافعی مسلک کے پیرو تھے۔ (۱۹) ان کے علاوہ مصر میں بھی شافعی اکثریت میں تھے۔ (۲۰)

ہر ایک فقہی مذہب بذاتِ خود ایک وحدت تھا۔ اور اس کے مقلدوں کی رہنمائی اور اس کی انفرادیت کے تحفظ کے لیے فقہ کی تعلیم لازمی تصور کی گئی۔ اس طرح ہر ایک مذہب کے علماء کا گروہ پیدا

ہو گیا جو فقہاء کہے جانے لگے۔ اور ان لوگوں نے فقہ کی تعلیم دینے اور کتابیں لکھنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ (۲۱) آگے چل کر یہی فقہاء اپنی حکومتوں کے محکمۂ قانون و مذہبی امور میں ذمہ دار عہدوں پر مقرر کیے جانے لگے۔ غزنیوں اور ایوبیوں نے شافعی فقہ، ترکوں نے حنفی فقہ اور ہسپانیہ کے امیروں نے مالکی فقہ نافذ کی۔ (۲۲) اس طرح علمِ فقہ کی تعلیم کو بہت فروغ ہوا اور اس کو ترقی دینے میں بڑی مدد ملی۔ اب فقہ کی نوعیت محض علمی نہیں تھی بلکہ یہ سرکاری ملازمت کے حصول کا ذریعہ بن گئی تھی۔ چنانچہ حوصلہ مند نوجوانوں کے لیے علمِ فقہ کی بدولت ترقی کا ایک نیا راستہ کھل گیا۔ (۲۳) علمِ فقہ کے مطالعہ کو کس قدر تیزی سے مقبولیت حاصل ہو رہی تھی، اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں تفقہ علیٰ کے الفاظ کبھی کبھی مشکل ہی سے سنائی دیتے تھے، چوتھی صدی میں یہ ''حدث عن'' کے پہلو بہ پہلو نظر آنے لگے۔ پانچویں صدی میں ''حدث عن'' کی جگہ ''تفقہ علیٰ'' نے لے لی۔ (۲۴) علمِ حدیث حاصل کرنے کے لیے پوری ملت میں جو جذبہ اور جوش تھا اور لوگ اس کی خاطر جو دور دراز ممالک کا سفر کیا کرتے تھے، اس میں کمی آنے لگی (۲۵) اور اس کی جگہ علمِ فقہ اور اس کے متعلقات کا مطالعہ کرنے کا شوق جنون کی حد تک بڑھ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام اسلامی دُنیا میں فقہ کی تعلیم کے مراکز بکثرت قائم ہو گئے۔ کچھ مدت کے بعد بغداد کے مشہور و معروف مدرسۂ نظامیہ میں شافعی فقہ کا شعبہ اور المستنصر یہ میں چاروں مذاہبِ فقہ کے شعبے قائم کر دیے گئے۔ (۲۶) مصر بھی اس بارے میں پیچھے نہیں رہا اور فقہ کی تعلیم دینے کے لیے مدرسۂ السیوفیہ الصایحہ، الناصریہ اور الصلاحیہ قائم کیے۔ (۲۷) واقعہ یہ ہے کہ علمِ فقہ کی ترقی و اشاعت کے لیے تمام مسلمان مجموعی طور پر کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ حنبلیوں نے بھی فقہ پر رسائل لکھے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ قرآن و حدیث پر مبنی تھے۔ (۲۸) ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ علمِ حدیث سے دلچسپی بہت کم ہو گئی۔ یا صرف ایسی احادیث تک محدود رہی جو کسی فقہی مذہب کی ضروریات پوری کرنے کے لیے موزوں تھیں۔ اپنے اپنے مسلک کو تقویت دینے کے لیے احادیث سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر کے فقہاء نے علمِ حدیث کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ کیونکہ اس کوشش میں حدیث کی صحت کو جانچنے کا معیار ہمیشہ برقرار نہیں رکھا جا سکا۔ اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ ایسی ہر ایک حدیث جس سے کسی مخصوص امام کے

نقطۂ نظر کی تائید ہوتی، خواہ مستند ہو یا نہ ہو، قبول کر لی گئی اور اس ضمن میں ضعیف احادیث کو بھی قابلِ قبول بنانے کے لیے اس کے حق میں دلائل پیش کیے گئے۔ اس طرح قدرتی طور پر بہت سی ضعیف احادیث بھی فقہی ادب میں داخل ہو گئیں۔ چنانچہ اس بات پر حیرت نہ ہونی چاہیے کہ الہدایہ جیسی حنفی فقہ کی شاہکار تصنیف میں بھی کچھ ایسی احادیث شامل کر لی گئیں، جن کے راوی غیر محتاط ہیں یا جن کو جعلی قرار دیا گیا ہے۔ (۲۹) فقہا کی وجہ سے علمِ حدیث کو سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ اُنہوں نے فقہی مذاہب بالخصوص حنفی اور شافعی مسالک کے پیروؤں کے درمیان شدید رقابت پیدا کر دی۔ پانچویں صدی ہجری میں حنفیوں اور شافعیوں کے درمیان ایسے مناظرے بہت عام ہو گئے تھے، جن کی صدارت بالعموم کوئی بڑا سرکاری عہدہ دار کرتا تھا اور دونوں فریق دوسرے مسلک پر اپنے مسلک کی برتری ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کرتے تھے۔ لیکن ان مناظروں میں تہذیب و شائستگی کے تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور بسا اوقات مناظرہ جھگڑے کی شکل اختیار کر لیتا تھا اور دونوں فریق ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرتے تھے۔ (۳۰) اس زمانے میں احادیث کثرت سے گھڑی گئیں۔ چنانچہ اس قسم کی نام نہاد احادیث کہ ابوحنیفہ امت کی روشنی ہے، اور ایک قریشی عالم یعنی شافعی، روئے ارض پر علم کا دریا بہا دے گا، اس رجحان کی واضح مثالیں ہیں۔ (۳۱) اکثر و بیشتر فقہاء، خود اپنے مذاہب کی ضابطہ کاری میں اس قدر منہمک رہے کہ اُنہوں نے صحیحین اور سنن جیسی بیش بہا کتابوں کو نہ صرف نظر انداز کر دیا بلکہ ایسی ضعیف اور موضوع احادیث کی اشاعت میں اعانت بھی کی جو اُن کے حسبِ منشاء تھیں۔ چنانچہ اس زمانے میں جعلی احادیث کی اشاعت کرنے اور حدیثیں گھڑنے والے جعل ساز پیدا ہو گئے، جن کو معمرین کا نام دیا گیا۔ ان میں نسطور رومی، ابوالدنیا الاشج اور رتن الہندی (۳۲) جیسے لوگ نیز قرامطہ بھی شامل ہیں جو لوگوں کی اخلاقی اصلاح کے لیے حدیثیں گھڑ لینا جائز تصور کرتے تھے۔ یہ سلسلہ یہاں تک محدود نہ رہا۔ بلکہ قصہ گو اپنی کہانی میں دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر کہانی سناتے ہوئے جھوٹی حدیثیں بھی بیان کر جاتے تھے اور خانقاہیں بھی حدیثیں گھڑنے کا مرکز بن گئی تھیں کیونکہ ایسا ہر ایک مقولہ جو خانقاہ میں رہنے والوں کو گیان دھیان کی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا ہو، حدیث کہہ کر پیش کیا جاتا تھا۔ (۳۳) مفسروں نے بھی اپنی تفسیروں میں بہت سے

بے اصل اقوال کو ایسی احادیث کے طور پر شامل کر لیا جن میں قرآن پاک کی مختلف سورتوں کے غیر معمولی خواص کی جانب بطورِ خاص اشارہ کیا گیا ہے۔(۳۴) اس طرح گھڑی ہوئی احادیث بکثرت پیش کی جانے لگیں اور ان میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔(۳۵) اس بُرے رجحان کو ختم کرنے کے لیے، ابنِ الجوزی (م ۵۹۷ھ) الصنعانی اور دوسرے محدثین کمربستہ ہو گئے۔ ابن الجوزی کی کتاب الموضوعات الکبرا، جو موضوع احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ ہے، علمِ حدیث کے اس شعبہ میں ہمیشہ قابلِ ذکر کتاب رہے گی۔ لیکن ابن الجوزی پر متشدد ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اُنہوں نے الموضوعات میں کچھ حسن اور صحیح احادیث بھی شامل کر لی ہیں۔(۳۶) اس زمانے میں موضوع احادیث کی جو روز افزوں بہتات تھی، اس کے پیشِ نظر اگر ابن الجوزی نے عملِ تطہیر میں سختی سے کام لیتے ہوئے کچھ صحیح احادیث بھی شامل کر لیں تو ان کو زیادہ موردِ الزام نہیں قرار دینا چاہیے۔ ان سب باتوں کے باوجود حالات میں زیادہ اصلاح نہیں ہوئی۔ چنانچہ ابن الجوزی کے بعد پچاس سال کے اندر الصغانی نے جب اس موضوع پر لکھا تو حدیث کے بارے میں اربابِ علم کی روشنی کا ذکر اس طرح کیا کہ:

> ''ہمارے زمانے میں احادیثِ موضوعہ کی تعداد میں بکثرت اضافہ ہو گیا ہے، جنہیں قصے گو مجلسوں میں اور خطبوں میں اور فقہاء و فقراء مدرسوں اور خانقاہوں میں بیان کرتے ہیں۔ اور اس طرح سے موضوع احادیث آئندہ نسلوں تک پہنچائی جا رہی ہیں۔ یہ صورتِ حال سنتِ رسولؐ سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ عرب کے بنجر خطے کے سوا کہیں اور محدث نظر نہیں آتے۔ جعلی احادیث اور رسول کریم ﷺ کے نام نہاد اقوال کی اشاعت بڑی آزادی سے کتابوں کے ذریعے ہو رہی ہے اور کوئی اس پر توجہ نہیں کرتا کہ ان کا مقصد کیا ہے۔ مصنف کا نام مشہور ہونے کی وجہ سے اخلاف نے ان کتابوں کو بخوشی قبول کر لیا ہے اور نتیجہ یہ نکلا کہ اب خود مذہب ہی خطرے میں پڑ گیا ہے۔''(۳۷)

صغانی نے اپنے ذاتی تجربے اور مستند علم کی بناء پر یہ رائے ظاہر کی ہے اور اس دور کی اس سے زیادہ واضح اور حقیقی عکاسی نہیں ہو سکتی۔

فصلِ سوم: محدث کی حیثیت سے صغانی کی خدمات

ابن الجوزی کے بعد صغانی دوسرے محدث ہیں جنہوں نے احادیثِ موضوعہ کو نکال پھینکنے کے لیے دل و جان سے کوشش کی۔(۳۸) صغانی نے زیادہ اصول و قاعدہ کے ساتھ کام کیا اور اس مسئلہ کا ادراک بھی انہیں ابن الجوزی سے زیادہ تھا۔ انہوں نے موضوعات پر اپنے رسائل میں (۳۹) ایسے مباحث کی نشاندہی کی ہے جن سے متعلق احادیث عموماً گھڑ لی جاتی تھیں۔ یہ موضوعات درج ذیل ہیں:

۱۔ کسی شخص کا نام محمد یا احمد رکھنے کے متعلق احادیث۔

۲۔ چاول، خربوزہ، لہسن، بینگن اور پیاز وغیرہ کے بارے میں احادیث۔

۳۔ کچھوا، ریچھ، چرخ، چھپکلی وغیرہ سولہ اقسام کے جانوروں کی تبدیلیٔ ہیئت کے بارے میں احادیث۔

۴۔ مہینوں، دنوں اور راتوں کے خواص سے متعلق احادیث، جن کا ذکر الیواقیت والمواقیت میں کیا گیا ہے۔

۵۔ ماہِ رجب کی فضیلت کے بارے میں احادیث اور

۶۔ مسجدوں میں استعمال کی جانے والی قندیلوں، موم بتیوں اور چٹائیوں سے متعلق احادیث۔

صغانی غالباً پہلے نقاد ہیں جنہوں نے ایک حدیث کی صحت کو جانچنے کے لیے مقررہ کردہ عام شرائط کے علاوہ نبی کریم ﷺ سے منسوب کی جانے والی حدیث کی نوعیت، الفاظ اور معنی کو بھی ملحوظ رکھنے پر خاص طور سے زور دیا ہے۔(۴۰) چنانچہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ قال الرسول (ﷺ) ایسا کلمہ ہے، جسے ایک صحیح حدیث کے سوا کسی اور روایت کے ساتھ کسی حال میں بھی استعمال نہ کرنا چاہیے۔(۴۱)

صغانی نے احادیث گھڑنے میں ماہر لوگوں کی ایک فہرست بھی مرتب کی ہے، جن میں

ابوالدنیا الشج، الخراش، جعفر بن نسطور رومی، بشر، نعیم، نجشیف بہ سند انس، رتن الہندی وغیرہ کے نام زیادہ اہم ہیں۔(۴۱)

چنانچہ ان کی تصانیف کو موضوعات کے اصول مدون کرنے کی پہلی کوشش کہنا چاہیے۔

صغانی نے موضوع احادیث کا کافی بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔(۴۳) بعد کی تحقیقات سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ ابن الجوزی جیسے متشدد محدث کی طرح صغانی نے بھی بہت سی احادیث کو موضوع قرار دے دیا ہے، جو دراصل موضوع نہیں ہیں۔(۴۴) اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں موضوع احادیث چونکہ بہت رائج ہو گئی تھیں، اس لیے صغانی نے بہت احتیاط سے کام لیا۔

صغانی احادیث نبوی کو موضوعات سے پاک کر دینے پر ہی قانع نہیں رہے بلکہ اُنہوں نے اس سے بھی زیادہ کام کیا۔ اُنہوں نے علمِ حدیث کی سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ احادیثِ صحیحہ کو مسلمانوں میں مقبولِ عام بنانے کے لیے کامیاب کوششیں کیں۔ صغانی نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ ابتداء ہی میں عوام کے سامنے صحیحین یا مستند احادیث کا کوئی اور مجموعہ پیش کر دیں گے تو لوگ ان کی ضخامت کی وجہ سے اُنہیں بخوبی قبول نہیں کریں گے۔ چنانچہ اُنہوں نے سب سے پہلے احادیث کے دو مختصر مجموعے مرتب کیے، جن کے نام مصباح الدجیٰ من صحاح الحدیث الماثورہ اور الشمس المنیرہ فی اصحاح الماثورہ ہیں۔ احادیث کے یہ مجموعے مسلمانوں میں بہت مقبول ہوئے۔ جس سے ان کا حوصلہ بڑھا اور اُنہوں نے مشارق الانوار کے نام سے صحیحین کا ایک انتخاب مرتب کیا جو بہت مقبول و مشہور ہوا۔(۴۵)

صغانی کی مشارق الانوار میں ۲۲۵۳ احادیث شامل ہیں جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے منتخب کی گئی ہیں۔ ان احادیث میں سے ۳۲۷ صرف صحیح بخاری میں ہیں اور ۸۷۵ صرف صحیح مسلم میں اور ۱۰۵۱ احادیث دونوں میں موجود ہیں۔(۴۶) صغانی نے صرف احادیثِ قولیہ کا انتخاب کیا ہے اور ان کو احادیث فعلیہ و تقریریہ نیز متابعات، شواہد اور روایت بالمعنیٰ پر ترجیح دی ہے۔ کیونکہ شریعت کے اصول مدون کرنے میں احادیثِ قولیہ کا حصہ زیادہ اہم اور بنیادی رہا ہے۔ چنانچہ احادیث کا انتخاب اصول و قاعدے کے مطابق کیا گیا ہے۔ جہاں تک اسناد کا تعلق ہے، صرف صحابیوں کے نام درج کیے

گئے ہیں، اور بخاری کی احادیث میں نام کے بجائے خ، مسلم کی احادیث میں م اور ان دونوں کی مشترک احادیث میں ق لکھا گیا ہے۔

یہ کتاب بارہ ابواب میں منقسم ہے اور باب کی ذیلی تقسیم ایک یا زیادہ فصلوں میں کی گئی ہے۔ ہر ایک باب میں احادیث کا ایک مجموعہ شامل کیا گیا ہے، جن کا آغاز عوامل مثلاً ما، اذا، ان وغیرہ سے ہوتا ہے یا فعلی اشکال سے مثلاً امر، مضارع، ماضی وغیرہ۔

جو احادیث مختلف عوامل کے ذیل میں جمع کی گئی ہیں، ان کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے قلمبند کیا گیا ہے۔ اور جو احادیث فعلی اعتبار سے جمع کی گئی ہیں، ان کی ترتیب میں بھی حروفِ تہجی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر ایک فعل اس طرح سے جدا جدا قلمبند کی گئی ہے کہ ہر ایک عامل لفظ کے مختلف معنی ایک ہی فصل میں واضح ہو جائیں۔ مثلاً لفظ مَن بہ شکل استفہام (بمعنی کون) ایک جگہ آ جائے اور موصول (بمعنی جو) ایک جگہ۔ اور بعض عوامل جو مختلف ضمیر متصل کے ساتھ آتے ہیں، ان کو بھی الگ الگ یکجا کر دیا ہے۔ مثلاً انّهٗ، انک، انّی وغیرہ۔

ہر باب کے آخر میں عام دلچسپی کے موضوعات مثلاً امورِ شریعت، اخلاقیات، معاملات، غلاموں کی آزادی، جہاد وغیرہ کا بیان ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک ہندی نقاد نے اس کتاب کو ایک ایسے گلزار سے تشبیہ دی ہے جس کے پھولوں کا رنگ تو ملتا جلتا ہے، مگر خوشبو الگ الگ ہے۔ (۴۷) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صغانی نے سنن، جامع، مسند اور معجم کتب حدیث کے غیر متبدل طرزِ ترتیب کے بجائے یہ انداز اس لیے اختیار کیا کہ ان کی کتاب میں لوگوں کے لیے دلچسپی اور دلکشی پیدا ہو جائے۔ مزید برآں یہ ترتیب اس لحاظ سے بھی مفید ہے کہ یہ ایک طرح صحیحین کی فہرستِ عنوانات بترتیب حروفِ تہجی کا کام بھی دیتی ہے۔

صغانی کی وفات کے بعد پچھتر سال کے اندر مشارق الانوار کی پہلی شرح علاؤ الدین یحییٰ بن عبداللطیف قزوینی نے بغداد کے مدرسہ المستنصریہ میں لکھی۔ (۴۸) اور قریب قریب اسی زمانے میں شمسُ الدین اودھی (م ۷۴۹ھ) نے جو حضرت نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ) کے شاگرد تھے، مشارق الانوار کی دوسری شرح لکھی۔ (۴۹) اس کے بعد مختلف مسلم ممالک کے علماء نے جن میں سے

ترک اور ہندی ہیں، مشارق الانوار کی شرحیں، انتخابات اور خلاصے قلمبند کیے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، مشارق الانوار کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آٹھویں صدی ہجری میں اس کا درس لینے کے لیے شائقینِ حدیث دور دراز سفر کرنے لگے اور جماعتوں میں باقاعدہ پڑھائی کی جانے لگی۔(۵۰) نشاۃ ثانیہ سے قبل کے دور میں شمالی ہند میں علمِ حدیث کی اشاعت میں اس کتاب سے جو غیر معمولی مدد ملی، اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مشارق الانوار ہی تھی جس نے اس زمانے میں ہند اور وسطِ ایشیاء کے فقہ زدہ ممالک میں علمِ حدیث کے پرچم کو سربلند رکھا۔

دیگر تصانیف:

ا۔ کشف الحجاب عن احادیث الشہاب: صغانی نے القضائی (م ۴۵۴ھ) کی کتاب الشہاب کو مرتب کیا اور ہر حدیث کے سامنے صحیح، ضعیف یا موضوع کی علامات لگا کر اس کی نوعیت ظاہر کی۔ صغانی نے اس کی ترتیب بھی مشارق الانوار کے مطابق ہی رکھی۔(۵۱)

۲۔ شرح البخاری: یہ کتاب صحیح بخاری کی مختصر شرح ہے۔(۵۲)

۳۔ درالصحابہ فی مواضع وفیات الصحابۃ: (خذیویہ، ج ۵، ۵۲)
اس میں ان مقامات کا ذکر کیا گیا ہے، جہاں اصحابِ رسولؐ نے وفات پائی۔ اسے بھی حروفِ تہجی کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔(۵۳)

۴۔ مختصر الوفیات: یہ رسالہ سیر و سوانح سے متعلق ہے۔

۵۔ کتاب الضعفاء والمتروکین: یہ کتاب ضعیف اور مسترد کردہ راویوں کے بارے میں ہے۔(۵۴)

بہ حیثیت مرتبِ صحیح بخاری

صحیح بخاری کے ایک مرتب کی حیثیت سے صغانی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام عرب، ہند، فارس اور عراق میں صحیح بخاری کا جو ایڈیشن مقبول و مروج ہے، وہ صغانی کا مرتب کرو

ہے۔اوراس کے لیے ہم اس عالی دماغ محدث کے ممنون ہیں۔

منگانا غالباً پہلا مستشرق ہے، جس نے صحیح بخاری کی ترتیب واشاعت کی تاریخ لکھی ہے۔ اوراس کا یہ بیان ہے کہ چوتھی صدی ہجری سے قبل صحیح بخاری کا متن غیر مستقل صورت میں تھا اور اس نے وہ قطعی شکل اختیار نہ کی تھی، جواب ہم دیکھتے ہیں۔ منگانا کے خیال میں اس وقت اس بات کا بھی امکان تھا کہ صحیح بخاری ناپید ہو جاتی، کیونکہ یہ باقاعدہ طور پر تحریری شکل میں موجود نہ تھی۔ لیکن اصیلی (م ۳۹۲ھ)، قابسی (م ۴۰۳ھ)، ابوذر (۴۳۴ھ) اور ابونعیم (م ۴۶۶ھ) جیسے محدثین کی کوششوں کی بدولت اس نے چوتھی اور پانچویں صدی میں مستقل شکل اختیار کر لی۔ اور اس کو باقاعدہ مرتب کرنے کا یہ سلسلہ چھٹی صدی ہجری میں ابوالوقت (م ۵۵۳ھ) کے ہاتھوں مکمل ہوا، جنہیں صحیح بخاری کے متن کا آخری حقیقی مرتب کہنا چاہیے۔لیکن اس کے بعد بھی سمعانی (م ۵۶۲ھ)، ابنِ عساکر (م ۵۷۱ھ)، صغانی (م ۶۵۰ھ) اور شرف الدین یونِنی (م ۷۰۱ھ) جیسے ممتاز محدثین نے بھی اس سلسلہ میں بہت اہم کام کیا اور مختلف ابتدائی متون مرتب ومربوط کر کے اُنہیں وہ شکل دی جو صحیح بخاری مختلف مخطوطات کی صورت میں موجود ہے۔ ان مرتبین میں سب سے زیادہ اہم کام صغانی اور یونِنی نے انجام دیا ہے اور اُنہوں نے نظم وترتیب، اسلوبِ بیان اور بندشِ الفاظ کے اعتبار سے اس کتاب کے متن کو وہ تکمیلی شکل دی ہے جو ہم آج دیکھتے ہیں۔ عرب، ہند، فارس اور عراق میں صحیح بخاری کے جو ایڈیشن مقبول ومروج ہیں، وہ صغانی کے مرتب کردہ متن پر مبنی ہیں اور یونِنی کا مرتب کردہ ایڈیشن مراکش، الجزائر، مصر اور شام میں مقبول ہے۔ (۵۵)

حواشی:

(۱) ان کی نسبت الصغانی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حسن کے اجداد صغانیان کے رہنے والے تھے، جو ماوراء النہر کے ایک ضلع میں واقع ہے۔ (لے اسٹرینج، کتابِ مذکور، ص ۴۴۰) اور یہاں سے ترک وطن کر کے یہ بند آئے تھے۔

(۲) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر مخطوطہ، ج ۱، تذکرۂ الحسن بن محمد الصغانی۔

(۳) ابن العماد، شذرات، ج ۱، ص ۳۵۰۔

(۴) یاقوت، معجم الادباء، مرتبہ ڈاکٹر احمد فرید رفاعی، قاہرہ، ۱۹۳۶ء، ج ۹، ص ۱۹۱-۱۸۹۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا

ہے کہ صغانی، یاقوت حموی (م ۶۲۶ھ) سے بخوبی واقف تھے۔

(۵) ابن العماد، شذرات، حوالۂ مذکور۔

(۶) عبدالحی حسنی، نزھۃ الخواطر، حوالۂ مذکور۔ القرشی، الجواھر المدینہ فی طبقات الحنفیہ، حیدر آباد، دکن، ۱۳۳۲ھ، ج ۱، ص ۲۰۱، ۲۰۲۔

(۷) القرشی، حوالۂ مذکور۔

(۸) منہاج السراج طبقاتِ ناصری، ص ۱۷۴، الغ خانی، کتابِ مذکور، ج ۲، ص ۶۹۸۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو منہاج السراج کی لکھی ہوئی تاریخ ۶۲۴ھ میں کچھ غلطی ہوئی ہے یا القرشی کی لکھی ہوئی تاریخ ۶۲۵ھ میں۔ کیونکہ صغانی نے خشکی کے راستے بغداد سے ہند تک کا سفر طے کرنے میں ایک مہینہ سے زیادہ وقت نہ صرف کیا ہوگا۔ الغ خانی، حوالۂ مذکور۔

(۹) ہیگ، کیمبرج، ہسٹری آف انڈیا، ج ۳، ص ۶۰-۶۱۔

(۱۰) القرشی، حوالۂ مذکور۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، تذکرہ حسن الصغانی، محمد بن شاکر الکتبی، فواۃ الوفیات، مصر، ج ۱، ص ۱۳۳۔ تاش کبرازادہ، مفتاح السعادۃ، حیدرآباد دکن، ۱۳۲۸ھ، ج ۱، ص ۹۸-۹۹، سیوطی، بغیۃ، قاہرہ، ۱۳۲۶ھ، ص ۲۸-۲۲۷۔ از نقی، مدینۃ العلوم، مخطوطہ بانکی پور، ۹۰۔ب، علی القاری۔ اسراء الحنفیہ، مخطوطہ بانکی پور، ج ۱۲، نمبر ۷۶۳ و ۷۷ ب، ۷۸ الف۔ قاسم قطلوغا، ص ۱۷۔ آزاد سبحۃ المرجان، ص ۲۹ اور مآثر الاکرام، ص ۸۳-۱۸۰۔ صدیق حسن، ابجد، ص ۸۲۵، ۸۹۰۔ اور اتحاف، ص ۲۴۳۔ عبدالحی لکھنوی، فوائد البھیہ، ص ۲۹-۳۰ رحمان علی، تذکرہ علما،، ۵۵-۲۵۳۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۵۳-۲۵۲، ج ۲۴، ش ۴، ص ۴-۱۳، مضمون امام صغانی، از سیّد حسن برنی، فہرست بوحار، ج ۲، ص ۳۰-۳۱۔ فہرست بانکی پور، ج ۲، ص ۹۴-۹۵۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ، روداد اجلاس، ۱۹۳۳ء، منعقدۂ لاہور، ص ۲۷-۳۲۶۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، عنوان حسن الصغانی۔

(۱۱) القرشی، حوالۂ مذکور۔

(۱۲) علی القاری، حوالۂ مذکور۔

(۱۳) تاش کبرازادہ، مفتاح السعادۃ، ج ۱، ص ۹۸-۹۹۔ معارف، ج ۲۴ ش ۱، ص ۱۲-۱۳۔

(۱۴) Geschichte، ص ۳۶۰، ج ۱۔

(۱۵) الخولی، مفتاح السنہ، قاہرہ، ۱۹۲۱ء، ص ۱۰۹۔ گیلوم، Traditions of Islam، آکسفورڈ، ۱۹۲۴ء، ص ۶۷۔ الخضری بیگ، تاریخ تشریع الاسلامی، قاہرہ، ۱۹۳۴ء، ص ۹۴-۱۹۲۔ حتی، کتاب مذکور، ص ۹۵، ۳۹۳۔

(۱۶) کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، قاہرہ، ۱۹۳۱ء، ص ۴۰-۴۱۔ الخضری کتابِ مذکور، ص ۳۳۳-۳۳۷۔ حتی، کتابِ مذکور، ۳۹۶-۴۰۰۔

(۱۷) مقدسی، احسن التقاسیم، ص ۳۰۔

(۱۸) ایضاً، ص ۳۹، ۱۳۴۔

(۱۹) ایضاً، ص ۳۷۔

(۲۰) ایضاً، ص ۱۸۰، ۲۰۲۔

(۲۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الخضری، کتابِ مذکور، ۴۷-۲۷۶، ۷۷-۳۷۰۔

(۲۲) ایضاً، ص ۳۴۲۔ جزیری، المذاہب الاربعہ، ص ۲۶-۲۷، ۳۲، ۳۷۔

(۲۳) غزالی، احیاء علوم الدین، مصر، ۱۳۲۲ھ، ج ۱، ص ۱۳، ۱۶، ۳۱۔ شاہ ولی اللہ، الانصاف، دہلی، ۱۹۰۹ء، ص ۸۰، ۸۱۔

(۲۴) ابن العماد، شذرات، ج ۳۔

(۲۵) خدا بخش اور مارگولیوتھ Renaissance of Islam، ص ۹۱-۱۹۰۔

(۲۶) حتی کتابِ مذکور، ص ۱۱-۴۱۰۔

(۲۷) جزیری، المذاہب الاربعہ، ج ۱، ص ۲۷-۳۷۔

(۲۸) الخضری، کتابِ مذکور، ص ۲۷۴۔

(۲۹) مرغینانی، الہدایہ، مطبع یوسفی لکھنؤ، ۱۳۲۵ھ، ج ۱، ص ۱۳۶ = ابن حجر الدرایہ، دہلی، ۱۳۵۰ھ، ص ۱۲۴-۱۴۴۔ ص ۱۲۷۔ الہدایہ، ج ۲، ص ۴۵۶۔ ص ۳۴۲۔ ص ۴۵۹، ۳۳۵۔

(۳۰) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، احیاء، ج ۱، ص ۳۱-۳۳۔

(۳۱) ایسی مزید احادیث کے لیے دیکھیے، طاہر الہندی کی تذکرۃ الموضوعات، قاہرہ، ۱۳۴۳ھ، ص ۱۱۱ و مابعد۔

(۳۲) ایضاً، ص ۱۰۷-۱۰۸۔

(۳۳) طاہر الہندی، کتابِ مذکور، ص ۶-۸۔

(۳۴) تفسیر الکشاف اور البیضاوی ہر سورہ کے اختتام پر۔

(۳۵) طاہر الہندی، کتابِ مذکور، ص ۸ و مابعد۔

(۳۶) ایضاً، ص ۳، ۴۔ عبدالحی لکھنوی، فوائد البھیہ، ص ۳۰، سخاوری، فتح المغیث، مطبع انوار محمدی، لکھنؤ، ص ۱۰۷۔

(۳۷) الصغانی، رسالہ فی الموضوعات (ابوالمحاسن کی اللؤ المرصو کے ساتھ طبع کیا گیا)، مطبوعہ، مصر، ص ۲، ۱۔

(۳۸) سخاوی، فتح المغیث، ص ۱۰۷۔

(۳۹) ان رسائل کے قلمی نسخے فرنگی محلی، لکھنؤ میں عبدالحی کے کتب خانہ میں موجود تھے۔ (فوائد البھیہ، ص ۳۰) اور ایک نسخہ کتب خانہ ندوہ، لکھنؤ میں بھی تھا۔

(۴۰) صغانی رسالہ فی الموضوعات، ص ۵، ۹، ۱۰۔

(۴۱) ایضاً، ص ۱۰: ۱۱۔

(۴۲) طاہر الہندی، کتابِ مذکور، ص ۸۔

(۴۳) صغانی، رسالہ فی الموضوعات، ص ۳، ۴، ۱۲۔

(۴۴) ایضاً، ص ۴، ص ۱۲۔

(۴۵) عبدالحی لکھنوی، الفوائد، ص ۳۰۔

(۴۶) ملاحظہ ہو، صغانی، مشارق الانوار، مطبوعہ مصر، ۱۳۲۹ھ، ص ۴۔ کتاب کا پورا نام ہے، مشارق :الانوار النبویہ فی صحاح الاخبار المصطفویہ، حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ج ۵، ۵۴۷۔ یہ مشارق الانوار اس مشارق الانوار سے مختلف ہے جو کہ غرائب کی شرح ہے اور جس میں مؤطا اور صحیحین کے مشکل الفاظ کی تشریح کی گئی ہے اور اس کے مصنف قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ) ہیں۔

(۴۷) شارح الکزوونی کے مطابق مشارق میں شامل احادیث کی جملہ تعداد ۲۲۴۶ ہے۔ حاجی خلیفہ کشف الظنون، ج ۵، ص ۵۴۷، قونیہ کے دارفنون کی جانب سے حال ہی میں اس کا جو ایڈیشن شائع ہوا ہے، اس میں یہ تعداد ۲۲۵۳ ہے۔ ملاحظہ ہو، مکتبہ محمودیہ، قاہرہ، ۱۳۲۹ھ۔

(۴۸) خرم علی بلہری، تحفۃ الاخیار، صغانی کی مشارق الانوار کا اُردو ترجمہ، کانپور، ۱۹۱۷ء، ص ۱۷۔

(۴۹) حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ج ۵، ص ۵۵۱۔

(۵۰) ابنِ حجر عسقلانی، الدرر الکامنہ، ج ۴، ص ۸۲۔

(۵۱) حاجی خلیفہ کشف الحجاب عن احادیث الشہاب۔

(۵۲) تاش کبری، کتابِ مذکور، ص ۹۹۔ قرشی، الجواہر، ج ۱، ص ۲۰۲۔

(۵۳) فہرس الخدیویہ: دور الصحابہ۔ ہاشم ندوی، تذکرۃ النوادر، حیدرآباد دکن۔

(۵۴) قرشی الجواہر، ج ۱، ص ۲۰۲۔

(۵۵) منگانا (Mingana): An Important Manuscript of the Radiations of Bukhari، آکسفورڈ، ۱۹۳۶ء، ص ۱، ۲، ۱۴، ۱۶، ۲۰، ۲۵، ۲۷، ۲۹۔

باب سوم

ہندی محدثین

(۹۵۰ تا ۱۱۵۷ھ / ۱۵۴۳ تا ۱۵۹۱ء)

فصلِ اوّل: (۹۵۰ تا ۱۰۰۰ھ / ۱۴۸۱ تا ۱۵۶۸ء)

علی متقی اور ان کا مکتبِ محدثین

علی متقی برہان پوری (۸۸۵ تا ۹۷۵ھ / ۱۴۸۱ تا ۱۵۶۸ء):

علاء الدین علی بن حسام الدین بن عبدالمالک بن قاضی خاں متقی برہان پوری مدنی، جن کے اجداد جون پور کے رہنے والے تھے، ۸۸۵ھ / ۱۴۸۱ء میں برہانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ علی متقی نے برہان پور میں شیخ باجن اور ان کے لڑکے عبدالحکیم سے اور ملتان میں حسام الدین ملتانی سے تعلیم حاصل کی۔ متقی کچھ عرصہ تک برہان پور کے قاضی بھی رہے۔ ۹۴۱ھ / ۱۵۳۴ء میں وہ گجرات میں تھے اور اس سلطنت پر ہمایوں کے حملہ آور ہونے کی وجہ سے وہ اپنے شاگردوں کی ایک جماعت کے ساتھ حجاز چلے گئے اور مکہ معظمہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہاں علی متقی نے محمد بن محمد سخاوی، ابوالحسن بکری (م ۹۵۲ھ) اور ابنِ حجر مکی (م ۹۷۴ھ) سے علمِ حدیث کی مزید تعلیم حاصل کی۔ اور اس علم میں سند مان لیے گئے۔ بحیثیت محدث وہ کس قدر ممتاز تھے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے استاد ابنِ حجر مکی خود ان کے شاگرد بھی بن گئے۔

علی متقی کے علم و تقدس کی وجہ سے نہ صرف ہم عصر علماء ان کا احترام کرتے تھے بلکہ عثمانی شہنشاہ سلیمان اوّل (۱۵۲۰ء تا ۱۵۵۵ء) اور مظفر شاہی خاندان کے حکمران محمود ثالث بھی ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ محمود نے ان کے مدرسہ کے طلباء کے لیے وظائف بھی مقرر کر دیے تھے۔ علی

متقی نے ۹۷۵ھ/۱۵۶۸ء میں مکہ معظمہ میں وفات پائی۔(۱)

علی متقی کو سیوطی کی الجامع الجوامع، الجامع الصغیر اور الزیادۃ سے گہری دلچسپی تھی۔ یہ تصانیف اس طرح لکھی گئی ہیں کہ علمِ حدیث کی قاموس کا کام دے سکیں۔ اور ان کے مطالعہ میں مزید سہولت فراہم کرنے کے لیے علی متقی نے مندرجہ ذیل چھ کتابیں لکھیں:

(۱) منھاج العمال فی سنن القوال والفعال: (رامپور، نمبر ۴۰۴۔ خدیویہ، ص ۴۳۳) اس کتاب میں علی متقی نے ابوابِ فقہ کے مطابق جامع الصغیر اور الزیادۃ کی احادیث حروفِ تہجی کے لحاظ سے مرتب کی ہیں۔ منہاج العمال کی ایک شرح جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں، بانکی پور کی اورینٹل لائبریری میں محفوظ ہے۔(۲)

(۲) اکمال منھاج العمال: (غدیویہ، ۱۰، ص ۲۷۱) یہ منہاج العمال کا ایک ضمیمہ ہے۔

(۳) غایۃ العمال: مذکورہ بالا دونوں کتابوں کی احادیث اس کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں۔

(۴) المستدرک: اس کتاب میں علی متقی نے جامع الجوامع کی احادیث فعلیہ ابواب فقہ کے مطابق مرتب کی ہیں۔

(۵) کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال: علی متقی نے غایت العمال اور المستدرک، دونوں کو کنز العمال میں پھر یک جا کر دیا ہے۔ یہ احادیث کا ایک قاموسی مجموعہ ہے، جو دائرۃ المعارف، حیدر آباد دکن نے ۱۳-۱۳۱۲ھ میں آٹھ جلدوں میں شائع کیا ہے۔

(۶) منتخب کنز العمال: (خدیویہ، ج ۱، ص ۴۲۸۔ رام پور نمبر ۲۹۶، آصفیہ، ۱، نمبر ۶۷۶)
یہ کنز العمال کا خلاصہ ہے۔ اس کتاب پر ایک گمنام مصنف نے بہت ضخیم شرح جو چار جلدوں پر مشتمل ہے، سلم الانوار کے نام سے لکھی تھی، جو کتب خانہ بانکی پور میں موجود ہے۔(۳)

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ علی متقی نے علمِ حدیث پر مندرجہ ذیل شرح اور رسائل قلمبند کیے:

(۱) شرح شمائل النبیؐ: یہ ترمذی کی شمائل النبیؐ کی شرح ہے، اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ دارالعلوم پشاور میں موجود ہے۔(۴)

(۲) البرھان فی علامۃ مہدی آخر الزمان: (لوتھ نمبر ۱۰۳۱-۲)

سیوطی کی العرف العدوی میں مہدی کے متعلق جو احادیث ہیں، ان کو علی متقی نے اس کتاب میں دوبارہ مرتب کیا ہے اور جامع الجوامع سے مزید احادیث بھی شامل کر دی ہیں۔ دیباچہ میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ محمود جونپوری نے مہدی ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے، وہ جھوٹا ہے۔

(۳) جوامع الکلم فی المواعظ والحکم: (بانکی پور-۱۳، نمبر ۲۸-۲۲۶-لوتھ، انڈیا آفس نمبر ۶۷۳)

اس رسالہ میں ایسی احادیث جمع کی گئی ہیں، جو پندونصائح اور دانشمندانہ اقوال پر مشتمل ہیں۔

(۴) المنہج التام فی تبویب الحکم: (بروکلمن ص ا، ص ۵۱۲)

یہ النووی کی مصباح الظلم کی شرح ہے۔

علی متقی کے شاگردوں میں سے طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) نے گجرات کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اور مندرجہ ذیل شاگردوں کا انتخاب کیا۔

ا۔ قاضی عبداللہ بن ابراہیم سندھی (م ۹۵۵ھ/۱۵۴۸ء):

قاضی عبداللہ سندھ میں دربیلا کے باشندے تھے۔ اُنہوں نے مخدوم عبدالعزیز ابہری سے تعلیم حاصل کی۔ ۹۳۴ھ/۱۵۲۷ء میں احمد آباد گئے اور علی متقی کے شاگرد ہو گئے۔ پھر وہ متقی کے ساتھ حجاز چلے گئے اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی، جہاں دو سال کے بعد ہی اُن کا انتقال ہو گیا۔ (۵) قاضی عبداللہ کے دولڑکے رحمت اللہ اور حمید بھی محدث تھے۔ رحمت اللہ علی متقی کے شاگرد بھی تھے۔

۲۔ رحمت اللہ بن عبداللہ سندھی (م ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء):

مکہ معظمہ میں علی متقی سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے رحمت اللہ مدینہ منورہ چلے گئے۔ اور وہاں حدیث کا درس دینے لگے۔ ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں رحمت اللہ حاجی بیگم کے ساتھ جو حج کے لیے مکہ معظمہ گئی تھیں، ہند آئے اور آگرہ چلے گئے۔ جہاں منتخب التواریخ کے مصنف عبدالقادر بدایونی نے

اُن سے حدیث کا درس لیا۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ تک احمد آباد میں حدیث کا درس دیتے رہے، پھر مکہ واپس آ گئے اور محرم ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء میں وفات پائی۔ اُنہوں نے موضوعات پر ایک کتاب لکھی تھی، جواب موجود نہیں ہے۔(۷)

۳۔ شیخ عبداللہ بن سعد اللہ سندھی (م ۹۸۴ھ/ ۱۵۷۷ء):

عبداللہ سندھ میں دربلہ کے باشندہ تھے۔ اور اپنے استاد علی متقی کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ معظّمہ چلے گئے تھے۔ جہاں اُنہوں نے ابنِ حجر مکی سے حدیث کا درس لیا۔ آخرکار اُنہوں نے بھی اپنے ہم نام اور اپنے ہم وطن قاضی عبداللہ کے ساتھ مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اور ان کے لڑکے رحمت اللہ سے ان کے بہت دوستانہ مراسم ہو گئے۔ عبداللہ نے ذوالحجہ ۹۸۴ھ/ مارچ ۱۵۷۷ء میں مکہ معظّمہ میں وفات پائی۔

عبداللہ نے مشکوٰۃ المصابیح بہت تفصیلی حواشی کے ساتھ مرتب کی۔ ان کا مقصد حنفی مسلک کی برتری کو ثابت کرنا تھا۔(۸)

۴۔ شیخ عبدالوہاب متقی (م ۱۰۰۱ھ/ ۱۵۹۲ء):

عبدالوہاب بن ولی اللہ مکہ معظّمہ میں علی متقی کے جانشین ہوئے تھے۔ وہ ۹۴۳ھ مطابق ۱۵۳۶ء میں شادی آباد، مانڈو میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے علی متقی کے مکتب میں شرکت کی۔ اور بہت جلد اُن کے ایک چہیتے شاگرد بن گئے۔ عبدالوہاب نے علی متقی کی تصانیف نقل کیں، ان کا مقابلہ کیا اور ترتیب دیا۔ اور اس طرح اپنے استاد کو بہت مدد دی۔ علی متقی کی وفات کے بعد عبدالوہاب نے ان کے مدرسہ کی ذمہ داری سنبھال لی، جو اس وقت مکہ میں علمِ حدیث کی تعلیم کا خاص مرکز تھا۔ اور تاحیات اس کی قابلِ تعریف خدمت کرتے رہے۔ عبدالوہاب (۱۰۰۱ھ/ ۱۵۹۲ء) نے میں وفات پائی۔(۹)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) شیخ عبدالوہاب متقی کے شاگرد تھے۔

فصلِ دوم

ا۔ مفتی قطب الدین نہر والی (۹۱۷ھ تا ۹۷۰ھ/۱۵۱۱ء تا ۱۵۸۲ء):

مفتی قطب الدین محمد بن علاء الدین احمد بن محمد بن قاضی خاں حنفی، نہر والی، مکی، ایک ایسے ہندی محدث تھے، جن کو مکہ معظمہ کے حرم شریف میں طویل عرصہ تک حدیث کا درس دینے کا شرف حاصل ہوا۔ قطب الدین عربی ادب اور تاریخ کے ایک وقیع مصنف تھے۔(۱۰) اُنہوں نے عرب میں صحیح البخاری کی سند العجم (۱۱) کا آغاز کیا جو اُنہوں نے اپنے والد علاء الدین نہر والی (م ۹۴۹ھ) سے حاصل کی تھی جو کہ نور الدین شیرازی کے شاگرد تھے۔ اور وہ خود اس سند کے غیر عرب اور عرب راویوں کے درمیان ایک کڑی تھے۔

قطب الدین ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء میں لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے والد کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ جہاں اُنہوں نے عبدالحق سمباطی (م ۹۳۱ھ)، عبدالرحمن بن دبیع (م ۹۴۴ھ) اور حجاز سے دوسرے کئی علماء سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ قطب الدین نے مصر اور ترکی کا سفر کیا اور وہاں کے مشہور علمی ادارے دیکھے۔ ۹۵۴ھ/۱۵۳۸ء میں عثمانی شہنشاہ سلیمان اوّل (۱۵۲۰ء تا ۱۵۵۵ء) نے ان کو شرفِ باریابی بخشا۔ خلعت عطا کی اور مکہ معظّمہ کے دینی اداروں کا مہتمم بنا دیا۔ اس کے بعد وہ مکہ کے مفتی بھی مقرر کیے گئے۔ قطب الدین نے ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں وفات پائی۔(۱۲)

تصانیف:

قطب الدین نے علمِ حدیث پر ایک جامع کتاب لکھی تھی، جس میں صحیح بخاری کی احادیث شامل کر لی گئی تھیں۔ عبدالعزیز خولی نے اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے۔(۱۳)

۲۔ عبداللہ بن ملا سعداللہ لاہوری (م ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء):

جن محدثین نے قطب الدین کی سند سے عرب میں صحیح بخاری کی احادیث روایت کیں، ان میں ایک ہندی محدث عبداللہ بن ملا سعداللہ بھی ہیں۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے تھے اور

۱۰۸۳ھ/۱۶۷۴ء میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ مشہور مدنی محدث، ابراہیم کردی (م ۱۱۰۲ھ) عبداللہ کے شاگرد تھے اور ان سے صحیح بخاری کا درس لیا تھا۔(۱۴)

فصلِ سوم

ا۔ ابوالحسن سندھی (م ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۶ء):

ابوالحسن نورالدین محمد بن عبدالہادی حنفی، سندھی، مدنی، کراچی کے قریب ایک مقام ٹھٹھہ کے باشندہ تھے اور تستر موجودہ شستر اور مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کی۔ اُنہوں نے علمِ حدیث کا درس دو مدنی محدثین سیّد محمد برزنجی (۱۰۴۰ھ/۱۱۰۳ء) اور ابراہیم کردی (۱۰۲۵ء تا ۱۱۰۲ء) سے لیا۔ ابوالحسن نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور دارالشفاء میں جو اس وقت شہر میں علمِ حدیث کی مشہور درس گاہ تھا، استاد مقرر کیے گئے تھے۔ ابوالحسن علمِ حدیث پر لکھنے والے ایک ممتاز مصنف تھے اور اُنہوں نے صحاح ستہ پر جو حواشی لکھے ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے علمِ حدیث کا کس قدر وسیع اور غائر مطالعہ کیا تھا اور فقہی مسائل پر ان کی نظر کتنی گہری تھی۔ اس کے علاوہ وہ پہلے محدث ہیں، جنہوں نے امام احمد بن حنبل کی مسند کی شرح لکھی۔ ابوالحسن نے ۱۲رشوال ۱۱۳۸ھ (جون ۱۷۲۶ء) کو وفات پائی اور جنت البقیع، مدینہ منورہ میں دفن کیے گئے۔(۱۵)

تصانیف:

(۱) الحواشی ستہ علی الکتب الستہ: یہ کتاب احادیث کے چھ مستند مجموعوں کے حواشی پر مشتمل ہے۔ اس کے قلمی نسخے مصر کے کتب خانۂ خدیویہ میں موجود ہیں۔(۱۶) صحیحین کے حواشی مصری ایڈیشن اور سنن النسائی کے حواشی ہندی ایڈیشن کے ساتھ شائع کیے گئے ہیں۔

(۲) بھجۃ النظر فی شرح نخبۃ الفکر: اے۔ایس۔بی۔نمبر ۲۰۶/۱۵، عربی مخطوطات) یہ کتاب ابنِ حجر کی نخبۃ الفکر کی شرح ہے۔

(۳) شرح مسند احمد بن حنبل: مسند کی یہ شرح پچاس جزء پر مشتمل ہے۔ نواب صدیق حسن خاں اور عبدالعزیز خولی نے اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔(۱۷)

۲۔ شیخ محمد حیات سندھی (م ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء):

محمد حیات سندھی اپنے والد ابوالحسن سندھی کی وفات کے بعد ان کی جگہ دارالشفاء کے صدر معلم ہوئے اور اپنی تمام عمر علمِ حدیث کی خدمت میں صرف کر دی۔ اُنہوں نے عبداللہ بن سالم بصری (م ۱۱۳۴ھ)، ابراہیم کردی (م ۱۱۴۵ھ) اور حسین بن علی عجیمی سے اجازہ حاصل کیا تھا۔ محمد حیات علی پور کے باشندہ تھے، جو سندھ میں بھکّر کے قریب واقع ہے۔ اور اُنہوں نے ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ (۱۸)

تصانیف:

(۱) تحفۃ المحبین: (بانکی پور، ۴- (۲)، نمبر ۲۸۶ بروکلمن، ض ۱، ص ۵۲۲)

یہ کتاب النووی کی اساسبعین کی شرح ہے۔

(۲) رسالہ فی بدعۃ التعزیہ:

(۳) تحفۃ الانام: اس رسالے میں تقلید کی تردید کی گئی ہے۔ (۱۹)

(۴) شرح اربعین للنہروی: یہ ملا علی قاری کی اربعون حدیثاً فی جوامع الکلم کی شرح ہے۔

فصل چہارم

۱۔ عمر نہروالی (گیارھویں صدی ہجری):

عمر بن محمد عارف تاج خاں نہروالی، مدنی گجرات کے ایک مقام نہروالہ کے باشندہ تھے۔ وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ عمر کی زندگی کے حالات کا علم نہیں۔ قیاس ہے کہ ان کا تعلق گیارہویں صدی ہجری سے تھا۔ (۲۱)

تصنیف:

الفیض النبوی فی اصول الحدیث وفھارس البخاری (لوتھ نمبر ۱۳۱)

یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ مقدمہ اصطلاحات الحدیث سے متعلق ہے اور فصلوں کا تعلق اصول الحدیث سے ہے۔ کتاب کے آخر میں امام بخاری اور ان کی صحیح پر بحث

کی گئی ہے۔

۲۔ شیخ ابوالطیب سندھی (بارہویں صدی ہجری)

ابوالطیب محمد بن عبدالقادر حنفی، سندھی، مدنی نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اُنہوں نے حسین بن علی عجیمی سے صحاح ستہ اور سنن کا درس لیا تھا۔ نیز طاہر بن ابراہیم کردی اور محمد کوئی سے بھی تحصیلِ علم کیا تھا۔

ابوالطیب کا تعلق بارہویں صدی ہجری سے تھا۔(۲۲)

تصنیف:

شرح علیٰ جامع الترمذی: یہ کتاب ابوعیسیٰ ترمذی کی مشہور تصنیف جامع کی عربی شرح ہے۔ مطبع نظامی، دہلی نے اسے شروح اربع کے ساتھ طبع کیا تھا۔

۳۔ سیّد مرتضٰی بلگرامی (۱۱۴۵ھ تا ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۳۲ء تا ۱۷۹۱ء):

ابوالفیض سیّد محمد مرتضٰی بن محمد بن محمد بن عبدالرزاق حنفی، حسینی، واسطی، بلگرامی، زبیدی، تاج العروس کے مشہور مصنف ہیں۔ ان کا تعلق بلگرام کے واسطی سیّدوں کے خاندان سے تھا۔ اُنہوں نے فاخر الہٰ آبادی (م ۱۱۶۴ھ)، شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) اور خیر الدین سواتی (م ۱۲۰۶ھ) سے تعلیم حاصل کی۔ نوجوانی میں وہ حج و حرمین کی زیارت کے لیے گئے اور چار پانچ سال تک زبید میں علمِ حدیث اور لسانیات کی تعلیم میں صرف کیے۔ ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۳ء میں وہ مصر گئے اور قاہرہ میں سکونت اختیار کر لی۔ سیّد مرتضٰی ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۱ء میں طاعون میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔(۲۳)

سیّد مرتضٰی جامع شیخون میں علمِ حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ جس میں جامع ازہر کے اساتذہ اور مصر کے مختلف حصوں اور بیرونِ مصر کے محدثین بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ ترکی کے سلطان عبدالحمید اوّل (۱۷۷۴ء تا ۱۷۸۹ء) کو علمِ حدیث سے گہری دلچسپی تھی اور اُنہوں نے سیّد مرتضٰی سے حدیث الرحمۃ کا اجازہ حاصل کیا تھا۔(۲۴) اس تاریخی اجازہ کی ایک قلمی نقل کتب خانہ دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ کے شعبۂ نواب صدیق حسن میں موجود ہے، جو نواب صدیق حسن نے خود نقل کیا تھا۔

تصانیف:

(۱) عقود الجواھر المنیفۃ فی اصول ادلّۃ مذھب ابی حنیفہ: (مطبوعہ ۱۲۹۵ھ)

یہ کتاب اسکندریہ میں دو جلدوں میں طبع کی گئی۔ یہ ان احادیث کا مجموعہ ہے، جن سے حنفی مکتبِ فقہ کی تائید ہوتی ہے۔

(۲) بلغۃ الاریب فی مصطلح آثار الحبیب: (۱۳۲۶ھ میں مصر میں طبع کی گئی) یہ اصولِ حدیث پر ایک رسالہ ہے۔

(۳) غایۃ الابتھاج مقتفع اسانید مسلم الحجاج: (بروکلمن، ض ا، ص ۳۹۹)

(۴) تبصیر المنتبہ بتحریر المشتباہ: (ایضاً)

(۵) عقد الآلی المتناثرہ فی حفظ الاحادیث المتواترہ: (ایضاً)

(۶) معجم المشائخ: (ایضاً)

(۷) الغیۃ السند: (ایضاً)

(۸) مسلسلات: (ایضاً)

۴۔ شیخ محمد عابد سندھی (م ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء):

عابد علی احمد علی بن یعقوب انصاری، حنفی، سندھی، مدنی، سیوان میں پیدا ہوئے تھے، جو سندھ میں دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ اُنہوں نے زبید میں تعلیم حاصل کی۔ صنعا کے وزیر کی لڑکی سے محمد عابد کی شادی ہوگئی اور امام یمن نے ان کو مصر میں اپنا سفیر مقرر کیا۔ اس کے بعد وہ مختصر قیام کے لیے اپنے وطن آئے اور پھر حجاز چلے گئے، جہاں حکومتِ مصر نے ان کو علمائے مدینہ کا سردار مقرر کر دیا۔ محمد بن عابد نے ربیع الاوّل ۱۲۵۷ھ/ اپریل ۱۸۴۱ء میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ (۲۵)

تصانیف:

(۱) المواھب اللطیفہ علیٰ مسند الامام ابی حنیفہ: (مخطوطہ، معارف، ج، ایل (۶) ص ۴۲۲، نمبر ۶)

یہ مسند ابوحنیفہ کی شرح ہے، جس میں شارح نے مستند کتب سے ایسی احادیث قلمبند کی ہیں، جن سے مسند میں شامل احادیث کی تائید ہوتی ہے۔

(۲) مرتب مسند الامام الاعظم: (مخطوطہ، ایضاً، ص ۴۲۴، نمبر ۳)

اس کتاب میں محمد عابد نے احادیثِ مسند کو ابوابِ فقہ کے مطابق مرتب کیا ہے۔

(۳) شرح تیسیر الاصول الیٰ حدیث الرسولؐ: یہ کتاب اصولِ حدیث سے متعلق ہے۔

(۴) شرح بلوغ المرام: یہ ابنِ حجر کی بلوغ المرام کی شرح ہے۔(۲۶)

حواشی:

(۱) الغ خانی ظفر الوالہ، ص ۳۱۵، ۳۶۸۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۲۴۱ و مابعد۔ آزاد سبحۃ المرجان، ص ۴۳ اور مآثر الکرام، ص ۹۴۔۱۹۲، غلام سرور، خزینہ، ج ۱، ص ۳۱-۴۲۹، رحمان علی۔ تذکرۂ علماء، ص ۴۷-۱۳۶۔ صدیق حسن، اتحاف النبلاء، ص ۳۲۶، تقصار، ص ۱۷۷۔ اور ابجد العلوم، ص ۸۹۵، فقیر محمد، حدائق الحنفیہ: تذکرۂ علی متقی برہان پوری، عبدالحی حسنی، یادِ ایام، ص ۳۵، ۴۴۔ فہرست بانکی پور، ج ۱۶، ص ۶۱۔ شعرانی، طبقات الکبریٰ: تزکرۂ علی متقی۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۲۶۲۔

(۲) فہرست بانکی پور، ج ۵ (۲)، نمبر ۴۲۶۔

(۳) ایضاً، ج ۵ (۲) نمبر ۳۵-۴۳۲۔

(۴) فہرست کتب، ص ۷۶، نمبر ۳۹۔

(۵) معصومی، تاریخ سندھ، ص ۳۰۲۔ عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۲۶۵۔

(۶) بدایونی، منتخب، ص ۱۱۴، ہیگ، ص ۱۶۸۔

(۷) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۲۶۵-۲۶۴۔ عبدالحی حسنی، یادِ ایام۔ ص ۳۶۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۰۳۔ بروکلمن، ضمیمہ ا، ص ۵۲۴۔

(۸) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۲۶۵-۲۶۴۔ رحمان علی، تذکرۂ علماء، ۱، ۲۔ فقیر محمد حدائق، ص ۳۸۸۔ معصومی، تاریخ سندھ، ص ۲۰۴۔ الغ خانی، ظفر الدولہ۔ ص ۶۳۸۔ عیدروسی، نور السافر، ص ۳۵۷۔

(۹) عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۲۵۳ و مابعد۔ فقیر محمد، حدائق، ص ۲۹۲ و مابعد رحمانی علی، تذکرۂ علماء، ص ۱۳۹۔ معارف، ج ۲۲، ش ۴، ص ۶۴۔۲۶۳۔

(۱۰) بروکلمن، ضمیمہ ا، ص ۵۱۴۔

(۱۱) یہ اس لیے کہتے ہیں کہ قطب الدین اور بخاری دونوں غیر عرب تھے۔

(۱۲) عیدروسی، نور السافر، ص ۳۸۳ و مابعد۔ بن العماء، شذرات، ج ۸، ص ۴۲۰ و مابعد۔ سخاوی، البدر الطالع، ج

۲،ص ۵۷،ص ۵۸۔محسن ترہتی، الیانع،ص ۲۸، جرجی زیدان۔آداب اللغت العربیہ، قاہرہ، ۱۹۱۳، ج ۳، ص ۳۰۹، سرکس، ص ۱۸۷۱۔ ہوآرٹ Huart: A History of Arabic Literature، لندن، ۱۹۰۳ء، ص ۷۸-۳۷۷، عبدالحی حسنی، یادِایام، ص ۵۶، ۵۷۔نزہۃ الخواطر، ج ۴: تذکرۂ قطب النہروالی۔

(۱۳) عبدالعزیز خولی، مفتاح السنۃ، ص ۱۱۰۔

(۱۴) اتحاف الاکابر، ص ۶۱، ۶۲۔الامداد، ص ۴۷، الامم، ص ۴، ۵۔محسن ترہتی، الیانع، ص ۳۳۔

(۱۵) الجبرتی، عجائب الآثار، قاہرہ، ۱۳۲۲ھ، تذکرہ ابوالحسن السندی، اعلام النبلاء، ج ۳، ص ۹۳۸۔سلک الدرر، ج ۴، ص ۶۶۔سرکس، معجم المطبوعات، قاہرہ، ۱۹۲۸ء، ص ۵۷-۵۶، ا۔قطف الثمر، ص ۲۱۔محسن ترہتی، الیانع، ص ۴۲، ۴۴۔معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۳۸۔

(۱۶) فہرست کتب، ج ۱، ص ۳۳۱، سرکاری کتب خانہ رامپور میں بھی موجود ہے۔(فہرست ج ۲، ص ۱۳۰، حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ج ۲، ص ۵۴۹۔اور ج ۳، ص ۶۲۲، ۶۲۵، ۶۲۷۔

(۱۷) صدیق حسن، الحطہ فی ذکر صحاح الستۃ، مسند احمد، عبدالعزیز خولی، مفتاح السنۃ، ص ۲۷۔

(۱۸) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ۱۲۔آزاد، سبحۃ المرجان، ص ۹۵ اور مآثر الکرام، ص ۶۶-۱۶۴، صدیق حسن، اتحاف النبلاء، ص ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۴، ابجد، ص ۸۴۹۔ا۔تقصار، ص ۳۳۴۔رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۸۷-۱۸۶۔محسن ترہتی، الیانع، ص ۳۴۔معارف، ج ۲۲، ش ۵، ص ۳۹-۳۳۸۔

(۱۹) صدیق حسن، اتحاف النبلاء، حوالۂ مذکور۔

(۲۰) بروکلمن، ضمیمہ ۱، ص ۵۲۲، ۵۳۹۔

(۲۱) لوتھ، فہرست کتب خانہ انڈیا آفس، نمبر ۱۳۱۔

(۲۲) عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۲: تذکرۂ ابوالطیب سندھی۔

(۲۳) مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس، قاہرہ، ۱۳۰۷ھ، ج ۱۰، ۴۰۷-۴۶۹، الجبرتی، کتاب مذکور، ج ۲، ص ۲۳-۲۰۸۔عبدالحی، فہرس، ص ۳۹۸-۴۱۳، صدیق حسن، اتحاف، ص ۷-۴۲، تقصار، ص ۲۲۱ اور ابجد، ص ۷۰۹-۷۱۲، سرکس، ۲۸-۱۷۲۶ء۔مقبول احمد صمدانی، کتابِ مذکور، ج ۱، ۲۱، این ۳۰۔رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۲۶-۲۲۴۔فقیر محمد۔حدائق، ص ۶۱، ۴۵۸ لین Lane Lexicon، لندن، ۱۸۶۳ء، ص XVIII، ادارۂ معارفِ اسلامیہ، روداداجلاس، ۱۹۳۵ء، ص ۳۳-۳۳۲۔

(۲۴) الراحمون یرحمھم الرحمن تبارک و تعالیٰ ارحمو امن فی الارض یرحمکم من فی السماء۔

(۲۵) محسن ترہتی، الیانع الجنی: تذکرۂ عابد انصاری۔رحمان علی، تذکرۂ علماء، ص ۲۰۲، فقیر محمد، حدائق، ص ۴۷۳۔

(۲۶) ایضاً، حوالۂ مذکور۔

کتابیات

الف: مخطوطات

ابراہیم زبیری بساطین السلاطین، مخطوطہ بانکی پور، نمبر ۶۱۲

ابراہیم فہد انجم، مخطوطہ بانکی پور، نمبر ۲۴۲۹

الازفقی مدینۃ العلوم، مخطوطہ، بانکی پور

حاجی کشمیری شرح شمائل النبی، مخطوطہ بانکی پور، نمبر ۱۱۸۲

داؤد مشکوتی اسرار الابرار، مخطوطہ دار المصنفین، اعظم گڑھ

ذہبی طبقات الحفاظ، مخطوطہ، بانکی پور، نمبر ۲۴۱۹

شہاب الدین دولت آبادی شرف السادات، مخطوطہ بانکی پور، نمبر ۱۱۷۹

شیخ الاسلام شرح البخاری، مخطوطہ بانکی پور، نمبر ۱۱۹۰

صغانی رسالہ فی الموضوعات، مخطولہ فرنگی محلی، لکھنؤ

عبدالحی حسنی نزہۃ الخواطر، مخطوطہ مملوکہ ڈاکٹر عبدالعلی لکھنؤ،

معارف العوارف، مخطوطہ مملوکہ ڈاکٹر عبد العلی، لکھنؤ

عبدالرحمٰن چشتی مرآۃ اسرار، مخطوطہ، بانکی پور، نمبر ۶۷۶

عبداللہ الہ آبادی الیم الزعرب فی غرائب الحدیث، مخطوطہ، ندوۃ، لکھنؤ

علی ہمدانی ذخیرۃ الملوک، مخطوطہ بانکی پور، نمبر ۹۴۳

فخرالدین الحافظ شرح عین العلم، مخطوطہ، بانکی پور، نمبر ۱۳۵۳

مبارک الارجانی مدارج الاخبار، مخطوطہ بانکی پور، نمبر ۳۶۴

محمد صدیق کلمۃ الصادقین، مخطوطہ بانکی پور، نمبر ۳۰۲

محمد صدیق بن شریف	نجوم المشکوٰۃ، مخطوطہ ندوۃ، لکھنؤ
محمود گاوان	ریاض الانشاء، مخطوطہ، حبیب گنج۔
نامعلوم	چچ نامہ، مخطوطہ، دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔
نامعلوم	تجلی نور فی مشاہیر جونپور، مخطوطہ، دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔
نامعلوم	زبدۃ المقامات، مخطوطہ، بانکی پور، نمبر ۱۹۷

ب: مطبوعات

ابن الاثیر	تاریخ الکامل، قاہرہ، ۱۳۱۰ھ
ابن العماد حنبلی	شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ، ۱۵۳۱ھ و مابعد
ابن الندیم	کتب الفہرست، قاہرہ، ۱۳۴۸ھ
ابن بطوطہ (سفرنامہ)	تحفۃ النظار فی غرائب الامسار و عجائب الاسفار، مرتبہ ڈفریمری، پیرس، ۱۹۲۲ء
ابن حجر عسقلانی	الدرر الکامنہ، حیدرآباد دکن
	مقدمۃ الفتح، قاہرہ، ۱۳۴۷ھ
	نخبۃ الفکر، کانپور، ۱۳۴۴ھ
	الاصابہ فی تمیز الصحابۃ، ببلو انڈیکا، کلکتہ ۱۸۸۸ء
	لسان المیزان، حیدرآباد دکن
	تہذیب المیزان، حیدرآباد، دکن
	تقریب التہذیب، دہلی، ۱۲۹۰ھ
ابنِ خلدون	تاریخ، قاہرہ، ۱۹۱۰ء
ابنِ خلکان	وفیات الاعیان، قاہرہ، ۱۹۱۰ء
ابنِ سعد	کتاب الطبقات الکبیر، مرتبہ ایڈورڈ سخاؤ، لائیڈن، ۱۹۳۳ء

ابن عبدالبر — الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، حیدرآباد دکن، ۱۳۳۶ھ
ابن عساکر — التاریخ الکبیر، دمشق، ۱۳۳۲ھ
ابنِ ماجہ — سنن، فاروقی پریس، دہلی
ابوالحسنات ندوی — ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، اعظم گڑھ، ۱۹۳۶ء
احمد القلقشندی — صبح الاعشاء، مصر
احمد حسین — ترجمہ تاریخ ابنِ خلدون، الٰہ آباد، ۱۹۰۹ء
احمد سعید — غلامانِ اسلام، دہلی، ۱۹۴۰ء
احمد علی شوق — تذکرۂ کاملانِ رام پور، دہلی، ۱۹۲۹ء
آرنلڈ (Arnold) — The Preaching of Islam، لندن، ۱۹۳۵ء
آزاد بلگرامی — سبحۃ المرجان، بمبئی، ۱۳۰۱ھ
مآثر الکرام، آگرہ، ۱۳۱۰ھ
خزانۂ عامرہ
سروِ آزاد
اسٹوری (Storey) — Persian Literature، لندن، ۱۹۲۷ء
اسٹیوارٹ (Stewart) — History of Bengal، لندن، ۱۹۱۳ء
اسماعیل گذروی — ولی اللہ، دہلی
اعظم شاہ، خواجہ — تاریخِ کشمیر، لاہور، ۱۳۰۳ھ
الغ خانی، حاجی دبیر — ظفر الوالہ مظفر و آلہ، مرتبہ ڈینی سن راس
ایلیٹ اور ڈاؤسن — History of India: Elite and Dawson، لندن، ۱۹۶۸ء
ادارۂ معارفِ اسلامیہ، روودادِ اجلاس، ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۵ء، مطبوعہ، لاہور، اعلام النبلاء

انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن، روداد، شملہ، ۱۹۴۱ء

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

بخاری — الجامع الصحیح، مطبوعہ مصر

براؤن (Browne) — A Literary History of Persia، لندن، ۱۹۳۱ء

بروکلمن (Brockelmann) — Geschichie، ضمیمہ، لائیڈن، ۱۹۳۸ء

برن بی (Brunby) — Mohummedan and Jewish Calender

بزرگ بن شہریار — عجائب الہند، لائیڈن، ۱۸۸۶ء

بشیر احمد — واقعاتِ مملکتِ بیجاپور، آگرہ، ۱۹۱۵ء

بلاذری — کتاب فتوح البلدان، مرتبہ ڈی گوئے، لائیڈن، ۱۸۶۶ء

بیرونی — کتاب الہند، مرتبہ ایڈورڈ سخاؤ، لندن، ۱۸۸۷ء

بیل (Beale): — Oriental Biographical Dictionary

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۸۱ء

تاراچند — Influence of Islam on Indian Culture، الٰہ آباد، ۱۹۳۳ء

تاش کبرازادہ — مفتاح السعادۃ، حیدرآباد دکن، ۱۳۲۸ھ

تبریزی — الاکمال فی اسماء الرجال، دہلی (مشکوٰۃ المصابیح کے ساتھ چھپی تھی)

تھارنٹن (Thornton) — India Gazetteer، لندن

ثناء اللہ (پروفیسر) — تذکرہ علمائے جونپور، مع انگیزی ترجمہ، کلکتہ

ثناء اللہ پانی پتی — تذکرۃ الانساب

جامی — نفحات الانس، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۰ء

جبروتی — عجائب الآثار، قاہرہ، ۱۳۲۲ھ

جرجی زیدان — ادب اللغت العربیۃ، قاہرہ، ۱۹۲۴ء

مصنف	کتاب
حاجی خلیفہ	کشف الظنون، مرتبہ فلوگل، لندن، ۱۸۴۲ء
خدا بخش اور مارگر لیوتھ	Renaissance of Islam:Margoliouth، پٹنہ ۱۹۳۷ء
خرم علی بلہری	تحفۃ الاخیار، مشارق الانوار کا اُردو ترجمہ، کانپور، ۱۹۱۷ء
خذری بک	تاریخ تشریع الاسلامی، قاہرہ، ۱۹۳۴ء
خطیب بغدادی	تاریخِ بغداد، قاہرہ، ۱۹۳۱ء
دارالشکوۃ	سفینۃ الاولیاء
دینش چندر سین	History of Bengali Literature، کلکتہ، ۱۹۱۱ء
دولابی	کتاب الکناء والاسماء، حیدر آباد دکن، ۱۳۲۲ھ
ذہبی	تجرید اسماء الصحابۃ، حیدر آباد دکن، ۱۳۱۵ھ
	تذکرۃ الحفاظ، حیدر آباد دکن
	میزان الاعتدال، قاہرہ، ۱۳۲۵ھ
رحمان علی	تذکرہ علمائے ہند، طبعِ دوم، نول کشور، لکھنؤ
رے (H.C. Ray)	Dynastic History of Northern India، کلکتہ ۱۹۳۱ء
ریورٹی (Raverty)	Notes on Afghanistan and Parts of Baluchistan، لندن، ۱۸۷۸ء
ریون شاہ	Gour:Ravenshaw، لندن، ۱۸۷۸ء
	مطبوعہ، حیدر آباد دکن، ۱۳۲۸ھ
زکریا کاندھلوی	مقدمہ اوجز المسالک، سہارنپور، ۱۳۴۸ھ
زین الدین مالاباری	تحفۃ المجاہدین، مطبع تاریخ، حیدر آباد
سبکی	طبقات الشافعیہ، قاہرہ، ۱۹۲۸ء
سخاوی	الضوء اللامع، قاہرہ، ۱۳۵۳ء
سرکس	معجم المطبوعات، قاہرہ، ۱۹۲۸ء

سمعانی	کتاب الانساب، گب میموریل سیریز، لندن
سیّد احمد خان	آثار الصنادید، کانپور، ۱۹۰۴ء
سیّد سلیمان ندوی	عرب و ہند کے تعلقات، الٰہ آباد، ۱۹۳۰ء
	عربوں کی جہاز رانی، اعظم گڑھ، ۱۹۳۵ء
	حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء
	خلافت اور ہندوستان، اعظم گڑھ، ۱۳۴۰ھ
	نقوشِ سلیمانی، اعظم گڑھ
سیوطی	بغیۃ الرعات، قاہرہ، ۱۳۲۶ھ
	حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ، قاہرہ، ۱۳۲۱ھ
	لب اللباب فی الانساب، مرتبہ پی۔ جے۔ ویتھ
	تاریخ الخلفاء، کلکتہ
سیوطی وغیرہ	ذیل الطبقات الحفاظ، مصر
شوکانی	البدر الطالع، قاہرہ، ۱۳۴۸ھ
صدیق حسن خاں	ابجد العلوم، بھوپال، ۱۲۹۵ھ
	الحطہ فی ذکر صحاح الستہ، کانپور، ۱۲۸۳ھ
	اتحاف النبلاء، بھوپال
	تقصار الجیود، بھوپال، ۱۲۹۸ھ
صغانی	رسالہ فی الموضوعات، مصر
صفی الدین	خلاصہ تہذیب الکمال، قاہرہ، ۱۳۲۲ھ
صوفی	المنہاج، لاہور، ۱۹۴۱ء
ضیاء الدین برنی	تاریخ فیروز شاہی، ببلو انڈیکا، کلکتہ، ۱۸۶۲ء
طاہر پٹنی	مجمع بحار الانوار، نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۹۶ء

	المغنی فی ضبط الرجال، دہلی، ۱۲۹۰ھ
	تذکرۃ الموضوعات، قاہرہ، ۱۳۴۳ھ
طبری	تاریخ الرسل، والملوک، مرتبہ ڈی گوئے، لائیڈن، ۱۸۹۳ء
ظہیرالدین	سلطان احمد شاہ بھمنی، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۶ء
عبدالحق دہلوی	اخبار الاخیار، میرٹھ، ۱۲۷۷ھ
	تالیف قلب الالیف، مع اُردو ترجمہ، مکتبہ تاریخ، حیدرآباد، دکن
	ماثبت بالسنۃ، لاہور، ۱۳۰۷ھ
عبدالحمید لاہوری	پادشاہ نامہ، ببلو انڈیکا، ۱۸۶۷ء
عبدالحی حسنی	نزہۃ الخواطر، حیدرآباد دکن، ۱۳۵۰ھ
	یادِ ایام یا تاریخِ گجرات، لکھنؤ
عبدالحی لکھنوی	الفوائد البہیہ فی تراجم حنفیہ، مطبع یوسفی، لکھنؤ، ۱۸۹۵ء
	طرب الاماثل، یوسفی پریس، لکھنؤ، منتخب التواریخ، ببلو انڈیکا، کلکتہ، ۱۸۶۹ء
عبدالرحمٰن الجزیری	کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، قاہرہ، ۱۳۹۱ھ
عبدالعزیز الخولی	مفتاح السنۃ، قاہرہ، ۱۹۲۱ء
عبدالقادر العیدروسی	نور السافر، بغداد، ۱۹۳۴ء
عبیداللہ سندھی	حزب، لاہور ۱۹۴۲ء
عثمانی	سیر الاقطاب، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۳ء
عزالدین ابن الاثیر	اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ، حیدرآباد دکن
علی القاری	مرقاۃ المفاتیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح، قاہرہ
علی حیدر کاکوروی	مشاہیرِ کاکوروی، اصح المطابع، لکھنؤ، ۱۹۲۷ء
عینی، بدرالدین	عمدۃ القاری فی شرح صحیح البخاری، مصر، ۱۳۰۸ھ

غزالی — احیاء العلوم الدین، قاہرہ، ۱۳۲۲ھ

غلام احمد خان — اُردو ترجمہ، فوائد الفواد، رہتک، ۱۳۱۴ھ

غلام سرور مفتی — خزینۃ الاصفیاء، نول کشور، لکھنؤ

حدیقۃ الاولیاء، خورشید عالم پریس، لاہور

غلام یزدانی — مانڈو، آکسفورڈ، ۱۹۲۹ء

فرشتہ، ابوالقاسم — تاریخ ہند، کانپور، ۱۸۷۴ء

فصیح الدین — Sharqi Monuments of Jaunpur، جونپور، ۱۹۲۲

فقیر محمد — حدائق الحنفیۃ

قاسم قلوغہ — طبقات الحنفیۃ

قرشی — الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیۃ، حیدرآباد دکن، ۱۳۳۲ھ

قلیچ بیگ فریدوں بیگ — چچ نامہ کا انگریزی ترجمہ، کراچی، ۱۹۰۰ء

کننگھم — Ancient Geography of India (Cunningham)

مرتبہ، ایس۔ایم، موجمدار، پٹنہ، ۱۹۲۴ء

Travels of Asia and Africa، لندن، ۱۹۲۹ء

Archaeological Survey of India، شملہ، ۱۸۷۱ء

Ibn: Battutah: Gibb Travels in Asia and Africa،

۱۹۲۹ء

گیلوم (Guillaume) — Traditions of Islam، آکسفورڈ، ۱۹۲۴ء

گزیٹر آف دی پراونس آف سندھ، بمبئی، ۱۹۱۹ء

لائز ینڈر ناتھ — Promotion of Learning in India During

Mohammeden Rule: N.N. Law، لندن، ۱۹۱۵ء

لی اسٹرینج — Lands of the eastern Caliphate (Le Strange)، کیمبرج، ۱۹۰۵ء

لین (Lane)	Lexicon، لندن، ۱۸۶۳ء
محمد بن شاکر الکتبی	نداۃ الوفیات، مصر
محمد حسین آزاد	دربارِ اکبری
محمد فواد عبدالباقی	مفتاح کنوز السنۃ، قاہرہ، ۱۹۳۴ء
مختار احمد	خاندانِ عزیزی، کانپور
مرتضیٰ زبیدی	تاج العروس، قاہرہ
مرگوٹن (مترجم)	فتوح البلدان، ترجمہ F.C. Morgotten، حصہ دوم، نیویارک، ۱۹۲۴ء
مسعودی	مروج الذہب، مرتبہ بینارڈ، پیرس
معصومی	تاریخِ سندھ، مرتبہ داؤد پوتا، پونہ، ۱۹۳۸ء
مقبول احمد صمدانی	حیاتِ جلیل، الہ آباد، ۱۹۲۰ء
مقدسی	کتاب الانساب، مصر
مقدسی البشاری	احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، مرتبہ ڈی گوئے، لائیڈن ۱۹۰۶ء
مناظر احسن گیلانی	نظامِ تعلیم و تربیت، دہلی، ۱۹۴۳ء
منگانا	An Important Manuscript of the A-Mingaa Traditions of Al-Bukhari، آکسفورڈ، ۱۹۳۶ء
منہاج السراج	طبقاتِ ناصری، ببلوانڈیکا، ۱۸۷۹ء
موجمدار (Majumdar)	Arab Invasion of India، مدراس، ۱۹۳۱ء
میور (Muir)	Annals of the Early Caliphate، ایڈنبرا، ۱۹۱۵ء
مہدی حسین	Rise and Fall of Mohammed Bin Tughlaq لندن، ۱۹۳۱ء
نظامی بدایونی	قاموس المشاہیر، بدایون، ۱۹۲۴ء

برِ عظیم پاک و ہند کے مسلمان علمِ حدیث کو فروغ دینے کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں، جب احادیث یکجا اور مرتب کی جا رہی تھیں اور اس علم کو بڑی اہمیت دی جا رہی تھی، عربوں کے ساتھ علمِ حدیث بھی سندھ میں آیا اور اس کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں ہی دیبل، منصورہ اور قصدار علمِ حدیث کے مرکز بن گئے تھے۔ عرب ممالک میں امام اوزاعی، ابومعشر نجیح سندھی اور رجاء سندھی جیسے نامور ہندی نژاد محدثین نے بھی اس علم کی ترقی میں حصہ لیا۔ غزنوی سلاطین کے عہد میں لاہور علمِ حدیث کا بہت اہم مرکز بنا۔ شیخ محمد اسماعیل لاہوری نے یہاں اس علم کی اشاعت کا آغاز کیا اور ان کے بعد حسن الصغانی جیسے بلند پایہ اور نامور محدث ہوئے۔ اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ دہلی بھی علمِ حدیث کا بڑا مرکز بنا۔ دکن اور گجرات کے سلاطین نے اس علم کو ترقی دینے میں اہم حصہ لیا۔ اور رفتہ رفتہ مالوہ، خاندیش، جھانسی، کالپی، آگرہ، لکھنؤ، جونپور، بہار اور بنگال میں حدیث کی تعلیم و اشاعت کے مراکز قائم ہو گئے۔